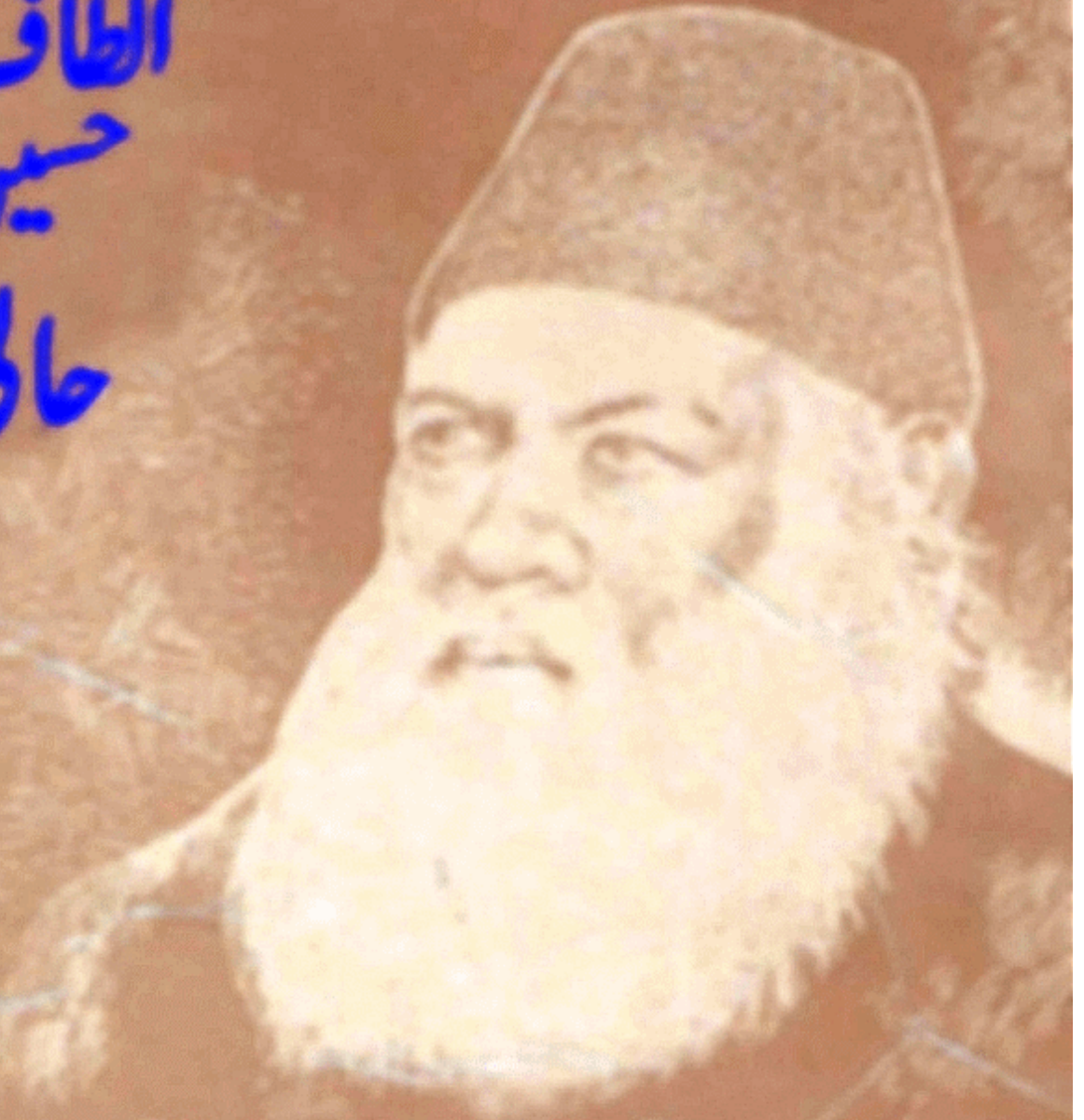


الطاف  
حسین  
حالی



حیاتِ جاوید

# حیاتِ جاوید

جلد دوم

مولانا الطاف حسین حالی

ارسلان سیکس

# چیاتِ جاوید

# حیاتِ جاوید

مولانا الطاف حسین حالی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ————— ارسلان محمود

اہتمام ————— امجد محمود

اشاعت ————— مئی 2000ء

طابع ————— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

کتابت ————— قاری محمد حبیب الرحمن

قیمت ————— 450/- روپے

ملنے کا پتہ: —————

ارشاد بک سیلرز

چوک شہیدان، میرپور، آزاد کشمیر

فون: (058810) 42327

49522 - 49503



# فہرست

			مذہبی خدمات
19	ترجیح کی پہلی وجہ		ہندوستان میں اسلام کن خطروں میں
20	دوسری وجہ		گھرا ہوا تھا
21	تیسری وجہ	10	پہلا خطرہ
23	چوتھی وجہ	10	دوسرا خطرہ
24	مثال 1	11	تیسرا خطرہ
38	مثال 2	11	سرید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا
44	خطبات کے مضامین کا خلاصہ	12	بائبل کی تفسیر
44	پہلا خطبہ	12	سرولیم میور کی کتاب کا جواب
45	دوسرا خطبہ		لکھنے کی تیاری
46	تیسرا خطبہ	12	سرولیم کا جواب لکھنے سے دوستوں
47	چوتھا خطبہ		کا منع کرنا
48	حصہ 1	14	خطبات احمدیہ کے لیے
48	حصہ 2		میٹزل جمع کرنا
48	حصہ 3	14	ولایت میں خطبات کے لکھنے میں
50	حصہ 4		سرگرمی اور اس کے چھوانے
55	پانچواں خطبہ		کی مشکلات
56	چھٹا خطبہ	14	خطبات کی ترجیح پہلی کتابوں پر
56	ساتواں خطبہ		جو اسلام کی حمایت میں لکھی گئیں
57	آٹھواں خطبہ	18	
61	نواں خطبہ		

	وہ مسائل جن میں سرسید سب سے	68	دسواں خطبہ
159	الگ منفرد ہیں	71	گیارہواں خطبہ
		71	بارہواں خطبہ
	<b>سرسید کی مخالفت</b>	73	مصنف حیات جاوید کا ریمارک
		76	خطبات پر اخبار انکوآزر کی رائے
162	مخالفت کے اسباب		جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپالوجی
163	تبیین الکلام کی مخالفت	80	کا چھپوا کر شائع کرانا
164	غازی پور کے مدرسہ کی مخالفت	81	گاڈ فری ہگنز کی کتاب کا ترجمہ کرانا
164	تاریخ الفنسٹن کے ترجمہ کی مخالفت	82	رسالہ ابطال غلامی
	انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے	96	تفسیر القرآن
168	کی مخالفت	97	تفسیر لکھنے کی ضرورت
	سید صدیقی علی خاں کی نسبت لوگوں	105	اس تفسیر کی خصوصیات
166	کی بدگمانی	105	پہلی خصوصیت
	لندن جانے اور وہاں رہنے	106	مثال 1
167	کے زمانے کی مخالفتیں	107	مثال 2
	لندن سے واپس آنے پر مخالفتوں	108	مثال 3
172	کی چھیڑ چھاڑ	110	دوسری خصوصیت
	تہذیب الاخلاق کے نکلنے پر	111	مثال 1
173	مخالفت کا طوفان اٹھنا	129	مثال 2
	کفر کے فتوے ہندوستان کے	131	تیسری خصوصیت
173	علماء کے لکھے ہوئے	132	چوتھی خصوصیت
180	کفر کے فتوے کا جواب	133	پانچویں خصوصیت
181	لطیفہ 1	135	رفارمیشن اور اس کا منشا
181	لطیفہ 2		وہ اختلافی مسائل جن میں سرسید کے
	کفر کے فتووں کے لیے مولوی	149	ساتھ اور محققین بھی شریک ہیں

223	صوبہ پنجاب کے مسلمانوں کی تائید	علی بخش خاں کا حرمین کو جانا اور
223	کالج کا یورپین اسٹاف	علمائے حرمین سے فتویٰ لے کر
225	عمدہ اخلاق اور اعلیٰ لیاقتیں	163 واپس آنا
	<b>سرسید میں مختلف لیاقتوں کا</b>	168 کفر کے فتوؤں پر مصنف کا ریمارک
		مدرسہ العلوم کی مذہبی تعلیم کے
		191 انتظام سے علماء کا انکار کرنا
228	پالیٹکس	194 سرسید پر مخالفین کے بہتان
243	تعلیم	بنارس میں مسجد کے ڈھانے
262	مذہبی تحقیق	196 کا اہتمام
296	سوشل رفارم	200 قتل کی دھمکیاں
299	تصنیف و تالیف	201 اڈیٹر فیس ہند کی مخالفت
307	تحریر	203 بیچ اخباروں وغیرہ کی مخالفت
343	پبلک پسکنگ	بعض افسروں اور حاکموں کی طرف
		204 سے مخالفت ظاہر ہونا
	<b>شکل و شمائل، اوضاع و عادات،</b>	سرسید کا جواب انڈین آیزرور
	<b>اخلاق و خصائل اور مذہب،</b>	206 کے ایک سخت آرٹیکل کا
356	شکل و شمائل	<b>کامیابی اور اس کے اسباب</b>
	اوضاع و عادات، لباس اور	
361	طریق بودوباش	محض زمانہ کا اقتضا کامیابی کا
362	مہمانداری	212 سبب نہ تھا
363	مسکرات سے پرہیز	سچائی سب سے بڑا سبب کامیابی
363	صحت جسمانی	216 کا تھا
364	میلے تماشوں سے نفرت	216 گورنمنٹ میں رسوخ
364	مہرافت	216 دوستوں کی امداد

447	رسالت	369	مطالعہ
448	فرائض منصوصہ	370	تصنیف کی حالت
448	شُرک فی النبوة	371	خطوں کا جواب دینا
449	امت مجتہدین	373	محنت و جفاکشی
449	مقلدین	378	زندہ دلی
450	غیر مقلدین	382	ذہانت
450	نبوت پر استدلال	386	اخلاق اور خصائل
451	اعجاز قرآن	389	راست بازی
453	فرائض منصوصہ		
454	دین اسلام		<b>محبت و صداقت</b>
455	حمایت اسلام کی وجہ		
455	حقیقت اسلام کا یقین	404	کنبے کی محبت
457	تقلید کی مخالفت	406	وطن کی محبت
459	تعصب اہل اسلام	410	دوستوں کے ساتھ برتاؤ
459	اسلام کی حمایت	421	لوکروں کے ساتھ تعلقات
460	طیور منخفقہ اہل کتاب	422	فراخ حوصلگی
461	فضول مذہبی بحثوں سے اجتناب	432	انتقام کا خیال نہ ہونا
464	وبا سے بھاگنا	439	خود غرضی کا الزام
465	اسلام کا ادب	440	حب جاہ کا الزام
467	تفسیر قرآن لکھنے کی غایت	441	اپنی رائے پر وثوق
470	نبی کی محبت		
471	اسباب دنیوی سے بے تعلق		<b>مذہب</b>
476	بے تعصبی		
481	اسلامی حمیت	445	حقیقت اسلام کا یقین
483	سرید کے اسلام کی خصوصیات	446	توحید

## مذہبی خدمات

اس عنوان میں ہم سرسید کی وہ کوششیں اور خدمات دکھانی چاہتے ہیں جو دین اسلام کی حمایت میں زمانہ حال کی ضرورتوں کے موافق وہ اخیر دم تک انجام دیتے رہے اگرچہ ابھی تک ان کی مذہبی خدمات کی کچھ قدر نہیں ہوئی کیونکہ ایک محدود جماعت کے سوا اکثر مسلمان ان کی مذہبی تصنیفات کو تخریب اسلام جانتے ہیں اور اکثر تکفیر یا تفسیل کے خوف سے محض ستمگنہ مخالفین کی اہل میں ہاں ملا دیتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ مخالفت کا سبب محض تعصب یا پاس وینداری ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ تاواضعیت اور زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہونا بھی شامل ہے اس لیے امید ہے کہ جس قدر لوگ زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اسی قدر سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جائے گی۔

سرسید نے جو کچھ مذہب کے متعلق ابتدا سے اخیر تک لکھا ہے منجملہ اس کے وہ کتابیں اور رسالے جو غدر کے زمانہ سے پہلے لکھے گئے اور جن کا ذکر پہلے حصہ میں اپنے اپنے موقع پر آچکا ہے وہ اس مقام پر ہماری بحث سے خارج ہیں۔ کیونکہ ان میں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جس کے لحاظ سے ان کو قدیم طرز کی تصنیفات میں کوئی ممتاز درجہ دیا جائے یا جو اسلام کی حمایت کے لیے اس میں درکار ہے۔ پس جو کچھ ہم کو اس باب میں دکھانا ہے وہ صرف ان کی وہ مذہبی خدمات ہیں جو غدر کے بعد انھوں نے انجام دیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ انھوں نے



عذر کے بعد مذہب کے متعلق کھادہ خطا اور غلطی سے بالکل پاک ہے اور ایک قافی مخلوق کا کام ایسا ہو بھی نہیں سکتا لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور کہیں گے کہ جس شخص کو کافر، کفر، نیچری اور بد مذہب کہا جاتا تھا جو اسلام کی خدمت اس سے بن آئی وہ نہ ان مستفتیوں سے ہو سکی جنہوں نے مکہ میں جا کر اس کے کفر کے فتوے کھوائے اور نہ ان مفتیوں سے جنہوں نے مسجد الحرام میں بیٹھ کر اس کے کفر کے فتووں پر مہریں لگائیں

## ہندوستان میں اسلام کن خطروں میں گھرا ہوا تھا

ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوروں میں انکو دیلا تینڈا سکارپٹ بھراؤ بلجاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فریب کی تلاش میں رہتے تھے۔

## پہلا خطرہ

ہندوستان میں سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا اور اس لیے ان کی مشا دیوں میں، ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ باقی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیوں کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان طے کے دام میں آگئے ہیں خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام اشکر اللہ مساعیہم) جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آل حسن اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ متنبہ ہونے انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں

اور ان سے بالمشافہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا لیکن اس کا اثر مسلمانوں ہی تک محدود رہا عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آئی تھیں وہ بدستور قائم رہیں۔

## دوسرا خطرہ

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پوسٹل حالت سے علاقہ رکھتا تھا اول تو مسلمانوں اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے دوسرے بسبب ان غلط فہمیوں کے جو یورپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں، انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بیسی و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

## تیسرا خطرہ

تیسرا خطرہ خاص کر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح نفع نہ تھا، اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا ابھرنے کا محال ہو گیا تھا یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں تعلیم پھیلانی پڑی، حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پمپنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

پچھلے دو توں خطروں کا سرسید کے سوا ہندوستان کے کسی عالم کو احساس نہیں ہوا۔ موبلوں سے اس کے سوا کہ چند روز دریا کی رو یعنی انگریزی تعلیم کو

روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار کر رہ گئے اور کچھ نہیں ہو سکا۔ سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے ان تینوں خطروں کا جہاں تک کہ اس کی قدرت میں مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اُس میں کامیابی حاصل کی۔

## سرسید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا

اُس نے تمام اعتراضوں کے جواب جن کے ذریعہ مشنری مسلمانوں کو وام میں لاسکتے تھے خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر لکھے، اس نے تمام غلطیوں کو رفع کیا جو اسلام کی نسبت عیسائی قوموں میں پھیلی ہوئی تھیں، اس نے بدلائل قاطعہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب اسلام سے زیادہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور اُس نے جب دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے کسی طرح مسلمانوں کو مضر نہیں ہو سکتا تو اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ اسلام کو انگریزی تعلیم کے مضر نتائج سے بچانے میں صرف کیا۔

## بائبل کی تفسیر

انہوں نے ان مقاصد کی طرف پہلی ہی بار اُس وقت توجہ کی تھی جبکہ مراد آباد میں تبیین الکلام یعنی توریث و انجیل کی تفسیر لکھنے کی بنیاد ڈالی اس کتاب کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے۔

## سرو لیم کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری

یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، پھر جب سرو لیم میور کی کتاب لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی جس کی نسبت عیسائیوں

میں مشہور تھا کہ اُس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء میں سائٹنگ سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دلی سے منشی اموجان مرحوم اور جہانگیر باو سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کو یہ بھی اس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے، علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کی ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اس وقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی۔ مگر چونکہ ہم انھیں کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اُن کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سرولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خمیر نہیں۔ اسی وقت ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار جن سے اُس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہ نقل کیے گئے ہیں ایک مولوی سے انتخاب کرارے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا پختہ ارادہ سرولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو اُن کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سرسید کے بعض خطوں سے جو انھوں نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب انھوں

یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو ان کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار

## سرولیم میو کا جواب لکھنے سے دوستوں کا منع کرنا

اور سرولیم میو کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے ان کو سرولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے مگر سرسید نے ان کا کہنا نہیں مانا اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔

## خطبات احمدیہ کے لیے میٹرل جمع کرنا

انہوں نے انڈیا آفس کے کتب خانے سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعات حاصل کیں۔ شیرک کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپتی تھیں وہاں سے سنگرائیں اور چنڈ لٹین اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ ایسے یعنی خطبہ یا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شہر کیا۔

## خطبات کے لکھنے میں سرگرمی جو ولایت کے

## خطوں سے پائی جاتی ہے

اس کتاب کے کھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات ان کو اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت



اُس کے لکھنے میں اُن کو کرنی پڑی اُس کا کسی قدر اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے دلالت سے مولوی سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "ان دنوں ذرا قدمے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو لیا دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور اُس کی نانا نصائیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے ہیں نے فرانس اور جرمنی سے اور میرے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں پھٹیاں روانہ ہو گئی۔ سیرت ہشامی مطبوعہ اور پینت کتابیں لٹین کی خریدیں ایک آدمی مقرر کر لیا جو لٹین کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "مواعظ احمدیہ یعنی خطبات احمدیہ لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں جانا آتا ملنا جتنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی بہا جن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے سوڈا اور روپیہ میں ادا کر دوں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے بدلے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف سہی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجو۔ کیا کہیے اس کتاب کے پچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا مدد کرے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں روز و شب تخریر کتاب میر مصطفوی یعنی خطبات احمدیہ میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمزور گتے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور

بھی سخت ہو گیا ہے۔ اور جب حساب دیکھا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ  
 ابھی لکھنا اور چھپانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا؟  
 ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں، سکتا سا ہو گیا۔  
 دن رات کی تکلیف تھے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے، جلد اول خطبات  
 احمدیہ کی تمام ہو گئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تمام ہو جائے گا۔ اب جو  
 اندازہ اس کی ایک جلد کے چھاپنے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ  
 کا معلوم ہوتا ہے، ہوش جاتے رہے ہیں اور جان میں جان نہیں میر تراز علی  
 نے نہایت مدد کی ہے، تین سو روپیہ اس کے چندہ کی بابت بھیجے ہیں، میر  
 ظہیر حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے، سزوار حجت اللہ بگ صاحب  
 نے اپنا چندہ سو روپیہ بھیجا، آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھجوادھیجیے  
 اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیج دیکھیے“

جب ہندوستان سے سرسید کے دستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو  
 ان کو بے انتہا تقویت ہوئی چنانچہ اس کی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر  
 آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مر جانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا“  
 مگر بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپہ کا پہلے کیا گیا  
 تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہو گیا تھا، یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہو جس  
 میں سے کچھ کم مولد سو روپیہ سرسید کے دستوں نے ہندوستان سے چندہ کر  
 کے بھیجا اور باقی روپیہ سرسید نے قرض لے کر ادا کیا، ان کے ایک خط سے  
 معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرتے وقت ان کے پاس زیادہ  
 کے لیے کچھ نہ رہا تھا اور نہایت پریشان تھے، وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ  
 ”اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے مراجعت متعسر ہے۔ یہ

ترقوات ایسے جانکاه ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہو رہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے۔ اُن کے محصول وغیرہ میں بھی دوسو روپیہ سے کم خرچ نہیں ہونے کے۔ اب زیادہ حال ترقوات کا لکھنا ناحق آپ کو ترود میں ڈالتا ہے۔“

شاید اسی اخیر خط کے جواب میں مولوی سید مہدی علیجاں نے اپنی سارا تنخواہ بھیجنے اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سر سید نے اُن کو لکھا کہ ”کتاب کے اخراجات کا صدرہ اور عین اسی صدرہ میں صدرہ غم انتقال ہمیشہ حاد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا واقعہ کر بلا سے کم نہ تھا۔“

۷۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے عہائے دگر

آپ نے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں اُن کا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں رہی تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا۔ سب بیباق ہو گیا۔ اب آپ کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ لیجیے۔ مگر غار جا معلوم ہوا کہ سید مہدی علیجاں اس خط کے پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کا روپیہ روانہ کر چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سر سید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسبِ تنخواہ تیار ہو گئی تو اُن کو بے انتہا خوشی اور فخر اس کے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علیجاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس چھ کے برابر سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔“ ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم فہم نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے جو الفاظ کہ اُس

نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اُس کی لڑت میں ہی جانتا ہوں " ایک اور خط میں لکھتے ہیں "آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم بیور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت متفقانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈالا تو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں" خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہیں جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں، اس سے سوا اس کے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا خوش تھے اور کوئی بات ثنابت نہیں ہوتی، سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بھقام عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے خرد ہندوستان کے علمائے اسلام نے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، بڑی بڑی مبسوط کتابیں نہایت کوشش سے اسی مضمون پر تحریر کی ہیں۔

## خطبات احمدیہ کی ترمیح پہلی کتابوں پر جو اسلام کی حمایت میں لکھی گئیں

پس تا وقتیکہ خطبات احمدیہ ہیں کوئی وجہ ترمیح کی نہ پائی جائے اس کو اگلے علمائے کتابوں پر فوقیت نہیں دیا جاسکتی، مگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جن کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان سے اسلام کی ایسی خدمت بن نہیں آئی۔

## ترجیح کی پہلی وجہ

اولاً جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے، ہر سیدے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس فرض سے نہیں کیا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت کے لیے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹرل جمع کرے۔ وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے۔ یورپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام براعظم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو، اس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اس کو چھپوا کر شایع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں ان قوموں کے کان تک پہنچانے جنہوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت بُرائی کے سوا کوئی بات نہ سنی ہو۔

ریورڈڈ ہیرسپہر جو اب سے تقریباً بیس برس پہلے لاہور ڈیولپمنٹ کالج میں پرنسپل

تھے اور جن سے میں خود بار بار ملا ہوں، انہوں نے میرے ایک دلہری دوست سے جو ان کو اردو پڑھاتے تھے کہا کہ ”مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے سوا بندگان کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جا کر انہیں کی زبان میں وغلط کہتے اور انہیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے ہیں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔“

مسٹر آر نلڈ جنہوں نے ابھی پریسچنگ آف اسلام لکھی ہے اور اس کے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے ہمیشہ واقفیت حاصل کی ہے۔



ایک نہایت سچے اور سچختہ عیسائی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ”ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے مقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جا کر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔“

سر سید کہتے تھے کہ ”۱۸۵۷ء میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپر لندن میں شائع ہوئی تو اس پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو عورتیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔“

## دوسری وجہ

دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سر سید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اس مناصبہ طریقہ کی جگہ جو مسلمانوں میں عموماً دائرہ وسائر ہے اور جس سے فریق مخالفت کے دل میں بجالنے و رغبت کے نضرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔

کرنل گریم سر سید کی لائف میں خطبات احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر غیر مذہبوں سے بے نفی اور اصل عیسائیت کے سچے اصول کا ادب“ پھر اپنی قوم کے مذہبی

لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ ”جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دین محمدی فی زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ یعنی اسلام، عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغایرت اور تنگمندی کی اُس میں خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف یعنی سید احمد خاں نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب ”لائف آف محمد“ کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔“ اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطبات احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرہ کے متعلق برخلات قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر سفید اور کس قدر فریق ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

## تیسری وجہ

خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ دوسرے طریقہ جس کے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور

جس میں ان کو کبھی مقابلہ اہل اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اس کی جگہ اپنی کتاب لائف اوف محمد میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاص کر تعلیم یافتہ لوگوں پر خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا، مثلاً قدیم مشنری مسلمانوں کی کتب سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لیے جن روایتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سحراٹ اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ مگر سر ولیم میور نے ان کے برخلاف تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی حدیثوں، تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں مندرج ہیں، صحیح تسلیم کر کے آنحضرت کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی، یا مثلاً پادری فائڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے، اور اس کی تعلیم کو انبیاء کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے۔ مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کیں تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کریں، اس کو زمانہ حال کی شائستگی اور تمدن و حسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا، مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی و خورزی می کا جوابدہ اسلام کو ٹھہرایا تھا، یہ باتیں گوئی نفسہ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جاو و کام کام کرنے والی تھیں، سر سید نے ان تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دلنشیں دلائل سے رفع کیا ہے، انھوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور ان روایتوں کا جو ان کتابوں میں درج ہیں مفصل حال بیان کیا ہے جو ان لوگوں کے لیے جو سچائی اور انصاف

مے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہے۔ ان خطبوں میں روایت کی تنقید کے جو اصول و قواعد محمد ثنیں نے مقرر کیے ہیں۔ اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قیاس دیا ہے ان کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اس پر غور کرنے کے بعد ان روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جن کی رو سے مسرولیم میونس نے اسلام کی تسلیم اور بانی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ انھوں نے نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی یا ذہنی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں ان کے جوابدہ خود مسلمان ہیں یہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافیائی تحقیقات پر مبنی تھے ان کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی منصف مزاج آدمی کو اگرچہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو، اس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔

## چوتھی وجہ

گر سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اس کو اگلے علمائے کتابوں سے ممتاز ٹھیراتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں بزخلاف دیگر علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک اعتراض کا متفقہ جواب جو عیسائی اور لاندہب دونوں کو برابر دیا جاسکے لکھا گیا ہے الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں ان لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب

سے آزاد ہیں، بیباں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقالات خطبات احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سرسید کا طریق استدلال کیا ہے اور جنہوں نے اُن سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں اُن کا طریق استدلال کیا تھا! مگر ہم باوجود اس کے کہ سرسید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی آل حسن کے سرسید سے کچھ کم مداح اور شکر گزار نہیں ہیں جنہوں نے مہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور اُن سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور حین کی کتابیں دیکھ کر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔

## پہلی مثال

عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بابت کثرت ازواج اور اسلام پر بابت اجازت تعدد ازواج اور اجازت طلاق کے بے اسس کی تردید میں ہمارے علمائے بالکل الزامی جوابوں سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب اُن کے لیے کافی ودافی ہیں مثلاً ازالۃ الاولاد ولام میں تو ریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح، حضرت یعقوب کے چار نکاح، حضرت موسیٰ کے دو نکاح، حضرت داؤد کی توے سے دیاوہ بیباں جن میں بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیباں اور بعض اور بنیاد کی کثرت ازواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر تو ریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ ٹہریں مانتے، ثابت



کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جو ازہ طلاق کا حکم دیا ہے کتاب استفسار میں بھی  
 اول اسی قسم کے الزامی جواب دیے ہیں اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے  
 کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت و انجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ  
 جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالیٰ کسی نبی کو بہت  
 سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے  
 کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے  
 اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں۔ ماسخ و  
 مسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علمائے دیہے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے  
 لیے اور عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو ان کے ساکت کرنے کے  
 کافی ہیں مگر عیسائی باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر  
 مسوخ جانتے ہیں، نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے  
 حوالوں پر کان دھرتے ہیں نیز عیسائی انبیا کو مثل اہل اسلام کے معصوم  
 نہیں سمجھتے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب  
 کرتے ہیں پس تا وقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے ان کی زبان  
 بند نہیں کی جا سکتی اس کے سوا الزامی جوابات ان لوگوں کے لیے جو  
 توریت و انجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک کہ اس زمانہ کی مسلمات  
 کے موافق ان کا جواب نہ دیا جائے۔

مسئلہ تعداد ازواج اور جو ازہ طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آگئی  
 ہے۔ اس میں سر سید نے اول سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جس کا محصل  
 یہ ہے کہ تعدد ازواج اور اطلاق کا حکم عام اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے۔ عام

زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسن معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔  
اس کے جواب میں سرسید نے اول تعداد ازواج پر لمبی بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ”اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے، اول قانون قدرت کے لحاظ سے، سو ہم قدرت کی بے غلط نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت اُن کے خالق کا بہ نشانتا کہ اُن کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے۔ بر خلاف اس کے کہ جن ذی روحوں کی متعدد مادہ اُنیں ہوتی مقصود تھیں اُن کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد متناسب نہیں ہوتی اس قانونی کے بموجب جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے۔ مگر چونکہ رتیبہ میں بوجہ اس بیش بہا قوت کے جو مد رک کلیات و جزئیات سے وہ تمام مخلوقات سے اشراف ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے قدرت نے اُس کو عطا کیے ہیں، اُن کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امور و طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین مصلحت اور ممالک مختلفہ کی سب و ہوا کے کام میں لانے ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ رتیبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرت ازواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا تقاضا التزام خلافت نفرت ہے۔

اس کے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، ایسی بات کر تو ریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ”جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا

اُس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اُس نے اُس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا۔ اور وہ عمدت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجالست سے اُس کی خوشی کو بڑھا دے اپنی محبت بھری ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اِس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ”بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو“ مرد سے مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالق زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جو زویش رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری کا جو رد کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اُس کو حاصل ہے۔ سیاست مَدَن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔

۱۰۔ اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مشا محالات سے ہے پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کیلئے ہم قائل ہیں۔“

اس کے بعد وہ ڈیون پریٹ کی کتاب سے مانٹیگیو کی رائے تعادوازواج

کی تاثیر میں نقل کرنے میں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعدد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے" پھر سٹر بگننر کی رائے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ "علم قوائے انسانی اور علم طبیعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرت ازدواج کے واسطے بطور ایک مندر کے متصور ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سردخون والے سینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتیں، مگر بنی اسپیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں متعلق ہو سکتی ہیں" اس کے بعد سٹر بگننر نے سرد بلیو واسلی صاحب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر بت بیچ عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں۔ مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات ماحصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانی اسلام کے لیے اس بات کی کہ انھوں نے متعدد وجوہات کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گونڈوں کے آئین پر چھوڑ دیا کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی"۔

ان دونوں مذکورہ بالا رالیوں پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں "افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازدواج پر صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نظر کیا ہے مگر مذہب اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی تلخیوں کے

واسطے اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک نذر کر  
 حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اُس کے قدرت کے  
 کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے ۔

اس کے بعد سر سید اُن اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آنحضرت سے  
 پہلے عرب اور اُس کے گرد و نواح کے ملکوں میں ازواج کے متعلق واقع تھیں  
 جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۔ ایران میں تو انین نکاح بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے  
 یہاں تک کہ بیٹے کو اُس کی ماں ایسی ہی سباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور  
 بھائی کو اس کی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشے مغرب میں بکثرت  
 آباد تھے تعداد ازواج کی رسم بلا کسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی  
 عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعداد ازواج  
 کی کچھ انتہا نہ تھی تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا ترتیب یا عمر یا رشتہ داری کے  
 مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا  
 حال ان سب کے برخلاف تھا۔ ان کے ہاں ایک جوڑو بھی کرنی کچھ نیکی  
 نہیں گنتی جاتی تھی بلکہ رہبانیت اور تجرّد محض کی عام ہدایت تھی اور مرد عورت  
 دونوں کے لیے وہی نیکی گنتی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جبکہ عقل اور دل کی تابدیگی  
 چھائی ہوئی تھی اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانی اسلام نے  
 ایک ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو بجا بجا اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل  
 کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت  
 کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور  
 دونوں کے لیے اُس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے ۔  
 اس کے بعد انھوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث

کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے یہودیوں کے ہاں یکثرت اور بلا تعین حد ازدواج موجود ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی چنانچہ مسٹر گگنز کھتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا متعدد یہودیوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی نظیر پر جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی، جان ٹولین پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔"

اس کے بعد سر سید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم دین جان ملٹن جو تعدد ازدواج کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی ہیں اس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعدد ازدواج کے حوالہ پر ایک لطیف اور دقیق استدلال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا، اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی ہیری کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں سبائز رکھا ہے ہم



کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اس کی سرمنی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہو گا جو قانونِ قدرت کے تو برخلات نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو اور وہ یہی مسئلہ ٹھیٹھ اسلام کا ہے۔

قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور سچے سچے مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو نقطوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے: "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَقْدِرُوا فَوَاحِدَةً" یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوڑوں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جوڑو رکھنی چاہیے) اس کے بعد ان کی تقریر کا محصل یہ ہے کہ "اس آیت کے اگر وہی معنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہاء اور علمائے لیے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعددِ ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا و بیندار ہو گا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعددِ ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرات نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ ان لَمْ تَقْدِرُوا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ان خِفْتُمْ اَلَّا تَقْدِرُوا پس اگر یہ ممکن ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اس کو متعدد جوڑوئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ یہ آیت ہے "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ" (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں

عدل کر سکو، اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے، بیان کر کے لکھتے ہیں۔

وہ ہاں بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا نشاٹھی کی اوچھل ٹھکار کھیلنا ہے ایک جیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عملد سآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم لازم ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔

ان باتوں کو سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذمہ دولت ہوئی اور دو دو تین تین اور چار چار جوڑ میں کرنے لگے اور ایک بانہ کی عورت کو دانو پر چڑھایا اور نکاح کر مارا، جہاں مقدس بزرگ مولوی مہر نے اور اللہ مہیاں کے ساتھ بنے، اس سریدنی کو لے ڈالا، وہاں وعظ کہنے لگے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا، قرآن پڑھاتے پڑھاتے وہ سراسر سبق خطبہ النکاح کا پڑھانے لگے اور ہمارے دوسرے بیجاٹیوں نے ایک جیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنکھانا شروع کیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے، یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اور بائس ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے، پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خرابی حقیقت سے چشم پوشی کرنا چمکا ڈروں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔

اس کے بعد سرسید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے، وہ اول حسن

معاشرت کی نظر سے اس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں سب بڑا دشمن جن معاشرت و تمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے۔ اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ”لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے کیونکہ اس سے مرد و عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو گئی تھی، با اینہم اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ ان بد اخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آسٹکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیرائے مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اسی حالت میں اس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں اور ایسے نردوان و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن و طعن و جوتی چیز میں رکھنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حرم معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔“

اس کے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "یہودیوں کے ہاں طلاق و نیا بغیر کسی تیسرے شرط حالت کے مرد کے اختیار میں تھا جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جو رو کو دیدیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا حضرت عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا لیکن اگر نئی اوضاع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی چنانچہ حضرت عیسیٰ کے معتقدوں نے ان سے کہا کہ اگر جو رو سے مرد کا یہ طور ہے تو جو رو کرنا خوب نہیں۔ اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضربے اور جو رنج وہ امور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔" اس کے بعد سرسید نے پورے پے کے مشہور و نامور عیسائی عالم حبان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں۔ نقل کی ہے اور بائبل کا جن آیتوں سے انھوں نے جواز طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ "حضرت عیسیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوٹی بیوی سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔"

اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں جو اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہو گا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے درسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لا علاج کا علاج ہے۔"

جان ملٹن کی تقریر نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اس نے طلاق کو بطور ایک مرض لا علاج کے جائز و مباح بتلایا ہے مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اس میں بیماری پیدا ہو سہوئے انھیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے بانی اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر، بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موافقت کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دلتواتہ اور مونس ٹمگسڈ کے پیدا ہوئی تھی ۛ

"اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور بھیت مسلمانوں کو کی ہے۔"

"بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروں کو بتایا کہ "ما خلق اللہ شیئاً علیٰ وجہ الارض ابض الیہ من الطلاق یعنی کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پر وہ پر

ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو) “  
 ” پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ ” ابعض الحلال الى الله الطلاق “ (یعنی خدا کے  
 نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے)“  
 اس کے بعد لکھتے ہیں ” کہ یہ ہدایت نو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو  
 طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا ” ایما امرأة سألت نزوجھا طلاقا فی غیر ما باس فحرام علیھا  
 راحة الجنة “ (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے  
 اس پر جنت کی بوتل تک حرام ہے ۔

پھر لکھتے ہیں کہ ” پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم طلاق دینے والے سے ایسے  
 مراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جو رو کو  
 دفعۃً تطعی طلاق دیدے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ نسائی نے روایت  
 کی کہ ایک شخص نے اپنی جو رو کو دفعۃً تین طلاقیں دیدیں یہ سن کر آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اس نے  
 خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے ! اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود  
 ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر  
 ڈالوں ! یعنی وہ شخص آنحضرت کی شدت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص  
 نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے ۔“

اس کے بعد ان کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ” بانی اسلام نے طلاق کے  
 روکنے میں انھیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور ملاپ قائم  
 رکھنے کے لیے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے  
 دن و شوہر میں پوری تفریق نہ ہو اور دفعۃً تین طلاقیں دینے کی ممانعت  
 فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے



ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصلہ ہوتا ہے تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے تو بدستور زن و شوہر میں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرط مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل سنڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفرق ہو جائے۔

”علاوہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بد مزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔“

اُس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش یا نعمت ثابت ہوا اور اُس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اُس کے حالت معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بچانے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابلِ تضرع طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس اُن کے افعال کی نظریں انھیں پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس! اب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو ہی نہیں

مکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی انساؤ کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اُس کے لیے اس کا جڑا پیدا کیا تاکہ اُس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو ۛ

## دوسری مثال

جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الادھام اور استفسار وغیرہ میں عہد عتیق کے بیشمار حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیائے بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیائے اس حکم کی تعمیل کی، اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے یہ جواب بھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کے لیے جو کہ تمام عہد عتیق کو الہامی جانتے ہیں، کافی تھا، مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو عموماً خواہ وہ کسی مذہب میں ہو، اصول تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ بنی نوع انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے اُن کے لیے اور اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو ان معترضین کی تحریریں دیکھتے تھے، کافی نہ تھا۔

سرسید نے خطبات احمدیہ میں اور اس کے سوا اپنی اور بہت سی تحریروں میں اس منظر کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو، خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی، اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ مفصل بحث اہل مغرب نے اس مسئلہ پر اپنی تعبیر میں کی ہے، مگر یہاں ہم صرف اُن کی اس تحریر کا بہت مختصر

خلاصہ جو خطبات میں درج ہے۔ لکھتے ہیں:

”دوسروں کو مسیحا کے نام سے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اس کے جواب میں اول ایک لمبی تخریر میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رائے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسی دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر عیسائیوں کے قول کے موافق اسلام میں آزادی رائے نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کے قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے تو یہ اسلام پر ان سببوں سے الزامات میں سے ہے جو غیر مذہب والوں نے نا انصافی سے اس پر لگائے ہیں۔ یا تو وہ لوگ اصول اسلام سے ناواقف ہیں یا وہ وہ دورانتہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے جبکہ اسلام دل یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کہو کہ یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قتلوا یا جاتا ہے۔ جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے کس قدر خلاف ہے کہ ”لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ كَذَّبْنَا مِنَ الْغَيْبِ“ یعنی دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں ہے کیونکہ جبریت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہو گیا ہے۔“

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”جس اصول پر حضرت مسیحی نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر استثنائے قتل و غارت اور نیت و بالود کر دیں۔ اس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار

میان سے نہیں نکالی، اُس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبولانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اُس نے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور اُن کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو۔ اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتداءً سے سلام میں مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورتِ وقت کے اُن پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین اُن کے دل میں بٹھائیں جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مائع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی سرگزرا جازت نہیں دی، مگر جب خدا کے نام کی ستادی روک دی جائے اور موحدوں کو امن بیسر نہ ہو، جیسا کہ مکہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان کہہ سے نکل گئے تو بھی اُن کا تعاقب نہ چھوڑا، اُس وقت بلاشبہ اپنے بچاؤ اور اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے اسلام نے تلوار نکلنے کی اجازت دی ہے۔

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و شرح بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اس بیان سے ان عیسائی مسنفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے۔" پھر لکھتے ہیں کہ "ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی سے دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کیا، مگر مذہب کا اندازہ اُن کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ آیا انہوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں اس وقت صاف کھل جائے گا کہ اُن کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف

تھے مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان فتح مند اپنے مذہب کے پابند تھے وہ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلا لحاظ قوم و مذہب کے ہر طرح کا امن و آزادی بخٹھتے تھے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ”چمبرز انساٹکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس سے اسلام کی طرف ذاری کی باکل توقع نہ تھی، اسپین کے علم تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ ”اسپین کے نئی امپیر خلیفہ کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابل بیان ہے کیونکہ اس سے اسپین کے بمعصر یعنی عیسائی اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانہ تک ان بادشاہوں کی ٹیری عمدگی پائی جاتی ہے، یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔“

اس کے بعد گاڈ فرمی گینز کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اس وجہ سے سنانے میں آتی ہے کہ اس میں تعصب زیادہ ہے اور دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے۔ یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو پائی وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے جلا وطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے وے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں عیسائی

امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور اُن کے مذہب اُن کے پادریوں اُن کے بپشپ، اُن کے بزرگوں اور اُن کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جو لڑائی یا نفع یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ڈیمرارا کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے۔

”ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ”وہ کسی شخص کو اپنا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب اُن میں خوش و خرم تھے۔ اگرچہ بظاہر موراس وجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی مانک رابہ سمجھتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہوسکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوت جواب دینے کے باہر تھی وہاں تک اُن کا یہ خیال صحیح تھا۔“

”خلفا کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ عیسائیوں میں، مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب آگ میں جلایا گیا ہو اور نہ مجھ کو یقین ہے کہ زناٹہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اُس نے اسلام قبول نہیں کیا۔“

اس کے بعد جان ڈولین پورٹ کی کتاب اپالوجی سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں، ”خونریزی اور بردباری اُن نواحقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دو سو برس تک ترکوں پر کیے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک



ہوئے، پھر قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں ملتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، تو تھر کے پیروں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریلے رائن سے لے کر انتہائی شمال تک ہنری، شتم اور اس کی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا فرانس میں سینٹ یار تھو لو میو کا قتل ہونا، چالیس برس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا، فرانسیسیوں کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جو اب تک اس لیے قابلِ نظر ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا، علاوہ اس کے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ کے مقابلہ میں اور لیبسٹ کے مقابلہ میں تھے زہر خورانی اور قتل کی دلدراتوں کا ہونا۔ اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب پاتھ میں لیے قتل ہونا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کروہ اور گویا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں سبرگز جاری نہیں رہا۔

اس کے بعد مشہور عیسائی مورخ مسٹر گبن کی رائے اس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے، نقل کی ہے: پھر ایک آرٹیکل سے جو کسی یورپین مصنف نے ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا، مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے: "اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو اپنا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلافت مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجز تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا، اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت

پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔  
اس کے بعد فلسطین کے ایک عیسائی شاعر لارٹین کا یہ قول نقل کیا ہے  
ہے کہ "صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب  
کو آزادی سے رکھتے ہیں۔"

پھر ایک انگریزی سیاح سیڈن کا یہ قول نقل کیا ہے جو اس نے بطور  
طعن کے مسلمانوں کی نسبت کہا ہے یعنی یہ کہ "وہ حد سے زیادہ دوسرے  
مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔"

یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "دیکھو یہ سب رائیں  
ہبت سے بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سرولیم میور کے اس  
بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب  
کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔"

## خطبات احمدیہ کے مضامین کا خلاصہ

ان دو مثالوں کے بعد سرسید کی کتاب کی نہایت مختصر کیفیت جس  
سے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا جو اس کتاب کے لکھنے میں اس نے کی ہے  
کسی قدر اندازہ ہو سکے گا اور ناظرین کے ذہن میں کتاب کی حقیقت کا ایک جھنڈلا  
ساخیال پیدا ہو جائے گا، بیان کرتے ہیں۔

## پہلا خطبہ

پہلے خطبہ میں جو سب سے بڑا اور سب سے عمدہ نمونہ ایک کتاب ہے۔ عرب  
کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے ان بعض مسلمات کے

ثابت کرنے کے لیے جن کا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار فرمایا ہے بطور  
 بنیاد مباحثہ آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ آئندہ خطبات میں اس  
 بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جبل فاران جس کا نام توریت کی ایک  
 آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی  
 بشارت نکالتے ہیں آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں سے ہے یا بقول  
 سر ولیم میور کے جبال شام میں؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمعیلؑ اور ان کے بیٹے  
 عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں آیا ہوئے یا بقول سر ولیم  
 میور کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمعیلؑ کی  
 کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سر ولیم میور کے ثابت نہیں ہے؟  
 اس خطبہ میں سر سید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں  
 سے اپنے ہر ایک دعوے پر سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے  
 بر خلاف استدلال کیا ہے۔

## دوسرا خطبہ

دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و  
 عقاید اچھے یا برے، جہاں تک کہ شعرائے جاہلیت کے شعار اور دیگر معتبر  
 ذریعوں سے معلوم ہوئے، بیان کیے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط  
 کی ہیں ان کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیے ہیں جن سے ان  
 باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ لوگوں کو  
 اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت  
 تھی اور اسلام کے بعد ان کے اخلاق اور عادات اور عقاید و خیالات کس  
 درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

## تیسرا خطبہ

تیسرے خطبہ میں ان ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع ہوئے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان میں کون سے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے؟ اس خطبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے بہت پرست، خدا پرست، لاد مذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔ ان میں سے اول کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے:

- ۱۔ مذہب صنابین۔
- ۲۔ مذہب ابلہیم اور دیگر انبیائے عرب یعنی بوہڑ صالح اسمعیل اور شعیب کا۔
- ۳۔ مذہب یہود۔
- ۴۔ مذہب عیسوی۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک کا ایک مذہبی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا اور اس کو حیرت آمیز طور پر میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعۃً جزیرہ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر پور کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام نے عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا گیا اصلاحیں کیں؟ کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی؟ اس کے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام درحقیقت اصول و عقاید متفرقہ و منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے، اس کا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ "ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ مشابہت

اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدأ ایک ہی غیر منتہیٰ اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی۔ جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا شکل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ منون رہنا چاہیئے جنہوں نے بتائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھیرایا، جنہوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنہوں نے اپنے با اہل انقیاب کے لیے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے۔

## چوتھا خطبہ

چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شاقی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبہ کو سرسید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے کیونکہ طرفدارِ دل چھے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اس کو ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور نا طرفدار دل اور سیدھی سادھی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا

ہے اور اسی لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس لاسٹے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے :

## خطبہ ۴ کا پہلا حصہ

مصنف نے اس مضمون کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں وہ قارئین کے بیان کیے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اس کے ثبوت میں ان مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کیے ہیں جنہوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سر ولیم میور جن کی نسبت سر سید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دنیارہ عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔ ایڈورڈ ڈگلبن جان ڈولین پورٹ ٹامس کارلائل وغیرہ وغیرہ۔

## دوسرا حصہ

دوسرے حصہ میں ان عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنہوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں مضر بتلایا ہے اور اس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

## تیسرا حصہ

تیسرے حصہ میں ان قارئین کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں



مذہبوں کو بلا اشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ یہ دونوں حصے خطبہ مذکورہ کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصہ میں اُس کی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اس لیے ان کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے۔ مگر تیسرے حصہ کا صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے یہاں لکھا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہ اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بد اخلاقی کے افعالِ قبیحہ منسوب کرنے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اُن تخریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تخریروں کو الہام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کو ان افعالِ قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ اسلام نے ان معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا اور جو تہام یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر لگائے تھے ان کو تختِ مذہبی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیاء و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں، تورات کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے اُن کو بخوبی دریافت کیا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، ان کی بیٹیوں، حضرت اسحاقؑ، یہود، حضرت یعقوبؑ کی بیٹیوں اور بیٹیوں، ہارونؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب مرتبی جیسی ایک بدکار آدمی کی

سلہ یہ عہدِ قیامت کے اُن درسون کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوطؑ حضرت داؤدؑ

وغیر یہاں کی طرف زنا اور دیگر افعالِ قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے۔ ۱۳۔

خراب ہوتی ہے۔ وہ تمام دنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو وائٹ انجس کر کے کالے پانی پھینچتے ہیں یا ان کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پہنچا دی جس کے وہ مستحق تھے۔

## چوتھا حصہ

پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصہ میں ان ناندوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو مہینچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کس مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں عیسائی مذہب کی بنیاد اس نیک اور حلیم شخص یعنی حضرت یحییٰ مہدیؑ سے ہے جو خدا کے رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دار و مدار اس عجیب شخص پر ہے جس کو انھوں نے آنا بزرگ اور مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰؑ پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت متعلّق ارادہ اور نڈرول اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرفدار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علامہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی یا پشٹ (یعنی حضرت یحییٰؑ) بلاشبہ تھے مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ بے شک عسائید اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے پس کونسا مذہب اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں

اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے۔

”و جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہو گئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اس لازوال سیح کے بھی متناقض تھا اور ان خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اسی نے خدا نے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت نے کی تھی اسلام ہمیشہ اس زمانے کے عیسائیوں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے۔ اسلام نے عیسائیوں سے اسی پتے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت سیح نے کیا تھا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے ”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَاتٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا“ بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی میں کھل گئیں اور اس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور انھوں نے پھر اسی رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے ان کو حاصل تھا۔ یعنی انھوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہ لا شریک لہ اور عیسیٰ سیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیورسٹی یعنی موحدین اسے معزز ہے۔“

اگر یہ عقیدہ ٹھوڑی دیر کے لیے دنیا سے اٹھایا جائے تو سٹرگین کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ ”اگر سینیٹ

پیشیا سینٹ پال پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس وقت کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسے پُر اسرار رسومات کے ساتھ اُس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ اس کثرت یا جنیوا میں جا کر اُن کو چنناں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جا کر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول مفسروں نے اُن کی تخریقات اور اُن کے لکے بیٹھے ایسے کلمات کی تفسیر کی ہے اُس پر غور کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "جو فائدہ اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچانے اُن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات نا جائز سے سمات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا اختیار ناسب سمجھتے تھے اور اس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ اُن کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعزاز اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کو بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس نا جائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ حقیقت پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اس کو حاصل تھے اور جن کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا

۱۲۔ سینٹ پیشیا یعنی پطرس حواری اور سینٹ پال یعنی پولوس مقدس ۱۲۔

۱۲۔ صادق القول کا لفظ مسٹر گین نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد تخریب کرنے والے مفسر ہیں ۱۲۔

ہوتی ہیں ان کو بتلایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور ان کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لیے سچ کی جستجو کریں چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا:

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَنَالُوا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا نَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“ اور پھر دوسری جگہ فرمایا ”اتَّخِذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُحَبَاءَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحِ ابْنِ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا أَلَّا لِلَّهِ أَكْثَرُ مَجَادًا عَمَّا يُشْرِكُونَ“

”جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم جو اس وقت عیسائی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان کے گلے میں سونے کی صلیب پھیری ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک۔ چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ پاس آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے ”اتَّخِذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُحَبَاءَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ“ جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ہم تو ان کی پرستش نہیں کرتے، آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر تم بھی اس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھہرانے ہیں وہ اس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اس کو حلال سمجھتے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس یہی ان کا پوجنا ہے۔

”ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھتے رہے اور اس کے برابر ایک مسئلہ سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں کے کچھ تھوڑی بہت غم سے اُسے دیکھا اور کالون اور لو تھو

مقدس کے دل پر اس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ ان دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرے خدا یا چھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے ان کے دل پر اثر کیا اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور علانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور ان کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جس کی بدولت ہم کروڑوں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم صورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

بچوں کہ درحقیقت تو تمہرے مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لیے اس کے مخالف علانیہ اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کوارٹر لی ریویو نمبر ۲۵۲ میں لکھا ہے کہ جینی براہ ڈونے پوپ کی طرف سے جرمنی کے ریفا رمروں اور خصوصاً نوٹھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور نوٹھر کے عقیدے میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کامیلاًں جو بت پرستی کے برخلاف ہے اس پر غور کرو۔ مارٹینس القانس



اور والدئس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثبوت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتن بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد یعنی پیران لوتھر کرتے ہیں :

تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پر ڈسٹنٹ یا ریفرمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلاموں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی، آزاد کر دیا ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہلاکت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی، جو درحقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی پہچانی مسئلہ یقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اس نبی آخر الزمان صلعم پر یقین کرنے میں نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے :

## پانچواں خطبہ

پانچویں خطبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث کتب سیرت تفسیر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آئندہ زمانہ میں کچھ لکھنا چاہیں ان کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ ان مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلطی میں پڑے

ہیں گمراہ نہ ہوں اور اُن کی رہبری کے لیے ایک سیدھا راستہ بن جائے۔

## چھٹا خطبہ

چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے یہ خطبہ کسی نذر طولانی ہے اس لیے صرف اُس کی سرخیاں کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس میں اول نزول کی اصلیت اور یہ کہ اُن کے رواج کی ابتدا کی پرتکر ہوئی اور خیر یہ کہ دین اسلام صرف انھیں صحیح روایتوں میں منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دنیوی امور سے، بیان کیا ہے پھر چھوٹی روایت کرنے کا اقتناع اور اس کی سزا جو اسلام میں مقرر ہے، درجات احادیث بلحاظ ثقت ہونے روات کے راولوں کا درجہ اعتبار بلحاظ تفتقہ کے، یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو دی، اختلاف روایت کے اسباب احادیث موضوعہ کا بیان، یہ تمام باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں اس کے بعد سردیہ میو نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور باقی اسلام پر اعتراضات وارد کیے ہیں اُن اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے اُجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف بشرطیکہ اُس نے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

## ساتواں خطبہ

ساتویں خطبہ میں اول قرآن مجید، اُس کا نزول، اس کی سورتوں اور آیتوں

کی ترتیب اس کی مختلف قراءتیں، آیات ناسخ و منسوخ کی بحث، اس کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی نقلوں کی اشاعت اور اس کا کمال اور الہامی ہونا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد سردلیم میسور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انھوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشا وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "مسلمان باؤشاہوں یا عالموں کو نوحہ دانے تو یقین نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شایع کرتے اور پ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیے۔ ابتدا میں جس طرح پرندرجیہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری گنٹز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر عیرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شایع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل اپنی محتمل المعنیوں، متین اور شانستہ معنی سے ذلیل اور غیر مذہب معنی میں بدل دیا جاتا اور برآیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پھانے کا ذریعہ بنایا جاتا، ایک بے فائدہ اور حجاب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی، تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بتدہد سکتا جس کی وساطت سے یورپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی"۔

اس کے بعد سرسید نے سردلیم میسور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انھوں نے غلط نہیں سے قرآن وارد کیے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

## آٹھواں خطبہ

آٹھواں خطبہ خانہ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات

پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب  
 لائف آف محمد میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقیناً جس کا ذکر نور بیت  
 میں جا بجا آیا ہے اہل عرب کا اُس کی اولاد میں ہونا، حضرت اسمعیلؑ کا مکہ کے  
 قریب آباد ہونا، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کی تمام مراسم کا ابراہیمؑ و اسمعیلؑ سے  
 تعلق ہونا، یہ سب بناوٹ اور نسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مورخانہ  
 احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ”حجر  
 اسود کو پوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منامیں رسمیات  
 کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو  
 حضرت ابراہیمؑ سے یا ان خیالات و اصول سے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے  
 پہنچے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام  
 تھیں، یا ان کو بت پرستی کے ان اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں  
 جاری تھے تعلق تھا۔ اس دعوے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے  
 جو آگے چل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اسمعیلؑ ہونے سے انکار کیا  
 ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شبہات وارد کیے ہیں ان کے لیے ایک  
 وجہ ہاتھ آئے۔

مرسید نے اس خطبہ میں صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ  
 تر یورپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت  
 اسمعیلؑ اور ان کی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا ثابت کیا ہے اور اس  
 کے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے  
 کہ حجر اسود اور قرمانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرت  
 ابراہیمؑ اور ان کی اولاد سے تعلق ہے۔ انھوں نے توریت کے بہت سے

حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد یعنی حضرت اسحق و یعقوب اور حضرت موسیٰ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر مثل حجر اسود کے گھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اس کو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانہ کعبہ اور اس کے قرب و حوا میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ کعبہ اور حجر اسود کی نسبت کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ”حجر اسود ہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیم اسحق، یعقوب اور موسیٰ بناتے تھے۔ یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے، یعقوب نے اس پر تیل ڈالا جو اس زمانے کے دستور کے موافق غایت الغایۃ تعظیم پرستش کے قریب تھی یعقوب نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر منگی نہ ہو جائے۔ پس اب کو نسا و تیفہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیم میں جاری نہ تھا جس پر سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو بنی ابراہیم کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں“

”ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا، جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیم کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ جس نے بتقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا۔ اور وہ کون تھا (یعنی واوود ۴) جس نے خرمنگاہ ارنان ہوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر و گھڑی و

لوہا و پتیل اس کے بنانے کو جمع کیا۔ اور وہ کون تھا یعنی سلیمان جس نے بعد  
کو خرمنگاہ ارناب بیوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور  
بیت المقدس نام ملا۔ پس کعبہ کی بنا کو اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ  
کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بنانا نہایت تعجب  
کی بات ہے۔

اس کے بعد عرفات کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ عرفات جس کو سر ولیم میور  
بت پرستوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ایک ایسی چیز ہے جو خاص  
ابراہیمؑ اور اس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے، شراروں جگہ تو بیت میں آیا ہے  
کہ خدا ابراہیمؑ کو مرثی ہوا، خدا اسحاق کو مرثی ہوا، خدا یعقوب کو مرثی ہوا، خدا  
موسیٰ کو مرثی ہوا، بس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں جس پہاڑ پر جو  
قریب مکہ کے ہے، خدا ابراہیمؑ، واسعیل کو مرثی ہوا، اس پہاڑ کا نام جبل  
عرفات ہے۔ معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے جبل عرفات کو کیا سمجھا جو اس  
کی نسبت کہا کہ اس کو ابراہیمؑ رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔  
عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی  
مناسبت نہیں رکھتی، عرفات کا استعمال بحر خاندان ابراہیمؑ کے دنیا کے  
او کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا، یہی وہ مقام ہے جہاں صرف حاضر ہونے  
کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے پہاڑ تلے کا میدان ہے، اس میں لوگ  
جمع ہوتے ہیں اور خدا کو یاد کرتے ہیں، وہاں خطیہ پڑھا جاتا ہے جس میں  
تقریب ہوتی ہے اور خدا کے حکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اسی  
نرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلبیہ میں سنائے تھے، پس غور کرنا  
چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ سے۔



اس کے بعد منا کی نسبت کہتے ہیں کہ "منا کا مقام صرف قربانی کے لیے ہے، وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی، تمام تو ریت قربانی کی رسم سے بھری پڑھی ہے۔ جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مدینہ کے نام سے پکارا جاتا تھا منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے۔ اس لیے قربانی تدر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیم و یعقوبؑ اپنی اولاد اور داؤد و سلیمان کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اُس قربانی میں جانور کو مار کر اُس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اُس کی نوٹلو یعنی چیرا نہ پسند آتی تھی اور اسلام میں وہ قربانی غربت و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں۔ اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اُس پہلی قربانی سے اس پھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہو گا۔

یہ خطبہ بہت لمبا ہے، اس کی اصل خوبی بغیر اس کے کہ اُس کو اول سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ کی تاریخ محققانہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

## نواں خطبہ

نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبہ کے لکھنے کا یہ منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی اسمعیل ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک

جگہ لکھتے ہیں کہ " غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ) اسمعیل کے نسل سے ثابت کیے جائیں ان کی حین حیات میں پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمعیل اور بنی اسرائیل کے لیے شمار تھے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے " سر ولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب سیر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمعیل تک جتنی پشتیں اہل سیر نے لکھی ہیں ان میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر اس خطبہ کے اول میں مر سید نے ایک نہایت عمد تمہید لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ " زائدہ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں ان میں ہمیشہ تھیں، ایک شاعری، دوسرے علم الانساب جو چونکہ ان کے ہاں کتاب کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اس لیے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں تا بقدر اوسانہ بر یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتاب کے کسی قبیلے کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لیے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے لیکن باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے اور کچھ پھول جاتے تھے مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں

اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو سنجوٹی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں یہ ترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں جو نامورا اور قابل فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے۔ اسی لیے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مورخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا ان کو ایسی دقتیں پیش آئیں جن کا حل کو نامہت دشوار تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری شکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں بہتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے۔ شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اس کا نام لے دیتے تھے جیسا کہ ابن خلیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ "نسب نامہ عیسیٰ مسیح بن داؤد ابن ابراہیم" حالانکہ مسیح سے داؤد اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں مگر چونکہ داؤد اور ابراہیم منہایت مشہور اشخاص تھے اس لیے مسیح کو داؤد کا اور داؤد کو ابراہیم کا بیٹا بتا دیا۔

”عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کسی نامہ بیان کرتے وقت جب آبا و اجداد کے نام ان کی یاد کے موافق ختم ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے۔ ان اسباب سے مورخوں کو ان کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ سلسلہ وار کہنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں، آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلۃ قریش سے اور قریش کو معد ابن عدنان کی اولاد میں اور عدنان کو قبیلۃ بن اسمعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدس اُن کا جانتا آپ کے بنی اسمعیل ہونے کے لیے کافی تھا، گو کہ درمیان میں کئی ہی پشتیں گزری ہوں، اسی لیے کوئی صحیح روایت آپ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ آپ نے فرمایا ”ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں۔“

”پس جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو ان میں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا، آنحضرت سے لے کر معد ابن عدنان تک کسی مورخ کا اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ معد بن عدنان سے اسمعیل تک کی پشتوں میں ہے، صرف پانچ شخص ہیں جن کے کچھ ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔“

اس کے بعد سرسید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے، کیوں کہ اُن میں قطع نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیم کے درمیان گورا ہے وہ نو یا دس یا گیارہ پشتوں سے (یعنی فی صدی تین پشتوں کے) اس قدر قاعدے کے موافق پورا نہیں ہوتا، اب دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک برنیا کاتب الوحی اور سیانی کا، دوسرا الجرا کا، اریانی جیبا کہ بائبل سے ثابت ہے جو معد ابن عدنان کے زمانے میں تھے اور نخت نصر کے ہنگامہ میں انھوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے

تھے۔ یہ قومی قرینہ اس بات کا ہے کہ اُن کو معد کا نسب نامہ اسمعیل ابن ابراہیم تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقعی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں اُن کو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرت سے ابراہیم تک ہی پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجبرائے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت حد تک سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تمہ ہے کیوں کہ اُس کو تمہ فرعون کہنے کی صورت میں آنحضرت صلعم سے اسمعیل تک ستر پشتیں ہوتی ہیں جو کافی صدیقین پشت کے مسلمہ قاعد سے کے موافق اُس زمانہ پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں جو اسمعیل کی ولادت اور آنحضرت کی ولادت کے درمیان گزرا ہے یعنی دو ہزار چلہ سو پچتر برس کا زمانہ۔

سر ولیم میور بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے ”اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ ”بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قرینہ رکھتے تھے۔ وہ اسمعیل کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل سختی کی وہ اُن پر صحر جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل ہیں یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی اُس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصاً اُس وجہ کہ آنحضرت نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی“

”پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ کھنے کا خیال ہو تو ہیں

کا کبھی مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلاشبہ انھوں نے اپنے بنی اسرائیل بھائیوں سے جو کچھ پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُن کے ہاں رواج تھا، مدولیؒ

اس کے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ”نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں ایسے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور انرا راہ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں۔ گو یادہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرا یا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اسی طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے ہم نہایت خوشی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو شاہد بہتان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اُس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے پتے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسماعیل و موسیٰ و عیسیٰؑ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ ”قل یا اہل کتاب اتلوا الی کلمۃ سوا بیننا و بینکم ان لا تعبدوا الا اللہ۔“ ہم مسلمانوں کا یہی فخر ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے اُن تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا مانا اور اُن کی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔“



اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا یہودہ گنہگار عیسائیوں نے کی ہے: خدا کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا تھا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک بنی پیدا کروں گا، کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسماعیل کی نسلیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اسماعیل تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ وہ کسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برجیا کی تحریروں سے لیں، وہ اسماعیل کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پورا ہوا تمام عرب اور یہود اور عرب کے قریب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ عرب کے، بننے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم، قریش، اسماعیل، ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ابراہیم جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرات ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کہے؟"

اس کے بعد ابوالخدا مسلمان مورخ اور مشہور گین لوہور یوٹھ فاسٹر عیسائی مورخوں کی شہاد میں نقل کی ہیں جن میں سے گین کا قول یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہتے عیسائیوں کا ایک اجتماع تھا، ایسا افترا کرنے سے بچانے اس کے کہ اُس سے مخالفت کی ہو یہیوں کہ گھٹانیں ان کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں۔ اسماعیل سے ان کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کسی نامہ

کی پہلی نسلیں سنجوی معلوم نہ ہوں اور امہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف و نجیب ہیں، وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے سرور و ثنی محافظ تھے۔ یہی رائے مسلمان مورخ یعنی ابوالفدا کی ہے اور یہی گواہی ریلورنڈ مسٹر فاسٹرنے دی ہے۔ اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ”اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور چونکہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اسی آفتاب عالمتاب کے ذرہ میں سے ہوں اس لیے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرور و دو جہاں سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرور عالم میں ہے اور جس کے سبب لَحْمُكَ لَحْمِي وَكَمَلِكَ دَمِي ہمارا سرور و ثنی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے مغرور ہو جائے۔

گرچہ شردیم نسبتے ست بزرگ ذرہ آفتاب تا بائیم “

## دسواں خطبہ

دسواں خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو تورات اور انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں اس خطبہ میں اول سرسید نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ تورات و انجیل میں آپ کی نبوت کی خبریں دی گئی ہیں اس کے بعد انھوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب آیتے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیاء سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور اس لیے انھوں نے تورات و انجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور سحریہ کا عذر

پیش کر کے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جا بجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے۔ پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنہوں نے نہایت کوشش اور استعلا سے اُن کی تفتیش کی اور قوریت و انجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کیے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ ان کی نشان دہی ہوئی بشارتیں جو مہاری مذہبی کتابوں اور تفسیروں اور سیر و تواریخ میں مذکور ہیں اُن کی بابت کچھ بتا نہیں دیا گیا وہ بائبل کی کونسی کتاب اور کون سے باب اور کون سے ورسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں کثرت سے اختلاف عبارت تھا اور جن کے جدا جدا نام تھے اُن میں سے کون سے نسخے وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ بتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں اب مفقود ہیں یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں اُن میں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلمہ کتابوں میں سے، اس لیے سرسید نے صرف چند بشارتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ مسلمہ مجموعہ عہد عتیق و عہد جدید میں موجود ہیں جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے وہ طریقہ جس طریقہ سے کہ بائبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور کہا ہے کہ اُن کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہلی یا دوسری کا بیان ہوتا ہے جب تک کہ

نہ ان میں سے اکثر بشارتیں سرسید سے پہلے ہمارے زمانہ کے بعض علمائے مسلمہ مجموعہ بائبل سے بحوالہ باب اور دہا کے نقل کی ہیں مگر جس عہدگی سے ساتھ خطبات میں ان کا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں

اُن کی تشریح نہ کی جائے اور ان کا حل نہ بتایا جائے اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ نہیں آ سکتا۔ اس لیے پہلے اس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں بیان کریں انھوں نے اول بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کے حق میں بتایا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یاہیل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان کی جاتی ہے اور نیز حضرت عیسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کونسی بشارتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دھندلی۔

اس کے بعد انھوں نے چھ بشارتیں عہد عتیق سے اور تین بشارتیں عہد جدید سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بیان کی ہیں۔ از انجملہ عہد عتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک تودیت کتاب استثنایاب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استثنایاب (۳۳) کتاب حقوق نبی باب (۴) میں اور تیسری کتاب تسبیحات سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت۔ یہ چار بشارتیں نہایت معجزہ کما آلا ہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے اُن کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیوں کی ہیں۔ مرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیے اس سے بھی کچھ بڑھ کر تحقیقات کی۔ بڑے بڑے عیسائی محققوں کے احوال اور یاہیل کے حوالوں سے اپنے اسناد لالات کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اُس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسیٰ مسیح کی پیشین گوئیوں کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا عمل باقی نہیں رہا۔

## گیارہویں خطبہ

گیارہویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہے اور اس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں ان کا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اس لیے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہے صرف اسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو روایا پر محمول کیا ہے جس کا ایک جزو شق صدر بھی تھا اور عیاشیوں کی طعن کا جواب الترامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔ یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اس لیے ان دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھا جاوے۔

## بارہواں خطبہ

بارہویں خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو پیشمار رطب و یابس روایتیں اہل سیر نے اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رو سے سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جا بجا تعریفیں کی ہیں ان کی تصنیف کی ہے اور اگر جگہ بر تقدیر ان کی سمت کے نہایت لطیف جواب سر ولیم میور کی تحریرات کے دینے ہیں۔ مثلاً سر ولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریفاً بیان کیے ہیں جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اٹا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھی میں کاٹ کھانا، مدینہ سے حدیبیہ کو جانے وقت اپنی ماں کی قبر پر پرونا۔ اس پر سر سید لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، انھوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ ”إِنَّمَا آتَانَا بِشَوْءٍ شَكَّرْتُمُوهُ لِيُحْيِيَ الْاَلِيَّ“۔ پس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔“

یامثلًا سرولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ”نرمسانہ سابق کے منہدم اور آجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیال نقصوں اور عجیب و غریب بیانیوں اور ول انگیز روایتوں نے اور بھی پراثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور سورتوں اور وینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غرض کنڈہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پایدار اثر کر دیا تھا۔“

سر سید اول تو سفر شام میں چچا کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ ”ہم نہایت ادب سے سرولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سرولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص



خوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے! اگرچہ یہ بیان سرولیم کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور سورتوں اور علامات دین عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا، بعد کو انھیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی۔ صلیب کو توڑا۔ سورتوں کو پھوٹا، ان کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں، تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہ لا شریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔

”لیکن اس بات کو تسلیم کر کے درحقیقت مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا، صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذرتی تھی پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں، صلیبوں، سورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے، ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے ان کے برعکاس اے کامل نتائج اور معبود وغیرہ حاضر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا وہ بلاشبہ مادرِ نادر پیغمبرِ برحق تھا جس کی فطرت وہ اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ نے یہ کہہ کر تیسرت دی ہے کہ ”بیچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضرور ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مجتبیٰ تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو اُس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔“

اس خطبہ میں بتقادیر سرولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جن کو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہیے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطبات احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں سے چلے دو چلے پانی سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا گیا ہے اس کی کیفیت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی خصوصاً اردو خطبات جو سرسید نے ولایت سے آکر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں یہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے اس سے مصنف کی محنت، لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سرسید کے ارادے کے موافق پوری نہ ہو سکی۔ ان کا ارادہ سرولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فیکس مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں باسائل بیسرا سکتی تھیں ان کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا، وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر جو مباحث سرولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے ان میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی بڑا جمالی جواب اسی ایک جلد میں آ گیا ہے کیونکہ جس اصول پر سرولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطبات احمدیہ میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جتا دیا گیا ہے کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اس وقت تک وارد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قرآن یا ان حدیثوں کی سند پر جو اصول علم حدیث

کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں۔ بنی نہ ہو اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات  
 ایک قلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہیہ یا اقوال علما  
 و آراء مفسرین کی رو سے مذہب اسلام پر ایسا دیکھے جاتے ہیں۔

جس وقت سرسید نے خطبات احمدیہ لکھی ہے اُس وقت تک مذہبی  
 تحقیقات کے متعلق ان میں وہ آزاد پیغامیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں  
 دیکھی جاتی ہے اور اس لیے خطبات احمدیہ میں کوئی اتنا ایسی نہیں پائی جاتی  
 جس کو اسلام کے اصول اسلام متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے۔ البتہ وہ ایک  
 جگہ کسی قدر انھوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علامہ محققین نے  
 صد ہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو، جیسا کہ بعض  
 صحابہ کا مذہب ہے، ردیا پر محمول کیا ہے اور شتی صدر اور براق کی سواری کو اسی  
 رو یا میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان  
 کی ہے۔ لیکن اس سے اصول کی مخالفت لازم نہیں آتی تعجب ہے کہ  
 سرولیم میور نے جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہے جس وقت خطبات  
 احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض  
 نہیں کیے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کیے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے  
 چلے آئے ہیں۔ یہ بعینہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو  
 نہتا سمجھ کر اس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب اوصر سے بھی خلاف  
 توقع تیر آئے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ بہتوں سے ہے تیر اندازوں سے  
 نہیں ہے۔ سرولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک شطریقہ سے  
 ملکتہ چینی کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں  
 سے بہت کم سنے تھے اس لیے سرولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان

میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات انہوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کیے تھے۔ اسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کیے گئے ہیں جس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ ان کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتاً سمجھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔

## خطبات پر اخبار انیکوائزر کی رائے

انگلستان کے اخبار "انیکوائزر" مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۶۲ء میں جبکہ سرسید کو ولایت سے ہندوستان میں آنے پر دو برس گزر چکے تھے، کسی آٹا و خبثت والے انگریز نے خطبات احمدیہ پر ایک مفصل ریویو چھپوایا تھا، اُس کے سپرد دلچسپ فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "ہمیں اس کتاب کے مضامین کو خوشی سے دینا چاہیے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کم از کم پہلے پہل ہیں اُس مبادلہ خیالات اور فیملنگز کے جو مشرق اور مغرب میں اُن مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں جو باوجود اختلاف کے ایک نوع کا اتحاد بھی رکھتے ہیں، ہوتا چلا ہے گویا ہم پہلے ہی سے یہ نہیں کہہ سکے کہ یہ خیالات کا مبادلہ زمانہ آئندہ میں کہاں تک جاری رہے گا یا اس سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے، لیکن بہر حال ہم سید احمد کو جو اپنے ملک میں رفاہ عام کے سرگرم کار گزار اور اپنے مذہب کی اڑھ کر حمایت کرنے والے ہیں، نوکرم کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی مذہبی تخریریں بہتر سلسلے میں پیش کی ہیں۔ مسلمان کو بلاشبہ اس بات کا حق ہے کہ انجیل کی تفسیر کے متعلق جو کچھ وہ کہیں اُس کی سماعت کی جائے خصوصاً اُس وجہ سے

کہ شاید وہ روایات کے نئے ذریعے ہم پر ظاہر کریں، سائنٹفک مذہب کا فرض ہے کہ وہ کسی شہادت کے غننے سے جو اس کو مل سکے انکار کرے، مگر مصنف کو اس سے زیادہ ہم سے توقع رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم اُس کے خیالات سے ایک حد تک اتفاق کریں گے۔

اس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جیسے شخص کے کیریکٹر معلوم کرنے کے لیے ایک ایسی سائیکولوجی کا جو تاریخ کے ذریعے سے منکشف ہوئی ہے ایک شخص دشوار اور دقیق مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے۔ میور اور اسپرنگر نے زماثہ حال کی نکتہ چینی کا طریقہ جس کو تشریح عیسائی اپنے مذہب کی نسبت، ناپسند کرتے ہیں، اسلام کی اصل اور اس کی ترقی کے حالات دریافت کرنے میں برتا ہے اور بار تھیلی سینٹ ہیر نے ہمارے سامنے ایک مفصل تاریخی تصویر پیش کی ہے۔ ہم عام طور پر یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف اور عزت دل میں رکھنی سیکھ لی ہے، لیکن ہم میں ایسے کم ہیں جو کبھی قرآن کو پڑھتے ہوں، مہانتیک کہ سبیل نے جو ابتدائی بحث اس کتاب یعنی قرآن، کی نسبت کی ہے اُس کو بھی نہیں پڑھتے اور اُن سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اسلام کو کیا بلحاظ ملکی اور کیا بلحاظ مذہبی قوت کے ایک ایسی زندہ طاقت سمجھے ہوئے ہیں جو اپنی موجودہ یا کسی تبدیل شدہ حالت میں آنے والی صدیوں میں حکمراں طاقتوں میں سے ایک طاقت شمار ہوگی۔“

۱۔ یہ اٹاردہ ہے خطبات احمدیہ کے ان سیات کی طرف جہاں سرسید نے کہیں عیسائی مفسرین کی سند سے اور کہیں اور دلائل سے انہیں کے معنی جمہور عیسائیوں کے برخلاف بیان کیے ہیں ۱۲

سرسید نے جس خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بائبل کی پیشین گوئیاں بیان کی ہیں اس کے متعلق فاران اور فار قلیط کی پیشین گوئی کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "سید احمد بار بار اس بات پر اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے دلائل اسی درجہ کے ہیں جیسے کہ عیسائی عموماً استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ ہم کو اپنے دلائل کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ عیسائیوں کی طرح صرف عمدہ ہی نہیں بلکہ عمدہ ترین دلیلیں ہمارے سامنے پیش کریں۔ انہوں نے اپنے دشمنوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ خیالی کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب ہی ان پر حملہ کر رہا ہے حالانکہ اُس کے ساتھ ہی آج کل کی نکتہ چینی کا طریقہ اُن کے مذہب کے ساتھ بھی ویسا ہی بڑا ٹوک رہا ہے جیسا کہ وہ اور مذہبوں کے ساتھ جن میں کرید کرنی اُس کو منظور ہوتی ہے، کرتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سید احمد میور اور اسپرنگر جیسے لوگوں کے مقابلہ میں اپنی جگہ پر قائم رہنا بخوبی جانتے ہیں۔"

اس کے بعد چوتھے خطبے کے اُس مدلل بیان پر جو سرسید نے تعدد ازدواج کی بحث میں لکھا ہے کتاب ہے کہ "فی الواقع یہ مضمون مصنف کو بہت عزت دیتا ہے کہ وہ یہ بابت ثابت کرنے کے لیے کہ پوچھ لگی (یعنی تعدد ازدواج) مضر نہیں ہے۔ اپنے اوٹ کو سوئی کے ناکے سے نکال لے گیا ہے۔ گو اس نے اس کی جرات نہیں کی کہ اُس کو حقیقی فائدہ میں سے شمار کرتا۔ بہر حال ایسے مضمون پر اگر ہم کو سید احمد سے اتفاق بھی ہو تو ہم اُس کو ظاہر نہ کریں گے کیونکہ ہم کیا

لے چو کہ بلوچستان ایک آزاد خیال آدمی ہے اس لیے وہ جس طرح عیسائیوں کی پیشین گوئیوں کو تسلیم نہیں کرنا اس طرح مسلمانوں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانتا اور ثباتِ غرور کے لیے ایسی دلیلوں کی ہانی نہیں سمجھتا۔



موتح پر ایک خوشگوار سکوت ہے کونزجیح دینی چاہیے : پھر اسی خطبے کے متعلق اس بیان پر جس میں سرسید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لیے رحمت تھا کہتا ہے کہ ”ہم دیکھتے ہیں کہ ہیت اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونیٹین یہ دونوں مذہب ان فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے کر سچینٹی یعنی عیسائی مذہب کو عطا کیے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر شکرت گزار ہوں گی ان فوائد میں سے ہر ایک فائدہ کے لیے اور سب فائدوں کے لیے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ فوائد شکل سے کافی بیان ہیں اس زبردست تحریک کا جو یہ سب میں اندس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی اور جو فن تعبیر، شاعری معاشرت اور آداب سب پر حاوی ہے۔

اس کے بعد نوبت خطبہ کے متعلق جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبتاً نامہ بیان کیا گیا ہے اور سرسید کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ ”عذنان تک جو کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ میں آتا لیساں ہے، مطلقاً عربی روایات سے لیا گیا ہے اور عذنان سے اوپر یہود کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔ ہم کہ بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے عیسائی مصنفوں نے اپنا وقت ضائع کیا اور بے فائدہ داغ صرف کیا اس بے فائدہ تلاش میں کہ اسلام اور یہودی مذہب میں تعلق ہے، حالانکہ کسی مسلمان نے اس سے انکار کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔ عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے طنز کے ساتھ ہم کو الزام لگایا کہ تم نے یہ چیز یہودیوں سے لی اور وہ چیز

۱۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے خوف سے پناہ میں نہ پناہ میں چاہتا

درد سرسید کے استدلال کو وہ ول میں مان گیا ہے۔ ۱۳۰

ان کے باں سے چُرانی۔ گویا اسلام کوئی بنیاد نہیں رکھتا جس پر وہ قائم ہو بلکہ بالکل عیسوی اور یہودی دین پر منحصر ہے۔ ہم مسلمانوں کو دونوں الہامی مذاہبوں سے انکار کرنا تو کیسا ہم تو اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتے ہیں کہ "ہم سچے اور ایماندار ہیرو میں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے" اس پر ریویو یونگسار لکھتا ہے کہ "اخیر کے جملے کو ہم نے متنازعہ حروفوں میں لکھا ہے کیونکہ وہ توجہ کے قابل ہے اور اس قابل ہے کہ یوں رکھا جیسے ہم کو یقین ہے کہ اس جملہ کے الفاظ ایسے ہیں جو کم سے کم اسلام کی اصولی تعلیم پر مبنی ہیں اور اس میں شک ہی نہیں کہ وہ مصنف کے نزدیک مسلم ہیں۔ یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کتھولسٹی کے سچے اصول کی مہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذاہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہو گا شاید ہم سید احمد کو بغیر ناراض کیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کبھی یا عربی کیتھولک ہے۔ بہر حال انھوں نے لٹریچر کا مرہ میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے۔ اور ان کے مضامین کو وہ لوگ توجہ سے پڑھیں گے جن کو اس سبکیٹ میں دلچسپی حاصل ہو چکی ہے اور جو اس میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی تلاش میں ہیں۔"

## جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سر سید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد ایبٹ"

لے کتھولسٹی ایک نقطہ مشترک بہت سے معنوں میں، آتا ہے جن میں سے ایک معنی مذہبی مزاح جو منگی یا بے تعصبی اور ناظرنداری کے ہیں۔

قرآن کو جو انھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی خود اپنے روپیہ سے چھپوایا۔ سرسید نے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پابشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے اس کو چھپوا کر شایع کر دے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اس کتاب کے مضامین سنے تو انھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپیہ کی تدبیر کر کے وہ کتاب چھٹ پٹ چھپوادی اور اس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوا دیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔

## گاڈ فری ہگنٹر کی کتاب کا ترجمہ کرنا

انگلستان کے ایک اور ذی وقعت مصنف گاڈ فری ہگنٹر کی کتاب جو کسی زمانے میں مصنف مذکور نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی ایک جرمن کتاب فروش کی مشہور دکان سے جہاں ہر زبان کی پرانی اور نایاب کتابیں بکتی ہیں، سرسید نے اس گمن قیمت میں لندن میں خریدی۔ اس مطلب اس کے خریدنے سے یہ تھا کہ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں اس سے مدد لی جائے مگر انھوں نے ہندوستان میں آ کر ان لوگوں کے لیے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اس کا اردو ترجمہ بھی جو حمایت الاسلام کے نام سے مشہور ہے شایع کر دیا۔

## رسالہ الطالِ عِلامی

اگرچہ یہ مضمون بقدر ضرورت خطبات احمدیہ میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول تہذیب الاخلاق کے متعدد پیرچوں میں شائع کیا اور پھر اس کو علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ ہمارے علما جنہوں نے ان اعتراضوں اور طعنوں سے کان بند کر رکھے ہیں جو یورپ کی قومیں اسلام اور اہل اسلام پر کرتی ہیں ان کو آج تک یہ بھی احساس نہیں کہ بروہ فریضی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے اس میں کیا بُرائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق صحیح ہے یا نہیں؟ ان کے نزدیک محبت اسلامی اسی کا نام ہے کہ جو شخص اسلام پر اعتراض کرے اگر قدرت ہو تو اس کا منہ بند کر دیں ورنہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مطاعن کتابوں اور اخباروں میں دن رات دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور جن کو معلوم ہے کہ یہ مطاعن مسلمانوں کی نشی پود پر جو دنیا کے حالات سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتی جاتی ہے، کیا اثر کرتے ہیں جوہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر معتزضین کی غلط فہمیوں کو اس وقت دفع نہ جائے تو ہماری نسلیں جو ہمارے بعد اسلام کی وارث ہونے والی ہیں، وہ اسلام کو کس نگاہ سے دیکھیں گی اور تمام عیسائی قوموں میں اور خاص کر انگریزوں کی قوم میں جو ہندوستان کے مسلمانوں پر حکمران ہیں، مذہب اسلام کس نظر سے دیکھا جائے گا۔

انہیں مطاعن میں سے ایک طعن جو ابراہیم استر قاق یعنی لوڈری غلام بنانے کا ہے جو عیسائی قوم میں مذہب اسلام پر اس لیے کرتی ہیں کہ نصف صدی

سے مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی تک جو غلاموں کی حالت تدریجاً یورپ اور امریکا یا تھی اُس بے رحمی اور سنگدلی کی سنین اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی چنانچہ فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر لی ان نے جیسا کہ احمد شفیق بک نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے اپنی کتاب تمدن عرب میں اُن بے رحمیوں کا بیان کرنے کے بعد جو عیسائی تو میں غلاموں پر کرتی تھیں۔ صاف اقرار کیا ہے کہ ”حق بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غلامی بالکل اس غلامی کے برعکس ہے جو عیسائی میں جاری تھی“ لیکن اسی بے رحمی کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ نیک دل لوگوں کو غلاموں کی حالت پر رحم آیا اور وہ ان کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ غلامی کا نام و نشان تک یورپ اور امریکا سے مٹا دیا گیا۔

پس اس سے زیادہ اور کیا افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ جو قومیں غلاموں پر ایسی تھیں اور جن کے مذہب میں کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی وہ تو تمام دنیا میں غلامی اور بردہ فروشگی کا انداز کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جن کے مذہب نے تمام دنیا کے مذاہب سے بڑھ کر غلاموں کی حمایت کی اور اگر سچ پوچھیے تو گویا غلامی کو بالکل معدوم کر دیا۔ وہی تمام دنیا میں بردہ فروشگی کے ناجائز و ناشائستہ رواج میں سب سے زیادہ بدام ہیں اور انھیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ نوع انسان کا دشمن اور ظلم و بے رحمی کا سرچشمہ ہے۔ سرستید اپنے ایک آرٹیکل میں جو رسالہ ابدال غلامی کے علاوہ انھوں نے اسی مضمون پر لکھا ہے، لکھتے ہیں: ”ولیم ہیرورسل صاحب جو نہایت نامی گرامی ادیب ہیں اپنے روزنامہ میں اسماعیل پاشا غلامیوں کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”اُس نے اس نیکی کے حاصل کرنے اور رسم بد

کے موقوف کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوا ہے اس کے بعد سرسید کہتے ہیں کہ اگرچہ مسٹر رسل کی کتاب پڑھ کر ہمارا دل خوش ہوا مگر جس نفظ نے ہمارے دل کو رنجیدہ کیا اس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اسمبلی پاشا کے اس نیک کام کی تعریف کہا ہے وہاں یہ بھی لکھا کہ اُس نے برخلاف اپنے مذہب و ایمان کے یہ نیک کام کیا ہے۔ اس تحریر پر ہم کچھ مسٹر رسل سے ناراض نہیں ہوئے۔ انھوں نے ٹھیک لکھا ہے مگر ان کافر مسلمانوں سے ناراض ہوئے جنہوں نے اپنے افعال نامناسبہ کو ایسے طور پر رواج دیا ہے جس کے سبب غیر قومیں ان افعال کو مذہبی اور ایمانی افعال سمجھتی ہیں اور مذہب اسلام کو خفرت سے دکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ تمہذیب اور شائستگی اور انسانیت مذہب اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ مسلمان سلطنتوں میں سلطان عبدالحمید شاہ اور اسماعیل پاشا حدیو مصر کے وقت سے بردہ فروشی کا انسداد محض بطور مصلحت ملکی کے ہونے لگا مگر ۱۸۸۸ء تک وہاں بھی کسی مسلمان عالم کو یہ خیال نہیں آیا کہ عیسائی، جو بردہ فروشی کے نالائق طریقہ کو دین اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے۔ حالانکہ ترکی، مصر اور افریقہ کے دیگر ممالک اسلامیہ کے علما کا سب سے مقدم فرض تھا کہ وہ اسلام پر سے اس الزام کو رفع کرتے، کیونکہ دنیا میں کوئی مرکز بردہ فروشی کا اب وسط افریقہ کے سوا باقی نہیں رہا۔ جہاں ایک مدت سے سلاطین یورپ انسداد بردہ فروشی کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور عیسائی مشنری تمام یورپ اور افریقہ میں سادسی کھرتے پھرتے ہیں کہ مظلوم حبشیوں کو اسلام کے پختہ ظلم سے بھاگو۔



بارے ۱۸۸۸ء میں یعنی سرسید کی تصنیف سے انہیں برس بعد مصر کے ایک رفیق منیر فاضل احمد شفیق کہے کہ جس نے فرانس میں تعلیم پائی ہے، یہ خیال اس وقت پیدا ہوا جبکہ کارڈنل لافچیری پیرس کے ایک چرچ میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ بردہ فرودشی کے مظالم پر لکچر دے رہا تھا اور اس کا الزام صرف مسلمانوں ہی کے اعمال و افعال پر نہیں بلکہ مذہب اسلام پر لگاتا تھا کہ وہ علانیہ اس رسم بد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بعد احمد شفیق نے دیکھا کہ وہ لکچر یورپ میں عام طور پر شایع ہو گیا، اس لیے انہوں نے ایک رسالہ فرانسسی زبان میں لکھا جس کا ترجمہ احمد ذکی افندی نے عربی میں کیا ہے۔

اس رسالہ کی جس قدر شہرت اور وقعت یورپ کی عیسائی قوموں میں اور مصر و ترکی کے مسلمانوں میں ہوئی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون جس کو اب سائنس پرسیں پہلے سرسید لکھ چکے تھے اور جس کا صلہ ان کو یہ ملا تھا کہ بجائے عیسائیوں کے خود مسلمانوں نے اس کے رد لکھے، کس قدر ضروری تھا۔ مصر کے اسلامی اخبار الموند مورخہ ۲ ستمبر ۱۸۹۱ء میں اس کی نسبت لکھا گیا تھا کہ "اسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوئی چنانچہ کبر و فضلائے اہل اسلام نے جو ایسے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں، احمد ذکی افندی سے نہایت التجا کے ساتھ اس کا ترجمہ فرانسسی زبان سے عربی میں کرایا۔ اس کے سوا فرانس کے مشہور عالم موسیو میسر نے اس رسالہ کو دیکھ کر مصنف کو لکھا کہ تم نے اپنے حریف یعنی کارڈنل لافچیری کو لاجواب کر دیا اور بے شک حق تمہاری جانب ہے۔" اسی طرح فرانس کے آٹھ بڑے بڑے مشاہیر نے رسالہ مذکورہ کی نہایت تعریف اور اس کے لکھنے

پر مبارکباد دکھی خصوصاً موسیو بوجار انسپکٹر کمپنی نہر مولیس نے کھاکہ میں نہایت قدر کرتا ہوں تمہارے اس کام کی جو تم نے اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لیے کیا ہے اور کیا اچھا ہوا اگر فرانس کا ہر فرد اسی طرح اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لیے کھڑا ہو۔ سنم پاشا سفیر سلطانی جو اُس وقت لندن میں تھے انہوں نے رسالہ مذکورہ کی رسید میں نہایت شکریہ کے بعد مصنف کو لکھا کہ "اس رسالہ سے نہایت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے اور میں ان نسخوں کو نہایت خوشی سے انگریزوں میں اور ان اخباروں میں جو انگریزوں کی نظر سے گزرتے ہیں تقسیم کروں گا۔ احمد علی افندی مترجم رسالہ مذکورہ لکھتے ہیں کہ "مہرت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ مضمون تمام یورپ میں مشہور ہو گیا۔ یورپ کے بڑے بڑے اخباروں میں اس پر عمدہ عمدہ ریلوی لکھے گئے اور بعض اخباروں میں یہ رسالہ منجانبہ اول سے آخر تک چھاپ دیا گیا۔"

الغرض اسلام کی اس ضروری اور مہتمم بالشان خدمت کی نسبت غالباً تمام اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سید احمد غلامی کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ غلامی کے باب میں جو تفضیلت اور فوقیت مذہب اسلام کو تمام دنیا کے مذاہب پر ہے اور جو نیکی اور سلوک و احسان اس نے لوڈی غلاموں کے ساتھ کیا ہے اُس کو صاف صاف دنیا پر روشن کریں۔ انہوں نے اول نشہ میں جہاں سرولیم بیور کے اور مطاعن و اعتراضات کے جواب خطبات احمدیہ میں ویسے ہیں انہیں کے ذیل میں غلامی پر بھی بہت شائے

۱۱۔ چونکہ سرسید نے غلامی پر کوئی علیحدہ مضمون لکھا انگریزی میں شاید نہیں کیا تھا بلکہ خطبات کے ضمن میں اس کا ذکر کیا تھا اور خطبات کی بہت کم جلدیں انگریزی میں شایع ہوئی تھیں اس لیے اس کی شہرت یورپ میں نہیں ہوئی جیسی احمد شفیق بک کے رسالہ کی ہوئی ۱۲

بحث کی ہے جس کے بعد عیسائیوں کے مقابلہ میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ تھی مگر چونکہ اس میں ایک دوسرے فقہانے اسلام کے خلاف تھا اور جناب تک اصول شرع کے موافق اس پر استدلال نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہ تھا اس لیے انھوں نے ۱۸۶۲ء میں ایک مستقل اور مبسوط رسالہ اسلام کی غلامی پر لکھ کر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔ اس رسالہ میں اول بطور تمہید کے دلائل عقلیہ غلامی کی برائی پر نہایت عمدگی اور صفائی سے بیان کیے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے موافق ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانتا پسند کرتا ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ **كُلُّكُمْ عَبْدٌ لِلَّهِ وَكُلُّ نَسَائِكُمْ اِمْلَاءُ لِلَّهِ** اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر غلام اچھی طرح رحم اور محبت کے ساتھ رکھے جائیں تو کوئی برائی نہیں اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ غلامی فی نفسہ ایک قدرتی گناہ ہے اور ان کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے اور کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ ”یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اس کی نسبت کہا اس کو کسی نے نہیں سمجھا۔ پھر جس جس طریقہ سے زمانہ جاہلیت میں غلام بنائے جاتے تھے اس کی تفصیل لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ غلامی کی رسم کو جو اس وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں کی طرح جاری تھی اس کا دفعہ موقوف کر دینا صرف مصالح ملکی کے برخلاف ہی نہ تھا بلکہ ایسا کرنا انواع و اقسام کے گناہوں کا مورث ہوتا۔ چنانچہ اب بارہ

۱۔ یعنی تم سب خدا کے غلام ہو اور تمہاری سب صورتیں خدا کی لوث ہاں ہیں۔

سو برس بعد بھی یہ سب کے بڑے بڑے مذہب جنھوں نے غلامی کے معذم کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے کہ آئندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی تدبیریں کیں مگر ان کی تدبیروں میں اور بانی اسلام کی تدبیریں یہ فرق تھا کہ انکی تدبیریں زیادہ ترقی یافتہ چیزوں سے اور بانی اسلام کی تدبیریں زیادہ ترقی یافتہ چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پس اسلام نے جس طرح شراب خوری کو تدریجاً موقوف کیا تھا۔ اسی طرح غلامی کے رفتہ رفتہ مسدود کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اول طرح طرح سے غلاموں کے آزاد کرنے کی سلمانوں کو ترغیب دی۔ یہاں تک کہ بردہ آزاد کرنے کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا بعض گناہوں کے کفارہ میں بردہ آزاد کرنے کا حکم دیا، اور بتایا کہ جو غلام اپنی قیمت اپنی کمائی سے ادا کرنی چاہیں ان سے یہ اقرار نامہ لے کر چھوڑ دو جن سے ان کے مالک اس طرح آزاد کرنے کا وعدہ کریں ان کی خیرات باچندہ سے مدد کرو، بیت المال میں سے مکاتب غلاموں کی آزادی کے لیے روپیہ دینا تجویز کیا بعض صورتیں ایسی بتائیں کہ لوڈی غلام بغیر آزاد کرنے مالک کے خود بخود آزاد ہو جائیں، اسی طرح اور طرح طرح کی سلیس ان کے آزاد کرنے کی نکالیں۔ مالک کو ان کے ساتھ رعایتیں کرنے کی نہایت تاکید کی کہ ان سے زیادہ خدمت نہ لیں، انھیں لوڈی غلام کہہ کر نہ پکاریں، ان کو مثل اپنے کھانا اور کپڑا دیں، ان کو ان کے رشتہ داروں سے جدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک سرسید کا بیان موجود علماء نے اسلام کے مطابق ہے۔ مگر اس کے بعد انھوں نے دو دعوے نہایت شدید کے ساتھ کیے ہیں جن میں بظاہر وہ متغیر و معلوم ہوتے ہیں پہلا دعویٰ ان کا یہ ہے کہ لڑائی کے

قیدیوں کو لوٹدی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیث صحیح میں نہیں ہے۔ اس کے بعد جن آیتوں یا حدیثوں سے علمائے استترقاق کا حکم استنباط کیا ہے ان کو نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ ان سے استترقاق کا حکم مستنبط نہیں ہوتا اور جو الفاظ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں ایسے آئے ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوٹدی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے **ماملکتہم اہم لکم، فک رقبتہ عبد امہ، نکتہ** وغیرہ ان کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ بیشک آیت **رسولہم وفدا نازل نہیں ہوئی اس وقت تک عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے اجنبی کی تفصیل انھوں نے لکھی ہے،** برابر لوٹدی غلام بنائے جاتے تھے، اور نیز بعد اترنے آئیے مذکور کے گو آیت **ہ کے لیے استترقاق کی ممانعت ہو گئی مگر جن کے پاس لوٹدی غلام پہلے سے موجود تھے ان کو آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا کیونکہ آئیے مذکورہ میں صرف آیت **ہ کے لیے یہ حکم تھا کہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر پس قرآن وحدیث کے جن الفاظ سے رقیبت کا وجود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے وہ انھیں لوٹدی غلاموں سے متعلق ہیں جو آئیے مذکورہ کے نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔****

دوسرا دعویٰ ان کا یہ ہے کہ سورہ محمد کی اس آیت سے جس میں یہ حکم ہے کہ آیت **ہ کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دیا کرو یا فدیہ لے کر**

لہ یعنی سورہ محمد کی یہ آیت " فاذا القیتہم الذین کفر وانضرب الرقاب حتی اذا اذنتہم وشد الوثاق

فاما منا بعد اما فلانہم

اسلام نے رسم استرقاق کو جو مثل اور قوموں کے عرب میں بھی قدیم زمانہ سے چلی آتی تھی ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لڑائی کے قیدیوں کو قتل کرنا، لڑھی غلام بنانا، فدیہ لیکر یا احساناً چھوڑ دینا یہ چاروں باتیں رائج تھیں اور اسلام میں بھی۔ جب تک کوئی حکم قیدیوں کی نسبت نہیں آیا، ایسا ہی ہوتا رہا۔ لیکن جب سے یہ آیت من و فدا نازل ہوئی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لڑھی غلام نہیں بنایا یعنی جاہلیت میں جو سیران جنگ کے ساتھ چارہ طرح کے برتاؤ کیے جاتے تھے ان میں سے قتل و استرقاق کو بالکل موقوف کر دیا اور صرف من و فدا میں اختیار دے دیا کہ چاہو بغیر کسی معاوضہ کے محض احساناً چھوڑ دو اور چاہو کچھ فدیہ لے کر چھوڑو۔

اس دوسرے دعوے کے متعلق انھوں نے بہت سی موافق اور مخالف روایتیں کتب احادیث سے نقل کر کے اس بات کے ثابت کرنے میں کوشش کی ہے کہ آیت من و فدا کے نازل ہونے کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پھر کسی کو لڑھی غلام نہیں بنایا گیا اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ان کے بیان کا ما جمل یہ ہے کہ جب قرآن مجید یا حدیث صحیح سے غلام بنانے کا کوئی صاف حکم نہیں نکلتا اور آیت من و فدا سے صاف پایا جاتا ہے کہ جاہلیت کی رسم کے موافق جو ابتدائے اسلام میں لڑھی غلام بنائے جاتے تھے اس کی صاف ممانعت ہو گئی اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قیدی کو لڑھی غلام نہیں بنایا اب ہم کو کچھ مزور تہ اس بات کے دریافت کرنے کی نہیں ہے کہ



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ یا تابعین وغیرہم نے اس باب میں کیا کیا؟

اس بیان کی تائید ماثہوں نے اس طرح سے کی ہے کہ شراب کی حرمت نازل ہونے کے بعد کوئی نہیں سمجھا تھا کہ شراب حرام ہوگئی یہاں تک کہ تین وفد اس کی حرمت نازل ہوئی۔ پھر باوجود یکہ بیع اُمہات اولاد کا ممنوع ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تسلیم کیا جاتا ہے تاہم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک بیع ہوتی رہی۔ اس کے سوا متعہ کی حرمت سے عمر فاروقؓ کی خلافت تک صحابہ واقف رہے۔ پس اسی طرح ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آیہ من و فدا سے جو اصل مقصود تھا اس کو بھی صحابہ نہ سمجھے ہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ پہلے بھی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ لے کر چھوڑنے کا دستور برابر جاری تھا۔ پس اس آیت کے اترنے کے بعد جو تمام قیدی کسی نہ کسی طرح چھوڑ دیے گئے اور قتل یا استرقاق واقع نہیں ہوا اس کو سب نے ایک اتفاقاً بات سمجھا ہر اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلافت راشدہ میں اس مسئلہ پر بحث کا موقع اس لیے نہ ملا ہو کہ پہلی خلافت مرتدین کے مطیع کرنے میں ختم ہوگئی دوسری اور تیسری خلافت میں دار الخلافۃ سے دُور دُور کے قاصد پر لڑائیاں ہوئیں اور چوتھی خلافت کا آپس کے جھگڑوں میں خاتمہ ہو گیا اور اس لیے چاروں خلافتوں میں اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کا مہلت نہیں ملی۔

اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ علمائے اسلام اور خاص کر ہندوستان کے علما موجودہ حالت میں ایک ایسی رائے کے ساتھ اتفاق کریں گے

جو اسلام کی غلامی کے متعلق انھوں نے برخلاف جمہور فقہاء و علمائے اسلام کے قائم کی ہے۔ چنانچہ ایک مبسوط رسالہ جو از استر قاق پر سرسید کے برخلاف انھیں و نون میں جب کہ پہلی بار ابطال غلامی کا رسالہ تہذیب الاخلاق میں شایع ہوا تھا۔ لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں

شک نہیں کہ جس طرح سرسید کی رائے فقہاء

اور مفسرین اور تعامل اہل اسلام کے برخلاف ہے اسی طرح تعامل اہل اسلام اور فقہاء و مفسرین کے اقوال ظاہر قرآن کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں۔ بیشک عد قرآن میں کوئی ایسی نص صریح موجود ہے جس میں لوٹھی غلام بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور نہ آیہ من و فدا کے حصہ کی کوئی ایسی معقول تاویل ہو سکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ لڑائی کے قیدیوں کے ساتھ سوانے من و فدا کے تیسرا سلوک کیا جاسکتا ہے اور نہ ان لوگوں کے پاس جو نسخ کے قائل ہوئے ہیں کوئی ایسی صاف اور صریح نص قرآنی موجود ہے جس کو آیہ مذکورہ کا نسخ قرار دیا جائے اور اس بات کا تو انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ آیہ مذکورہ نے اس سلوک کو جو اسیران جنگ کے ساتھ کرنا چاہیے صرف دو باتوں میں منحصر کر دیا ہے، یا احسان رکھ کر چھوڑنا یا کچھ چھوڑنے کے چھوڑنا۔ ورنہ آیہ مذکورہ کے منسوخ ماننے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

اس تقدیر پر، اگر ہمارا قبائل غلط نہ ہو مسئلہ تنازعہ نبی کی صورت بعینہ ایسی ہو گئی ہے جیسے عبد اللہ ابن عباس سے مسح رجبین اور غسل رجبین کے باب میں منقول ہے کہ "لا اجد فی کتاب اللہ الا المَسْحُ وَ لَكِنَّهُمْ مِنَ الْاَوْلَادِ الْاَلْحَسَنِ" یعنی میں قرآن میں تو مسح کے سوا کچھ نہیں پاتا لیکن

صحابہ نے صرف غسل ہی کو اختیار کیا ہے۔

اگرچہ عام طور پر تعالٰیٰ اہل اسلام اور فقہاء و مفسرین کے اقوال بسر سید کی رائے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر بعض تاریخی شہادتیں ایسی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اُمیہ کے زمانہ میں آیہ من و فدا سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اسیران جنگ کے ساتھ من و فدا کے سوا اور کوئی سلوک نہیں کیا جاسکتا یعنی ایک دفعہ جیسا کہ کتاب عقدا لظہر میں مذکور ہے۔ حجاج کے رد پر کچھ اسیر لائے گئے۔ حجاج نے ان کے قتل کیے جانے کا حکم دیدیا۔ ایک قیدی نے جب کہ اس کو قتل کرنے لگے، حجاج کو بد و عباد دی اور کہا کہ خدا تعالیٰ تو اپنی کتاب میں یہ کہتا ہے کہ "فَاذِ الْقَيْمِ الَّذِي كَفَرَ" ضرب الرقاب حتى اذا اثخنتموهن فشدوا الوثاق فاما منابعد واما قدامه اور تمھارا شاعر اپنی قوم کے مکالمہ اخلاق اس طرح بیان کرتا ہے:

"وَمَا فَتَكُ الْأَمْرِي وَلَكِنْ فَكَلَهُمْ إِذَا نَقَلُوا الرِّبَاقَ حَمْلُ الْقَلَائِدِ"

یعنی ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ ان کو جب کہ ان کی گردنیں طوقوں کے پوجھ میں دلی جاتی ہیں، چھوڑ دیتے ہیں، یہ سن کر حجاج نے (گو یا مقول قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر، کہا "تمہارا بڑا ہو کیا تم نہ کہہ سکتے تھے جو بات اس منافع نے مجھ کو بتائی۔" اور یہ کہہ کر پائی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

حجاج ہی کا ایک اور قصہ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں درج ہے یعنی حجاج کے سامنے ایک اسیر لایا گیا۔ حجاج نے عبد اللہ ابن عمر سے جو اس وقت وہاں موجود تھے، کہا کہ اٹھو اور اس کو قتل کر ڈالو۔ ابن عمر نے فرمایا "ہم کو یہ حکم نہیں ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

إِذَا اثْنَتُمُوهُنَّ فَشَدَّ الْوِثَاقَ فَأَمَّا مَنَابِعُهَا وَأَمَّا قَدَامُهَا

اگرچہ احمد شفیق بک نے آئین من وند اپوزیڈ زیادہ زور نہیں دیا مگر نتیجہ کے لحاظ سے ان کے اور سرسید کے استدلال میں چنداں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ احمد شفیق کی تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ عرب پشت پائنت سے لوٹدی غلام بنانے کے عادی تھے اور یہ عادت ان کی طبیعت ثانی ہو گئی اور اسلام کا سب سے بڑا اور مہتمم بالشان مقصد توحید کا پھیلانا اور شرک و جہالت کا استیصال کرنا تھا اس لیے غلامی کا ذمہ موقوف کر دینا ضرورہ اسلام کے اعلیٰ اور اشرف مقاصد میں خلل انداز ہوتا۔ لیکن جو نصیحتیں بانی اسلام نے غلاموں کے حق میں مسلمانوں کو فرمائیں اور جو بیچارہ حقوق ان کو عنایت کیے اور جس طرح ان میں اور ان کے مالکوں میں ہر طرح سے مساوات کا وجہ قائم کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے غلامی کی سوتیں بالکل بند کر دیں۔ اس کے سوا اسلام صرف ان غیر مسلمین کے استرقاق کی اجازت دیتا ہے جو شرعی جہاد میں اسیر ہوں اور اس پر بھی ان کو ہمیشہ کے لیے مملوک رہنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ جس طرح بادشاہ اسلام ان کو احساناً چھوڑ سکتا ہے اسی طرح وہ خود مذہب دے کر چھوڑ سکتے ہیں۔ پس جو حبشی وسط افریقہ سے ناجائز طور پر پکڑے جاتے ہیں وہ عام اس سے کہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اصول اسلام کے موافق لوٹدی غلام نہیں ٹھہر سکتے۔

اس بیان میں اور سرسید کے بیان میں جیسا کہ ظاہر ہے اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سرسید کے نزدیک جس طرح چوری سے پکڑے ہوئے یا چھینے ہوئے حبشی لوٹدی غلام نہیں بن سکتے اسی طرح اسیران جنگ بھی لوٹدی غلام نہیں بنائے جاسکتے بلکہ ان کے قید رہنے کے بعد مسلمانوں کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ ان کو احساناً چھوڑ دیں یا مذہب دے

کہ چھوڑ دیں۔ اور احمد شفیق ایک کے نزدیک وہ قید ہونے کے بعد لوٹدی غلام تو بن جاتے ہیں مگر اس کے بعد اگر مسلمان ان کو احساناً چھوڑیں تو وہ فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں۔ اس تقدیر پر ظاہراً ثمرہ اختلاف صرف یہ نکلے گا کہ احمد شفیق ایک کے نزدیک اگر مسلمان ان کو احساناً نہ چھوڑیں تو جیت تک وہ فدیہ ادا نہ کریں گے بدستور لوٹدی غلام رہیں گے اور سرسید کے نزدیک اگر وہ فدیہ ادا نہ کر سکیں تو مسلمانوں کو چارو ناچار انھیں چھوڑنا پڑے گا کیونکہ ان کے نزدیک درحقیقت رقیبت طاری نہیں ہوتی۔

بہر حال سب سے پہلے سرسید نے اودان کے بعد مصر کے اس روشن ضمیر فاضل نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ جو سلوک اور احسان لوٹدی غلاموں پر اسلام نے کیا ہے وہ کسی مذہب سے بن نہیں آیا اور گو نصف صدی سے بلحاظ حسن معاشرت کے عیسائیوں نے اور خاص کر انگلش قوم نے اس باب میں تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت حاصل کی ہے مگر مذہب کی رو سے وہ غلاموں کے حق میں اس سے زیادہ کوئی شہادت پیش نہیں کر سکے کہ انجیل تمام بنی آدم کو ایک دوسرے کا بھائی ٹھیراتی ہے اور سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی تاکید کرتی ہے۔ تمام عہد جدید میں کوئی صریح نص غلامی کے برخلاف نہیں پائی جاتی، بلکہ سینٹ پال کے تمام خطوں میں، جو وہین عیسوی کی اشاعت کی غرض سے اطراف و جوانب میں بھیجے گئے کوئی حکم غلاموں کی نسبت اس کے سوا نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں ان کی اطاعت کریں، ان سے ڈریں، ان کی ایسی فرماں برداری کریں جیسی عیسیٰ مسیح کی کرتے ہیں، ان کو ہر تعظیم و تکریم کے لائق سمجھیں اور اگر ان کے آقا عیسائی ہوں تو ان کی خدمت گزاری میں اور بھی زیادہ

مبالغہ کریں۔ یہ خلاف اس کے بانی اسلام نے کہیں غلاموں کو اپنے مالکوں کی اطاعت یا تعظیم و تکریم کا حکم نہیں دیا بلکہ جہاں نصیحت کی ہے وہاں مالکوں کو غلاموں کے ساتھ مہربانی اور شفقت اور ہر ایک بات میں اپنے برابر سمجھنے کی ہے اور طرح طرح سے اُن کے آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے اور مالک و مملوک میں ایک محض اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر قرآن کے موافق دیکھا جائے تو غلامی کو ہمیشہ کے لیے بالکل موقوف کر دیا ہے۔

## تفسیر القرآن

مہربان نے قرآن مجید کی تفسیر جن اصول پر اور جس ضرورت اور غرض سے لکھی ہے اس کا مختصر ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہے، یہاں ہم اس کی وہ خصوصیتیں بیان کرنی چاہتے ہیں جو اُس میں اور دیگر تفاسیر میں ماہر اللہ ہیں اور جن سے سرسید کی نیت کا اور اُس ضرورت کا جس نے اس تفسیر کے لکھنے پر اُن کو مجبور کیا، کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے قدیم مفسروں نے بلاشبہ اُن تمام ضرورتوں کو جو اُن کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً پیش آتی گئیں، بخوبی پورا کیا اور اپنی آسمانی کتاب کی حدت کا حق بحسب ضرورت ادا کرنے سے سب سے پہلے اُن کو اس بنا پر کہ تفسیر بالرائے کی نسبت حدیث میں وعید وارد ہوئی تھی، اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جس قدر اخبار و آثار تفسیر القرآن کے متعلق کتب احادیث میں روایت کیے گئے ہیں اُن سب کو تفسیروں میں اپنے اپنے موقع پر بیان کیا جائے تاکہ کوئی ضروری بات جو قرآن کی تفسیر کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ امت تک پہنچنے سے رہ



نہ جائے، مگر افسوس ہے کہ قدامی اس کوشش سے جو محض نیک نیتی سے  
 کی گئی تھی بے شمار روایتیں تقاسیر قدیمہ میں ایسی درج ہو گئیں جن کے لحاظ  
 سے علمائے محققین کو یہ کہنا پڑا کہ ”کتاب التفسیر مشحونہ بقبالاحادیث الموضوعۃ“ اور  
 اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ پچھلوں نے قدامی تفسیروں میں جو رطب  
 دیا بس روایتیں پائیں بغیر اس کے کہ اصول علم حدیث کے مطابق ان کی  
 تنقید کریں ان تمام رطب دیا بس روایتوں سے اپنی تفسیروں کو بھر  
 دیا اور مخالفوں کے لیے اعتراف کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب اسلام دور دراز ملکوں میں اور غیر قوموں میں، جن کی مادری  
 زبان عربی نہ تھی اور جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل اہل زبان کے  
 اندازہ نہیں کر سکتے تھے، پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ  
 قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر موجب قواعد صرف و  
 نحو معالی و بیان کے بحث کی جائے اور جوہ اعجاز قرآن نہایت تفصیل  
 کے ساتھ بیان کی جائیں اس ضرورت کو بھی ہمارے علمائے اُس زمانہ کی  
 حالت کے موافق نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہل اسلام میں شایع ہوئی اور مسلمانوں  
 میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور ہر فرقہ آیات قرآنی کی تفسیر  
 اپنے اپنے عقاید اور اصول کے موافق منطق اور فلسفہ کی رو سے کرنے  
 لگا تو علمائے متکلمین نے اسلام کی حمایت اس بات میں منحصر سمجھی کہ  
 تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو دخل دیا جائے اور تفسیروں میں  
 مذہب حق کی تائید و دلائل عقلیہ سے کی جائے بعض مفسروں نے  
 اپنی تفسیروں کی بنیاد حیرت انگیز فقہیہ کے استنباط اور اختلافی مسائل

میں اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت پر رکھی۔ غرض کہ جو ضرورت ہمارے قدیم مفسروں کو پیش آئی اُس کو بہ احسن وجوہ پورا کیا گیا۔ لیکن جو ضرورتیں اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو۔ اُن کے مذہب کے متعلق درپیش ہیں ویسی ضرورتیں اگلے زمانہ میں کبھی پیش نہیں آئیں اور اس لیے ہمارے علما کو تفسیروں میں ان کے پورا کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ صدی میں کرۂ زمین کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت یا اُن کا رعب و داب قائم نہ ہو اور اگر دنیا عالم اسباب بے تو ضرور اُن کا رعب و داب روز بروز بڑھتا جائے گا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کسی عیسائی قوم کا رعب و داب قائم ہوا اور فوراً اُن کا مشن اور اُن کی تجارت سیلاب کی طرح اس کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچی، اگرچہ عیسائی حکومتوں میں عموماً اور انگریزی حکومت میں خصوصاً جس قدر رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے شاید دنیا کی کسی حکومت میں بھی اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوتی ہوگی، لیکن رعیت کو کیسی ہی مذہبی آزادی دیکھانے سلطنت کی تقناطیبی کشش اپنا کر شہہ دکھائے بغیر نہیں رہتی، حکمران قوم کی رسوم و عادات و اوضاع و اطوار و اخلاق یہاں تک کہ اُن کے ذہن و مذہب کی طرف محکوم قوم کا دل خود بخود کھپتا ہے اور جب کہ سلطنت کے ساتھ دعوتِ دین بھی شامل ہو اور کرڈروں روپیہ حکمران قوم کے مذہب کی اشاعت میں صرف کیا جاتا ہو اور سلطنت بھی ایک ایسی قوم کی ہو جو عقل و دانش اور سٹائٹسکی و تمدن میں دنیا بھر کی قوموں میں ممتاز ہو اور طرح طرح کی ترغیبیں تبدیل مذہب کی موجود ہوں تو دیکھنا چاہئے کہ وہ کشش کس حد تک پہنچ

جانے گی۔ اگرچہ ہندوستان میں ابھی تک مشنریوں کا منتر مسلمانوں پر ویسا کارگر نہیں ہوا جیسا کہ اور قوموں پر ہوا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح مشن کی زد سے بچے رہیں گے مسلمانوں کے پولٹیکل زوال کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور اس لیے اسلام کی حقیقت کا سکھنا ابھی ان کے دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ آباد و احباد کی مذہبی عظمت ان کو فراموش نہیں ہوئی، آزادی نے ابھی ان کو بالکل مطلق العنان نہیں کیا، قومی سوسائٹی کا دباؤ ابھی ان کی طبیعتوں پر کم و بیش باقی ہے۔ تبدیلی مذہب سے جو ذلت قوم اور خاندان کی نظر میں ہوتی ہے ابھی تک وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اسی قدر رسکاوٹیں کم ہوتی جائیں گی اور نہایت اندیشہ ہے کہ سب سے آخر کار مسلمان بھی اپنے اسلاف کے مذہب سے ویسے ہی بے تعلق ہو جائیں جیسے ہندوستان کی اور قومیں جو ہزار برس سے غیر قوموں کی محکوم چلی آتی ہیں اور مذہب کو بڑے گوں کی ریت اور رسم سے زیادہ کوئی چیز نہیں سمجھتیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اور مذہبوں کی طرح اسلام کی سرحد میں بھی مشن اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ انھیں دنوں میں پنجاب کے ایک ویسی مشینری کی تخریر ہماری نظر سے گذری جس میں لکھا ہے کہ چالیس برس کے عرصہ میں صرف امرت سر کے گرجا میں ۱۵۲ مسلمانوں نے پتہ پایا ہے اور دہلی کے صرف باپٹسٹ مشن میں ۲۸ مسلمانوں نے اصطباغ لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل اسلام کو ایسی حالت بارہ سو برس تک کبھی پیش نہیں آتی، وہ جہاں گئے اور جہاں جا کر رہے اسلام کا رعب و طاب ان کے ساتھ ساتھ رہا، وہ اس عرصہ میں کبھی کسی غیر قوم کے، جو اپنے دین کی اشاعت

یہ مثل عیسائیوں کے سرگرم ہو محکوم ہو کر نہیں رہے۔ اور اس لیے ہمارے  
 قدیم علما کو وہ ضرورتیں جو آج کل اسلام کے خیراندیشوں کو نظر آتی ہیں۔  
 کبھی محسوس نہیں ہوئیں۔

دوسری ضرورت، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اسلام کو سائنس کے  
 حملے سے بچانے کا ہے، علوم جدیدہ کا رواج جیسا عیسائی ملکوں میں ہے  
 ویسا ہی تمام دنیا میں رونا فزون تر ترقی کرتا جا رہا ہے اور جو صدمہ کہ اس  
 نے یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچایا ہے وہی صدمہ دنیا کے تمام  
 مذاہب کو اس سے پہنچتا معلوم ہوتا ہے، شام و مصر و ترکی میں علوم جدیدہ  
 کی اشاعت کو غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، اس قلیل عرصہ  
 میں اس سے جو نتائج ممالک مذکورہ میں باوجود اسلامی سلطنت ہونے  
 کے پیدا ہوئے ہیں ان کو طرابلس کے ایک مشہور عالم شیخ حسین آفندی  
 نے اپنی کتاب حمید بیہ میں ایک موقع پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "جو  
 مسلمان نوجوان مدارس میں علوم جدیدہ اور خاص کر فن طبیعیات کی تعلیم پاتے  
 ہیں وہ اسلام کی قید سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ ان کو اس سے کچھ لگاؤ  
 باقی نہیں رہتا وہ اس بات کے معتقد نہیں رہتے کہ کوئی عالم کا پیدا  
 کرنے والا موجود ہے بلکہ تمام کائنات اور آثار موجودات کو مادہ اور اس  
 کے اجزا کی حرکت اور قوانین طبیعی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور  
 جب کہ ان کا حال الوہیت کے اعتقاد میں، جو اصل اصول اسلام ہے۔  
 ایسا ہو تو پھر کونسا اعتقاد دین اسلام کی نسبت ان میں باقی رہ سکتا ہے۔"

۱۳۰۶ھ میں ان شکوک و شبہات کے رفع کرنے کا غرض سے جو علوم جدیدہ کی

(باقی اگلے صفحہ)

اس کے بعد مصنف مدوح اپنے ہم وطن مسلمانوں کو اس آفت اور بلا سے  
 عظیم سے آگاہ کرتا ہے جو ان کی اولاد میں پھلتی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار  
 کرتا ہے کہ پہلے اس سے کہ یہ مصیبت لا علاج ہو جائے اس کا تدارک کریں  
 ظاہر ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم جبکہ ممالک اسلامیہ میں یہ نتائج پیدا کر رہی  
 ہے تو ہندوستان میں اسلام کیونکر اس کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے۔ یہ  
 بھی ممکن نہیں کہ مسلمان ان نتائج سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کی تعلیم سے  
 دست بردار ہو جائیں وہ پہلے ہی اپنی اس غفلت اور فرو گناہت پر  
 کف افسوس مل رہے ہیں جو مانہ گذشتہ میں انگریزی تعلیم کی نسبت  
 ان سے ظہور میں آئی اور وہ کیونکر اس تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں  
 جس سے ہندو اور شام اور مصر کے مسلمانوں کو بھی کسی طرح مضر نہیں۔ اس  
 کے سوا مسلمانوں کا اولاد کو صرف امن اندیشہ سے مغربی تعلیم نہ دلوانا کہ وہ  
 دین اسلام سے بد اعتقاد نہ ہو جائیں گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ اسلام  
 فلسفہ جدیدہ کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا اور اسلام کا اعتقاد و  
 سائنس کے یقین کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔

جو ضرورتیں ہم نے اوپر بیان کیں بے شک ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں  
 کو محسوس نہیں ہو سکتیں جن کے دل ہر قسم کے دساوس و شبہات سے بالکل  
 پاک ہیں یا جو بقائے دین اسلام کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتے کہ صرف  
 ان کے خاندان کا محدود حلقہ الحاد یا ارتداد کے صدمہ سے محفوظ رہے گو

و بقیہ طالعہ

تعلیم کے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اصول اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ملک شام میں مکھی  
 گئی ہے جس کا نام مصنف نے سلطان عبدالحیہ خاں بالقاہر کے نام نامی پر "حمیۃ" رکھا ہے ۱۲

کہ ساری دنیا محدود بد مذہب ہو جائے لیکن جو لوگ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات سے واقف ہیں اور ہر مسلمان کے تبدیل مذہب سے ان کو وہی مدد پہنچتا ہے جو اپنے کسی عزیز یا دوست کے ارتداد سے پہنچنا چاہیے ان کو یہ ضرورتیں روز روشن کی طرح نظر آرہی ہیں اور ان کو وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہب کا اعتقاد، جب تک کہ اس کو زمانہ حال کے شکوک و شبہات سے منزہ اور میراثا ثابت نہ کیا جائے گا محض آباؤ اجداد کی تقلید سے قائم نہ رہے گا۔

۱۸۷۸ء میں ایک مرزا صاحب نے سرسید پر یہ اعتراض لکھ کر شائع کیا تھا کہ "سید صاحب دنیوی ترقی کی کوشش میں مذہبی بحث کو کیوں دخل دیتے ہیں" اس پر لاہور گورنمنٹ کالج کے ایک مسلمان طالب علم نے کچھ لکھ کر علیگڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سرکاری مدارس میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا، خواہ ہندو خواہ مسلمان جس کا اعتقاد اپنے مسائل مذہبی پر ویسے ہی استحکام سے ہو جیسا کہ پیشتر تعلیم سے تھا، مگر یہ نہیں کہ انگریزی پڑھ کر مشرقی قصوں اور کہانیوں اور دیوں اور پرلیوں کی داستاتوں کو چھوٹا نہ سمجھے اور جن کتابوں میں ان کا ذکر ہو اور پھر ان کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو ان کو لغو اور بیوقوف نہ جانے۔ آج کل کے طالب علموں کے اگر دل چیر کر دیکھے جائیں تو معلوم ہو کہ ان کے مذہبی مسائل ان کے دل میں کیسے کیسے کھٹکتے ہیں اور کوئی ملامت سولی ان کی تشفی نہیں کر سکتا۔ بعض جو بہت آزاد طبع ہوتے ہیں اور اپنے کائنات کو دیکھ سکتے اور بغیر کافی دلیل کے اس کو زبردستی جھٹلا نہیں سکتے وہ عیسائی یا لاند مذہب ہو جاتے



ہیں۔ شکر ہے کہ سید صاحب نے اصحاب مذہبی سے اس آفت کو روکا۔ اسی  
اصلاح نے پادریوں کی امید کو توڑا۔ اگر سید صاحب یہ اصلاح نہ کرتے تو  
نہ معلوم مدرستہ المسلمون ہی کے کتنے مسلمان طالب علم اصطباغ پاپکے  
ہوتے۔ ہماری رائے میں سید صاحب کے تمام کارہائے نمایاں ہیں جو  
نہایت قدم و منزلت کے لائق ہیں۔ ہم آئندہ کی ترقی کی جڑ ہے۔  
وہ وہی حصہ ہے جس کو مرزا صاحب قابل تقرر قرار دیتے ہیں، کاش اگر  
مرزا صاحب چند سے کالجوں میں رہتے ہوتے تو وہ سید صاحب کے  
اسی کام کو جس کو وہ اب قابل تقرر قرار دیتے ہیں، نہایت عمدہ بلکہ  
تمام کارہائے نمایاں کی جان قرار دیتے اور جو تحریریں اب باسٹ ڈسکنی  
اور موجب ملامت و گمراہی خیال کی گئی ہیں، ہم مرزا صاحب کے گلے  
میں بطور حرز جان کے لگتی دیکھتے۔“

یہ اگرچہ ایک نوجوان طالب علم کی شہادت ہے جس کی شاید لوگوں  
کی نظر میں کچھ زیادہ وقعت نہ ہو، مگر اس قول کے موافق کہ ”اہل البیت  
آذری بمانی البیت“ انگریزی خواں طلبہ کے نزدیک اس نوجوان طالب علم  
کی شہادت بڑے بڑے مشائخ کبار کی شہادت سے زیادہ اعتبار کے لائق  
ہے اور اس کا ثبوت بارہا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گذرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک  
عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ ”عید کے روز روزے نہین  
پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصباح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ  
زمین پر اتر کر ہر ایک بستی کے گلی گچوں میں سنائی کرتے ہیں جس کو  
تمام مخلوقات سوائے جن و انسان کے سنتی ہے اور بلند آواز سے

کہتے ہیں کہ اے امت محمدیہ! خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے یہ اس وقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی وہاں موجود تھے، جب دعوت ہو چکا تو مسجد سے باہر نکل کر ان میں سے اکثر طلبہ اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے تو کہتے تھے کہ عجیب تماشا ہے جن کو عید گاہ میں بھیجا منظور ہے وہ تو سن نہیں سکتے اور تمام نبیانات و جمادات سنتے ہیں پھر اگر ہم لوگ عید گاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا تصور ہے۔

اسی طرح کے صد ہا واقعات ہر روز دیکھتے اور سنتے میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ خرابیاں ہمارے واعظوں کی سادہ لوحی اور نا عاقبت اندیشی سے پیدا ہوئی ہیں جو اس قسم کی حدیث و موضوع روایتیں بیان کر کے لوگوں کو دین پر ہنسواتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ہر گروہ کے ساتھ اس کی عقل اور سمجھ کے موافق گفتگو کرنی چاہیے، سب کو اسی قدیم دستور کے موافق ایک لاکھٹی سے ہانکتے چلے جاتے ہیں۔

سر سید نے انھیں خرابیوں کے تدارک کے لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی جس کی پہلی جلد ۱۲۹۷ء میں چھپ کر شایع ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس کی جلدیں شایع ہوتی رہیں، مگر افسوس ہے کہ وہ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۃ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۃ انبیاء تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السموات، الباطل غلامی، انزالۃ الغیب فی قصہ ذی القرونین ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف، و الترقیم وغیرہ وغیرہ کے جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہیے، سر سید

یادگار رہ گئے۔

مفسرین نے اس تفسیر میں ان معنایں سے بہت ہی کم تعریض کیا ہے جن کو قدیم مفسرین نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنی اپنی تفسیروں میں بیان کر چکے تھے، یا جن کے بیان کرنے کی اس زمانہ میں کچھ ضرورت نہ تھی، بلکہ انہوں نے زیادہ تر انہیں باتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کو وہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور جن سے اگلی تفسیریں بالکل خالی نظر آتی تھیں۔

## پہلی خصوصیت

مثلاً ہمارے مفسروں نے اخبار ماہیہ کی تیغ پر، جو کہ قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں، بہت ہی کم توجہ کی تھی۔ اس کا سبب خواہ یہ سمجھو کہ ان کو ایسی ضرورت پیش نہیں آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اس زمانہ میں اطلاع کے ذریعہ محدود تھے۔ دونوں صورتوں میں یہ فرو گذاشت بلاشبہ تفسیر قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی۔ اگرچہ قرآن مجید میں امم سابقہ کے قصے ایسی تفصیل کے ساتھ جیسی کہ بائبل میں درج ہے، بیان نہیں ہوئے بلکہ اکثر ان قصوں کی طرف تریب یا ترغیب کی غرض سے اجمالی اشارے کیے گئے ہیں لیکن جب کہ اکثر وہی قصے کتب سابقہ میں مفصل مذکور ہیں اور قرآن میں ان کتابوں کی جا بجا تصدیق کی گئی ہے اس لیے ضرور تھا کہ ہمارے مفسرین جہاں تک ممکن ہوتا قرآن مجید کے ان اجمالی قصوں کی تفصیل کتب سابقہ کے موافق بیان کرتے اور دونوں بیابانوں میں تطبیق یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرتے۔ اگرچہ یہ بات

علمائے مسیحی کے اقرار سے بخوبی ثابت ہے کہ بہت سی مقدس کتابیں جن کا ذکر بائبل کی موجودہ کتابوں میں آیا ہے۔ اب ناپسند ہو گئی ہیں اور اس لیے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر قصہ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہ موجودہ مجموعہ بائبل میں بھی پایا جائے لیکن جو قصے قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً ایسے مذکور ہوئے ہیں جو بائبل میں بھی اسی طرح یا کسی قدر جزوی اختلاف کے ساتھ مندرج ہیں ان کی تطبیق کرتی یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرنی خاص کر اس زمانے میں ایک ایسی بات تھی جس کی ضرورت کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔

سر سید نے سب سے پہلے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے قصہ یا واقعہ کا جو قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ تا بمقدور بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن اور بائبل کی تطبیق کی ہے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جس قصہ کا پتہ موجودہ بائبل میں نہیں لگاتا بمقدور اُس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔

## مثال ۱

مشلاً طاہرۃ اور جاہلۃ کی لڑائی کا قصہ جو سورہ

بقرہ میں مذکور ہے، یہی قصہ شمونیل بنی کی کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اُس میں وہ مضمون نہیں ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے کہ :-

إِنَّ لِلَّهِ مِنْكُمْ بَشَرًا مِّمَّنْ دَفَعْنَا عَنْكُمْ إِبْرَاهِيمَ إِذْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ  
 الطُّورِ عُرْفًا مُّجِيدًا ۝۶۰ لیکن یہی مضمون کتاب تفضاۃ کے ساتویں باب میں جہاں حبّ دعون کی مدیانیوں پر شکر کشی کا ذکر ہے، مندرج ہے۔ اس لیے عیسائی مؤرخوں نے قرآن کے بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں غلطی سے جد دعون

کے شکر کے واقعہ کو طاقت کے شکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے حالانکہ دونوں واقعے بالکل جدا جدا ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔

مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علمائے مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب شموسیل کے بعض ابواب کے نسخہ و درس صحیح نہیں ہیں اور جان کٹو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے کہ جنھوں نے الحاق کیا تھا انھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو" اس کے سوا یہودی اور عیسائی عالموں میں اختلاف ہے بعض تین بیویوں کی اور بعض پر مباحہ نبی کی لکھی ہوئی بتاتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ شموسیل بنی کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں اور اس سے آسانی خیال میں آسکتا ہے کہ بعض واقعات الٹ پلٹ ہو گئے ہوں یا بعض تحریر میں نہ آئے ہوں

## مثال ۲

یامثلاً قرآن مجید میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ضمن میں خلق طیر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ موجودہ عہد جدید کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے اس لیے عیسائی اس کو ایک غلط واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ گویا واقعہ موجودہ عہد جدید میں نہیں ہے لیکن وہ انجیلیں جو ناجیل طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں اور جن کو ایک زمانہ میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے تھے اور مدتوں ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں۔ ان

میں یہ واقعہ جس کا قرآن میں اجمال ذکر ہوا ہے، بہت تفصیل کے ساتھ  
 مذکور ہے اور ان اسجلیوں کا تمام بیان جو اس واقعے سے متعلق ہے تفسیر  
 میں نقل کیا ہے جس سے عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہی  
 کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

## مثال ۳

یاشلا عیسائی قرآن کی ان آیتوں کے مضمون پر اعتراض کرتے ہیں جن  
 سے قوم عاد کا قوم نوح کے بعد ان کا جانشین ہونا اور حضرت ہود کا قوم عاد  
 کی ہدایت کے لیے مبعوث ہونا پایا جاتا ہے کیونکہ بائبل میں اس کا کچھ ثبوت  
 موجود نہیں ہے، مگر سرسید نے سورہ اعراف کی تفسیر میں ان کتبوں  
 کے بموجب جو اول معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمن حاکم مین کو  
 ملے تھے اور اب ۱۸۳۲ء میں انگریزوں کو مین کی پیمائش کرتے ہوئے  
 وہاں کے کھنڈرات میں دستیاب ہوئے ہیں، عیسائیوں کے دونوں  
 اعتراضوں کو رد کیا ہے اور ریورنڈ فاسٹرنے جو غلط نتیجہ ان کتبوں سے  
 نکالے ہیں ان کی غلطی ثابت کی ہے۔

عرض کہ تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات جو قرآن مجید کے قصوں سے متعلق  
 ہے اس کی طرف سرسید سے پہلے ہمارے مفسروں نے بہت ہی کم التفات  
 کیا تھا شاید اگلے زمانے میں اس کی ضرورت نہ ہو اور ہر مسلمان کے یقین  
 کے لیے کسی واقعہ یا واقعہ کا قرآن میں مذکور ہونا ہی کافی ہو لیکن  
 اس زمانے میں اس کی نہایت ضرورت تھی، قطع نظر منافقین کے اعتراضات  
 کے جن کو ہر طرح کی نکتہ چینی کرنے کی آزادی ہے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں



کی تفسیح کے لیے ہر قصہ اور ہر واقعہ اور ہر نام اور ہر مقام کو جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں، زمانہ حال کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر منطبق کرنا اور در صورت عدم تطبیق کے تاریخی و جغرافیائی تحقیقات کو غلط ثابت کرنا ضرور ہے۔

اگر ہمارے قدیم مفسروں نے بھی اپنی تفسیروں میں اہم سابقہ کے حالات کثرت سے قلمبند کیے ہیں لیکن اول تو ان کا ماخذ زیادہ تر وہ ضعیف روایتیں ہیں جو محدثین کے نزدیک اعتبار کے قابل نہیں اور اگر بالفرض ان روایتوں کو اصول حدیث کے موافق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ صرف ان ماسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے کافی ہو سکتی ہیں جن کے دل شکوک و شبہات سے پاک ہیں نہ کہ عیسائیوں کے لیے جو قرآن مجید کے تفصیلات پر پور خانہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو یورپین مصنفوں کے اعتراضات ان کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعض ایسے قصے بھی بیان ہوئے ہیں جو بائبل میں مذکور نہیں ہیں جیسے ذوالقرنین کا قصہ یا اصحاب کہف کا قصہ۔ سرسید نے ان قصوں کی تحقیقات میں بھی کامیابی کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قصوں کے متعلق انھوں نے دو علیحدہ رسالے لکھے ہیں اور دونوں کا جس قدر بیان قرآن مجید میں ہوا ہے اس کے تمام جزئیات کو تاریخ مسلمہ پر منطبق کرنے میں کوشش کی ہے۔ لیکن ذوالقرنین کے قصہ میں جو انھوں نے جی وانگٹی وغفور حین کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھہرایا ہے اُس پر بلاشبہ یہ اعتراض وارد ہو گا ہے کہ قرآن میں جس قدر قصے اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں ان میں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جو عرب یا اُس کے

قرب و جوار میں مشہورہ و مسلم نہ ہو پس کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ایسے اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ جس کے حالات سے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی اکثر قومیں خاص کر نزول قرآن کے زمانہ میں بالکل بے خبر تھیں۔ اُس کتاب میں بیان کیا جائے جو عرب کے اُمیوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہو۔ اکثر مفسروں نے سکندر رومی کو دو القدرین قرار دیا ہے۔ اور ابوہریرہ بیان بیرونی نے بنی تمیمیر کے بادشاہوں میں سے ابو کرب شمس بن عیسز بن افریقہس کو اُس کا مصداق ٹھہرایا ہے مگر یہ دونوں قول سرسید کے قول سے بھی زیادہ مخدوش ہیں حق یہ ہے کہ اس قصہ کی کوئی تفسیر اب تک ایسی نہیں کی گئی جس میں اس کے تمام جزئیات کو تہنچی اور حجازی تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو اور باوجود اس کے قرآن کے وظیفہ مستمرہ کے بھی خلافت نہ ہو۔

دوسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ جو اعتراضات زمانہ حال کے نکتہ چین مسلمانوں کے اُن مسائل و معتقدات پر وارد کرتے ہیں جو اسلام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں جیسے جہاد، حج، صوم، رمضان، طلاق، حرمت ربا، سراج، بہشت، دوزخ وغیرہ وغیرہ، ان اعتراضوں اور اُن مسائل و معتقدات پر جس صفائی کے ساتھ اس تفسیر میں بحث کی گئی ہے اور جن مناسب طریقوں سے معتقدانے وقت کے موافق ان کو دفع کیا گیا ہے اس کی نظیر قدیم تفسیروں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہم اُن میں سے صرف دو مثالیں نہایت اختصار کے ساتھ بطور نمونہ کے ناظرین کی اطلاع کے لیے بیان کرتے ہیں۔

## مثال ۱

سب سے بڑا معرکہ الہ آباد کا مسئلہ ہے جس پر سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں تفسیر لکھنے سے پہلے کافی بحث کر چکے تھے مگر تفسیر میں مسئلہ مذکور کے متعلق اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جن کو تیرہ سو برس سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مطعون کرنے کا ایک زبردست آلہ بنا رکھا تھا اور جن کی بدولت واقعہ مشہور کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی پورے شکل حالت کو نہایت سخت صدمہ پہنچا تھا۔ انھوں نے اول سورہ بقرہ کی ان آیتوں کی تفسیر میں جن میں مشرکین کو کفر سے قتال کرنے کا حکم ہے اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں "اکثر لوگ اسلام پر یہ طعن کرتے ہیں کہ اس میں تسخّل اور سبرہ باری اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں اُن کی صبر کے ساتھ برداشت نہیں ہے اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برعکس ہیں مگر یہ ایک بڑی غلطی اور نا سمجھی ہے۔ بے شک قرآن مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُن کو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لیے نہایت بد اخلاقی اور نا انصافی سے برتا اور وحشی دندوں سے بھی بدتر کام کیے اور علمائے اسلام نے اُن کی تائید کے لیے ایسے مسئلے بیان کیے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برعکس تھے مگر اُن کے ایسا کرنے سے جو برائی قرار دی جاوے وہ انھیں پر محدود ہے جنھوں نے ایسا کیا، نہ اسلام پر یہ

”اسلام میں اگرچہ جا بجا عضو و شمل کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں اور ان پر رغبت دلائی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بدلائیے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانون قدرت کے مناسب نہیں ہے؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے؟ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی سیکلی کے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ سب کی آواز سے زیادہ کچھ ترسہ نہیں رکھتے اور چون کہ وہ اصول فطرت انسانی بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں، کبھی ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔“

”کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار و شمل کرنے والی اور اخلاق کو ابسی چمک سے دکھانے والی جس سے آنکھوں میں چمکا چوند آ جاوے نہیں ہے۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا! انجیل میں لکھا ہے کہ ”اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دے“ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے! اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے! اور اسی طرح لوگوں کی جان اور مال امن میں رہے! نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب ایسے ہی ہو جائیں تو دنیا سے شراٹھ جاوے مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ہوگا؟ یہ سب ناشدنی باتیں

ہیں جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان خیالی اور چھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔  
 ”عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق ہیں لگائی گئی  
 تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس  
 سب سے بڑھا اور سرسبز ہوا، مگر دیکھو کہ اس نے کیا پھل پیدا کیا! ایک  
 بھی نصیحت اُس کی کام نہ آئی اور خود مذہب نے جو خون ریزی اور بے رحمی  
 اور نا انصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصات دکھائی وہ شاید دنیا  
 میں ہمیشہ ہوگی اور جس نیکی میں اس کی جڑ لگائی گئی تھی اس نے کچھ پھل  
 نہیں دیا، کیونکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی، کیا  
 روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی، اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں۔  
 کیا یہ پھل اسی درست کا ہے جس کی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو  
 خلافِ قانون قدرت تھی؛ ماشاؤکلا، بلکہ یہ اس کا پھل ہے کہ اُس خشت  
 کو وہاں سے اکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین  
 ہے اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے اسی قدر  
 اس میں نقصان ہے۔“

”اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جس نے ایک چھوٹے  
 سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے خون کا بہانا  
 آدمی کا ہویا اور تمہارے کا یا ایک پشہ کا خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجھا ہے  
 مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو قانون قدرت کے مخالف  
 تھا کیا نتیجہ دیا؛ قتل و غول ریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسی کہ  
 قانون قدرت سے ہونی چاہیے، وہی جو ایک پشہ کا مانا گناہِ عظیم سمجھتے  
 تھے، ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے

ہیں، پس کوئی قانون گودہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آئند ہو جیکر وہ قانون قدرت کے برخلاف ہے محض نکما اور بے اثر ہے۔“

”اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون، قانون قدرت کے مطابق اور عملہ رآمد کے لائق ہیں، رحم کی جگہ، جہاں تک کہ قانون قدرت اجازت دیتا ہے، رحم بے معافی کی جگہ معافی ہے۔ بدلے کی جگہ بدلہ ہے۔ لڑائی کی جگہ ٹرائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل اُس کی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کو طرف سے ہونے کی ہے۔“

”اسلام نسا اور دعا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے اُن کو ایسی مسلمانوں کو، اسن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر اس کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے، کافروں کے ساتھ جو عہد و قرار ہوئے ہوں ان کو نہایت ایمانداری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خون ریزی کی اجازت نہیں دیتا، کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے، حملہ کر کے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا، یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا، صرف دو صورتوں میں اس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے، ایک اُس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عدالت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے، نہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں اور خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے، اس کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے، دوسرے جب کہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو، اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں



اُن کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو  
 مگر اس حالت میں بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں بطور رعیت کے رہتے  
 ہیں، گو صرف بوجہ اسلام کے اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی  
 اجازت نہیں دی، یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ گئے  
 چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اُس ملک میں امن لیے ہوئے یا  
 بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، اُن کو مظلوم  
 مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہونا ہے۔ یا اُن  
 کے لیے امن اور مذہبی آدائی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی  
 ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی عرض اس لڑائی کا باعث ہو اُس کو  
 مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔  
 ”یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔“

یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے، یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی  
 ثواب کا وعدہ دیا ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں  
 بیان ہوئی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی نا انصافی اور زیادتی ہے۔  
 کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے  
 کہ یہ لڑائی قانونِ قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے؟ کون کہہ  
 سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا  
 ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم شہوتاً بلکہ، دوسرا گال پھیر دینا، خدا  
 کی مرضی کے مطابق ہوگا!

” لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے  
 اس میں بجز اس کے کہ دشمنوں کو قتل کرو۔ لڑائی میں بہادری کرو، دل کو

مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کر دیا مارے جاؤ اور کچھ نہیں کہا جاتا، وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اُس موقع اور محل کو جس کی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آئینیں نازل ہوئی ہیں، چھوڑ کر ان آیتوں کو عموماً خونخواری اور خوں ریزی پر منسوب کرے۔ جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے۔ تو یہ خود اس کا قصور ہو گا نہ اسلام کا!

لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اس میں فرو گذاشت نہیں کیا، عورتوں کو بچوں کو، بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں ان کو قتل کرنے کی ممانعت کی، عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُس کے قتل کی اجازت نہیں دی صلح کو اور معاہدہ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی، باغ کو، کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی، قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ سنے کر چھوڑ دینے کا حکم دیا، نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد، غلام اور لونڈی بنالینے کا تھا اس کو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے! ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس میں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی، بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کیے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے واغ نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنہوں نے عمرہ کو، عثمانؓ کو، علیؓ حسینؓ کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلا دیا تھا، پس ان کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے!

”مشرکین مکہ نے ان لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے، صرف اسلام

کی عداوت سے اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت سے ظلم کیے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں، قتل کے درپے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینے چلے آئے، پھر انھوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا اور مکہ میں حج کے آنے سے روکا، ٹرائی پر آمادہ ہوئے، تب اسلام نے ان سے لڑنے کا حکم دیا، پس جس قدر احکام قتل مشرکین کے ہیں وہ سب انھیں لڑنے والوں سے متعلق ہیں، وہ بھی اسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جائے۔

جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے: "وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ"۔  
 امام فخر الدین مازمی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارنے لگے اور ایذا دیتے تھے، یہاں تک کہ تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے پھر بھی وہ برابر ایذا دیکھتے رہے، یہاں تک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھمی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ ان پر غالب ہو جاؤ، تاکہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیرنے کے لیے ایذا نہ دے سکیں اور تم شرک میں نہ پڑو" "يَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ" کا فقرہ بھی انھیں آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکین و کفار کے حملہ کے دفع کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی تھیں، اس کے یہ معنی سمجھتے کہ اتنا لڑنا چاہیے کہ اسلام کے سما کوئی دین نہ رہے، یہ تو محض نااطنی کی بابت ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے، اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہیے کہ اللہ کے دین کے سجالنے میں جو کافر برج

ٹولتے ہیں وہ نہ رہے اور اللہ کے لیے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لیے اس کو بے ایذا کے سجا لاسکیں۔“

سر سید نے سورہ بقرہ کی تفسیر میں مسئلہ جہاد کے متعلق صرف اسی اجمالی بیان پر اکتفا کیا ہے۔ مگر سورہ انفال اور سورہ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑے اہتمام کے ساتھ اٹھایا ہے اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اسی مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہے۔ انہوں نے سورہ توبہ کی تفسیر میں اول بطور الزامی عجت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرت موسیٰ کے قتل و غارت سے جو کہ توریت میں مذکور ہے کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیاں اُس کے مقابلہ میں بالکل رحمت تھیں اور جو لوگ توریت کو اور حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں ان کے لیے حضرت یسحٰ کا یہ قول کافی ہے کہ وہ تو اس تنگے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں بے کیوں دیکھتا ہے اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہے اُسے دریافت نہیں کرتا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں ”مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم صرف عجت الزامی پر اکتفا کریں بلکہ ہمارا مقصود ہر امر کی تحقیق کرنا اور اُس کی اصلیت کو ظاہر کرنا ہے اس لیے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔“

اس کے بعد انہوں نے ان تمام اعتراضات کا جو قدیم سے عیسائی اسلام کے مسئلہ جہاد پر کرنے چلے آئے ہیں، لب لباب بیان کر کے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں ان کے صرف امن قائم رکھنا اور کفار کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچانا مقصود تھا۔ کہ زبردستی ہتھیاروں کے

زور سے، جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں، اسلام منوانا۔ اور اُس کے ثبوت میں اول ان تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کیسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کیے اور کیا کیا مصیبتیں بھیلیں اور کس تہیم و ہراس کی حالت میں یہ زمانہ اسلام اور بانی اسلام پر گذرا یہاں تک کہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق چچا ابوطالب کا انتقال ہو گیا تو دینِ اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسول خدا صلعم کے قتل کا نہایت پختہ طوطے سے منصوبہ باندھا گیا۔ دو دفعہ انھیں سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں ہجرت کر کے حبشہ کو چلے گئے اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزاہ پہنچانے میں کمی نہیں کی۔ حبشہ کے مہاجرین کا تعاقب انھوں نے سمندر کے کنارہ تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سے شتھے اور ہدیے بھیج کر مسلمانوں کو اُس سے مانگا مگر نجاشی نے ان کے رہنے سے انکار کیا اہل مدینہ کے ساتھ بھی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا وعدہ کیا تھا یا جو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے، قریش نے بُرائی کرنے میں کچھ کمی نہیں کی اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنے کا برابر خطرہ لگا رہا۔

جب کہ اسلام اور اہل اسلام کی یہ حالت تھی تو سرسید لکھتے ہیں کہ "ایسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مہاجرین و انصار کو اپنے اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رہنے کے لیے چاہہ امر لازمی تھے کہ

بغیر ان کے کہیں امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی۔  
 (۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں۔  
 (۲) جو قومیں کہ مدینہ یا نواح مدینہ میں رہتی تھیں ان سے امن کا اور قریش کی مدد کرنے کا معاہدہ کرنا، لیکن عہد شکنی کی حالت میں ان سے مقابلہ کرنا اس منصوبہ کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا معاہدہ کرنا کیونکہ اگر عہد شکنی کی کافات قائم کی جائے تو کوئی معاہدہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور امن مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) جو مسلمان کہ مکہ میں بہ مجبوری رہ گئے تھے اور موقع پا کر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے ان کے بھاگ آنے پر جس قدر ہو سکے ان کی اعانت کرنا چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اس کے ساتھ بھانہ کر کے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلا ہو۔  
 (۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح پر احتمال ہو کہ وہ مدینہ پر آنے والا ہے اس کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا کیونکہ ایسا کرنا اسی امن کے قائم رکھنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔  
 اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ان کے سوا دو امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اٹھانے کا باعث ہوتے ہیں۔

(۱) یہ کہ کفار ان مسلمانوں کو جو ان کے قبضہ میں ہوں تکلیف اور ایذا دینے ہوں اور ان کی مخلصی کے لیے لڑائی کیجاوے کون شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاقی اور انسانی کے برعکس کہہ سکتا ہے اور یہ اتہام کر سکتا ہے کہ وہ زیر دستی اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبولوانے کے لیے ہے۔



۱۲۱ یہ کہ کفار مسلمانوں کو ان کے احکام مذہبی ادا کرنے کے لیے مانع ہوں۔ بشرطیکہ وہ ان کی عملداری میں رہتے نہ ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں ان کو وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی۔ اگرچہ اس لڑائی کی بنیاد ایک مذہبی امر پر ہے لیکن اس کا مقصد اپنی مذہبی آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا۔

پھر لکھتے ہیں کہ "ایک اور امر ہے جو انہیں قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے۔ یعنی جس ملک یا قوم سے انہیں امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشہور ہو چکی ہے اُس ملک یا قوم پر چھاپہ مارنا یا ان کا اسباب اور ان کی رسد اور ان کے ہتھیاروں کو لوٹ لینا، اس زمانہ تہذیب میں بھی کونسی مہذب سے مہذب قوم ہے جو اس فعل کو نامہذب و ناجائز قرار دے سکتی ہے؛ اور کون ہے جو اُس کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا قبلوانا قرار دے سکتا ہے۔ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انہیں امور پر مبنی تھیں ایک لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منہوایا جائے۔" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے۔"

اول ان احکام سے جو قرآن مجید میں لڑائیوں کی نسبت وارد ہیں اور جن کا ظاہر ہو گا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قائم کرنے کے لیے تھا نہ زبردستی سے اسلام قبلوانے کے لیے۔ دوسرے ان لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واقع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک امر اور بحث طلب باقی رہ جائے گا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنا بھی زیبا ہے یا خاموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو طشت

میں رکھو اگر دشمن کے سامنے جانے دینا! یا کافروں کے ہاتھوں میں اپنے  
تئیں ڈالا کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا! سو ہم اس پر بھی اخیر کو سبٹ  
کریں گے؛

اس کے بعد انھوں نے نہایت شد و مد سے دعوے کیا ہے کہ قرآن  
کی کسی آیت میں جبرِ اسلام کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مسلمان کرنے کے  
یہ صرف وعظ اور نصیحت کرنے کی ہدایت ہے، پھر وہ آیتیں نقل کی  
ہیں جن میں مذہب کی آزادی کا حکم ہے مثلاً سورۃ نحل میں آنحضرت کو حکم ہے  
کہ ”دعوتِ اسلام کر حکمت اور مو عطفہ حسنہ کے ساتھ اور ان سے سبٹ  
کہ پسندیدہ طریقہ کے ساتھ“ یا سورۃ نور میں حکم ہے کہ ”خدا اور رسول کی فرمائش  
بر داری کرو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکموں  
کا پتہ چار دینا ہے“ یا سورۃ قاف میں فرمایا کہ ”اے پیغمبر تو ان پر جبر کرنے  
والا نہیں ہے“ اور سورۃ غالب میں فرمایا کہ ”اے پیغمبر تو صرف نصیحت  
کرنے والا ہے کچھ ان پر کر ڈالنا نہیں ہے“ اور سورۃ یونس میں فرمایا ہے  
پیغمبر کیا تو ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور سورۃ بقرہ میں صاف  
صاف فرمایا کہ ”دین میں کچھ جبر واکراہ نہیں ہے“

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں  
اسی وقت تک تھیں جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے  
مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مہاجرین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام  
کو قوت حاصل ہو گئی اس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور  
سے مسلمان کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اول  
تو سورۃ نور اور سورۃ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ

اسلام کو سنجوئی قوت حاصل ہو گئی تھی، حالانکہ انھیں سورتوں میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکموں کو پہنچا دینا ہے اور دین میں کچھ جبر واکراہ نہیں ہے۔ دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوئے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت و ضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے پس جب کہ آپ مکہ میں تھے جب بھی اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص نذر دستا سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ میں تشریف لے گئے تو بیشک لڑائی کا حکم ہوا مگر نہ اس لیے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جانے بلکہ محض اسن قائم کرنے کے لیے جیسا کہ آئندہ یہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔

اس کے بعد صلح اور معاہدہ کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ کے احکام بیان ہوئے ہیں، پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کر کے ذکر کی ہیں اور جہالت و ضحمت اور صفائی کے ساتھ ان سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے۔

(۱) ان لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں۔

(۲) ان لوگوں سے جنہوں نے دعا بازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو۔

(۳) ان لوگوں سے جنہوں نے مسلمانوں کو یا ان کے بچوں کو عورتوں کو غلاب

اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا، ان تین صورتوں کے سوا کہیں قرآن مجید میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا، پھر انہوں نے آنحضرت صلعم کے زمانہ کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور ستر یہ کے نام سے مشہور ہیں بلا استیجاب بیان کی ہیں

اور سولہ سے ستر تک ۳۱ غزوات اور ۵۲ سرایا کا مفصل حال حدیث  
 اور سیر اور پیغمبر انبیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے اور کمال خوبی اور صفائی  
 کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں  
 ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بجز و بزور شمشیر مسلمان کیا جائے بلکہ  
 یہ تمام لڑائیاں اور متعلقات یا تو دشمنوں کی مدافعت اور ان کا حملہ روکنے کے  
 لیے ہوئے تھے، یا ان کا ارادہ فاسد معلوم ہونے کے بعد ان کو منتشر کرنے  
 کو، یا ان کی عہد شکنی اور دغا بازی ظاہر ہونے کے بعد اور یا ان لوگوں کی مدد  
 کے لیے جو خیر رسائی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے ان کا مقابلہ  
 ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے  
 ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اس کو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔  
 پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ زبردستی تنہیا روں کے زور سے مسلمان  
 کرنے کے لیے تمہیں ایک ایسا غلط قول ہے جس کو کوئی ذی عقل بجز اس  
 کے جس کے دل میں تعصب بھرا ہو تسلیم نہیں کر سکتا“

پھر لکھتے ہیں کہ ”جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی  
 طور پر اس قوم کے نہ صرف مذہب کو بلکہ رسم و رواج عادات و اطوار کو  
 ترقی ہوتی ہے اور لوگ اس کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں اور یہ مقولہ  
 کہ اُمَّلُکُ وَالذِّیْنُ تَوَآءَمَوا“ ہر ایک قوم اور ہر ایک مذہب پر صادق  
 آتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اسی قدرتی قاعدہ سے اسلام  
 کی ترقی کو بھی مدد پہنچی۔ بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقعہ پایا جاتا  
 ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح قوم نے فتح کامل حاصل  
 کرنے اور استقلال کامل پانے کے بعد اپنی منقوح قوم (یعنی مسلمانوں)  
 وحاشیہ اگلے صفحہ

کا دفعۃً مذہب اختیار کر لیا۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بت شکنی میں جس کو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بت شکنی کے قابل الزام سمجھتے ہیں، اور محمود عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرقہ پرستانہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کعبہ ایک مسجد تھی حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لیے، اس کے بعد جب عرب بت پرست ہو گئے تو اس مسجد میں انھوں نے بت رکھ دیے جن کا برباد کرنا اور دین ابراہیم کا اس مسجد میں جاری کرنا ابراہیم کے پلوٹے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا، قوم عرب جس کا غالب حصہ ابراہیم کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرت صلعم بھی تھے اس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھڑانا اور ابراہیم کے خدا کی پرستش سکھانا ضرور تھا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے اس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آٹا دی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ”مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بت شکنی اور غیر مذہب کے معبدوں کو برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، اسی طرح ہزاروں مثالیں اس کے برخلاف موجود ہیں مسلمانوں کی سلطنت دنیا کے بہت

لہ بیان فاتح قوم سے مراد خواتین تھیں جن میں سب سے زیادہ نامور چنگیز خاں اور ہاکو خاں ہونے میں جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے چنانچہ چنگیز خاں کا قول تھا کہ ”خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے قلع قمع کے لیے بھیجا ہے: ان کی حکومت تمام ایران توڑ کر خاک و رشت چھانک اور روس وغیرہ میں بھی بونی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانہ میں اول برکہاں چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا اور پھر سلطان احمد بن کاناں اسلام سے پہلے نکو دار تھا اسلام لایا اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا۔“

بڑے حصہ میں پھیلی ہوتی تھی، اس میں مختلف مذاہب کی قومیں رہتی تھیں  
تمام سینگاگ اور تمام گریس جو زیادہ تر رومن کیتھولک مذہب کے تھے۔  
بدستور قرنائی اور گھنٹے بجاتے تھے، تمام ملک میں ٹافوس کی آواز گونجتی تھی۔  
مسندروں میں بیت موجود تھے، ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی پس  
ان تمام حالات کو جو نہایت کثرت سے تھے، بھول جانا اور چند واقعات کو  
جو اس کے برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے پیش کرنا اور کہنا  
کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض نا انصافی ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی نسبت لکھے  
ہیں کہ وہ تمام انبیاء جب کہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں  
تو ابتداء میں عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں، اگر وہ مخالفوں  
سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا  
وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا! اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر  
بعد حضرت مسیح کے اس کے لیے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اس کے پیروں  
کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اس کو ترقی دی گئی۔ قرآن  
میں نہایت عمدہ اور بالکل سچ بات خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ۔  
دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَيْنَهُمْ بَعْضُ لَهُمْ مَصَاصِعَ دَبِيحٍ وَصَلَوَاتٍ وَمَسْجِدًا يُرْتَدُّ  
رَفِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ا یعنی اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھادی  
جائیں عیسائیوں اور درویشوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی  
مسجدیں جن میں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے، پس یہ کہنا کہ انبیاء کو ایسی  
لڑائیاں نازیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا  
ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی



اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں، مگر حضرت مسیح نے سب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا اور صرت ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے، ان کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا اس کے بعد اگر اس کے (یعنی دین مسیحی کے) ایسی حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر کے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلعم کو رومانی بادشاہی کے سوا سیلان جس سلطنت کے انتظام میں داخل ہونے میں بہت بڑی مجبوری تھی، عرب میں بادشاہت کا وجود نہ تھا، ہر ایک قبیلے کا سردار ان کا حکم ہوتا تھا اور جس کو سب لوگ بڑا سمجھتے تھے اس کو مجبوری افسر بننا اور تمام ملکی انتظام کرنا لازم تھا جبکہ تمام قبائل رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے تو امکان سے خارج تھا کہ وہ لوگ سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو اپنا سردار تسلیم کرتے اور تمام معاملات ملکی سبباً آنحضرت صلعم کے حکم کے اور کسی کے حکم سے تعمیل پاتے۔ پس ہر بات پر انصاف سے غور کرنا چاہیے نہ تعصب سے۔“

سر سید کی ان تمام تحریروں کا جو کہ انھوں نے جہاد کے متعلق ۱۸۵۷ء سے لکھی شروع کی تھیں اور جن کا تفسیر القرآن پر خاتمہ ہو گیا، یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سے منصف مزاج انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ دین اسلام میں جبراً مسلمان کرنے اور کفار سے عموماً جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے، چنانچہ سب سے پہلے اواخر ۱۸۶۱ء میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عربی طا

حاکم نے ڈاکٹر منیٹر کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جہاد انزروئے  
اصول اسلام اُن لوگوں کے مقابلہ میں ہونا چاہیے جو صریح کافر ہی نہیں بلکہ  
تعمیل شرائط اسلام میں مزاحمت بھی کرتے ہوں۔ الذین کفروا وصدوا عن  
صیل اللہ جہاد کی شرط ضروری یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے احکام اسلام کی  
تعمیل میں مسلمانوں پر جبر و تعدی یا مزاحمت ہوتی ہو..... اور جبر اور تعدی و مزاحمت  
جو وجوب جہاد کے لیے شرط ہے وہ بھی معاملات یا بھی میں معتبر نہیں بلکہ  
معاملات مذہبی میں ہونی ضرور ہے..... مسلمان جو انگریزی عملداری کے نکل حمایت  
میں رہتے ہیں جہاد کے باب میں اُن کو شریعت نے ایسی سخت قیود کے ساتھ  
جکڑ رکھا ہے کہ جب تک وہ تمام شرائط نہ پاس نہ جائیں جہاد پر اقدام نہیں  
کر سکتے حالانکہ انگریزی عملداری میں ان میں سے کوئی شرط بھی پائی نہیں جاتی بلکہ  
نی زمانہ مسلمانوں کو وہ امن حاصل ہے۔ جو پیغمبر صاحب اور ان کے ہمراہیوں  
کو سچائی نظرانی فرمانروائے امینیا کی حمایت میں حاصل تھا پس جنت تک  
اس طرح کا امن باقی ہے بغاوت کو ایک شرعی گناہ سمجھا جائے گا۔

سٹرٹی ڈبلیو آرٹلڈ جو ایک نہایت سچے اور منصف مزاج عیسائی ہیں،  
انہوں نے تو اپنی کتاب پر سچنگ اون اسلام میں (جو ابھی شائع ہوئی  
ہے) اس بحث کا بالکل فائدہ کر دیا ہے کہ قرآن کی رو سے غیر مذہب والوں  
کو بروز شمشیر مسلمان کرنے کا حکم ہے یا بذریعہ وعظ و نصیحت کے! اور اگر  
ہمارے قبائس غلط نہ ہوتے تو اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ جن اسباب سے  
پروفیسر ممدوح کے دل میں پر سچنگ اون اسلام پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا  
ہوا اور اس میں کامیابی کی امید بہت دھی اُن میں ایک بڑا محرک سرسید کی  
تحریرات کا مطالعہ تھا۔

## مثال ۲

معراج کے مسئلہ پر بھی سرسید نے تفسیر میں نہایت مفصل بحث کی ہے جو ان سے پہلے کسی مفسر نے نہیں کی۔ معراج جسمانی پر جو عیسائی یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ عقل کے بالکل خلاف ہے اس کے الزامی جواب انزالہ الاوامام وغیرہ میں عبدعشیق و محمد جدید کے حوالوں سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مگر یہ جو بات ان لوگوں کے لیے کافی نہ تھے جو تورات و انجیل کو نہیں مانتے یا بالکل قبیح مذہب سے آزاد ہیں اس لیے ضرورت تھا کہ معراج کے سوال پر محققانہ بحث کی جائے اور معراج کی حقیقت جو قرآن و حدیث سے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے اس کو ظاہر کیا جائے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر کے ہم صفحہ میں نہایت بسط کے ساتھ بحث کی ہے مگر ہم اس موثقہ پر صرف اس کا لُب باب بیان کریں گے جن کو تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ اصل تفسیر کو ملاحظہ کریں۔

انہوں نے ان تمام روایتوں میں سے جو معراج کے متعلق حدیث اور سیر کی کتابوں میں قلمبند کی گئی ہیں، غالباً کوئی روایت باقی نہیں چھوڑی اور چونکہ ان روایتوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی اور مصنفین کی روایت میں ایسا اختلاف ہوگا۔ اس لیے معراج کے تمام جزئیات کے متعلق جس قدر اختلاف ہیں ان سب کو اول جدا جدا بیان کیا ہے مثلاً اس بات میں اختلاف کہ معراج کب ہوئی؟ یا یہ کہ معراج اور اسراء (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے) ایک واقعہ تھا یا دو جدا جدا گانہ واقعات تھے؟ یا معراج ایک دفعہ ہوئی یا دو دفعہ؟ یا معراج جسد کے ساتھ بیداری میں ہوئی یا روح کے ساتھ رؤیا میں؟ غرض

اسی کے بے شمار اختلافات جو روایات متعلقہ واقعہ معراج میں پائے جاتے ہیں ان سب کو مع ہر ایک روایت کے بیان کیا ہے۔ پھر ان اختلافات کے اسباب اور وجوہ جو قریب قیاس تھے، بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ معراج اور اسراء، درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ امتداد سے اخیر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا اور اس دعوے پر پانچ دلیلیں لکھی ہیں جن میں سے پہلی دلیل گویا اس شب کا جواب ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جس میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانا بیان ہوا ہے اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو خواب میں جانے پر دلالت کرتا ہو۔ سو اس کے جواب میں انھوں نے سورہ یوسف کی یہ آیت کہ ”إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كُوكَبًا“ اور صحیح مسلم کی چند حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کوئی لفظ خواب پر صراحتاً دلالت نہیں کرتا حالانکہ سب کے نزدیک ان میں خواب کا بیان ہے۔ دوسری دلیل میں سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کی ہے۔ ”كَفَا جَعَلْنَا الزُّرُومَاتِ أَرْبَابًا لِّمَنْ لَا يَفْقَهُ لِلنَّاسِ رِيعًا“ ہم نے نہیں گروانا اس خواب کو جو تجھے دکھایا مگر ایک امتحان لوگوں کے لیے، قطع نظر اس کے کہ یہ آیت اسی سورہ بنی اسرائیل میں واقع ہوتی ہے جس میں اسراء کا ذکر ہوا ہے صحیح بخاری سے دو حدیثیں عبد اللہ بن عباس کی نقل کی ہیں جن میں صاف صاف اس بات کی تصریح ہے کہ جس روایا کا اس آیت میں ذکر ہے وہی روایا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلیۃ الاسراء میں دکھایا گیا۔ تیسری دلیل میں بخاری اور مسلم سے مالک ابن معصمہ اور انس ابن مالک کی روایتیں نقل کی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ معراج کے وقت آپ سوتے تھے جو تھی دلیل یہ لکھی ہے کہ منجملہ صحابہ کے معاویہ، جابر، خدیجہ بن الیمان اور حضرت

عائشہؓ کا یہ مذہب تھا کہ معراج خواب میں واضح ہوئی ہے نہ پیداری میں  
 پانچویں دلیل موافق اصول علم حدیث کے یہ کھسی ہے کہ جب عقل اور نقل  
 میں بظاہر اختلاف پایا جائے تو نقل کے معنی اس طرح بیان کرنے چاہئیں  
 جو عقل کے مطابق ہوں اور بڑے بڑے علماء مثل امام سخاوی، ابن جوزی، ابوبکر  
 بن الطیب وغیرہ ہم کے اقوال اس باب میں نقل کیے ہیں کہ حدیث کے  
 موضوع ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشان یہ ہے کہ اس کا مضمون عقل  
 باحس و مشاہدہ کے خلاف ہو اس دلیل کے ذیل میں ایک لطیف بحث  
 اس مضمون پر کی ہے کہ حدیثیں جو کتب احادیث میں جمع کی گئی ہیں ان کے الفاظ  
 بعینہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ ماولویں کے الفاظ ہیں  
 جو اصحاب نے اپنی سمجھ کے موافق بیان کیے ہیں اور اس کے ثبوت میں تابعین  
 و تبع تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے حسن اور سفیان ثوری کا یہ قول  
 ہے کہ اگر ہم حدیث اسی طرح بیان کرنی چاہیں جس طرح سنی ہے تو ایک  
 حرف بھی نہ بیان کر سکیں۔ غرض کہ اس مطلب کو نہایت خوبی سے ثابت  
 کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معراج کی حدیثوں میں جس قدر واقعات  
 عقل کے خلاف پائے جاتے ہیں ضرور ہے کہ ان کی ماویل عقل کے مطابق  
 کجھائے یہ کہ جن روایتوں سے معراج کا خواب میں ہوتا پایا جاتا ہے ان کو  
 تاویلات بعیدہ اور کٹیکہ اور دلائل فرضیہ و دلالت کار سے ایسا واقعہ بنا دیا جائے  
 جو حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہو۔

## تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ اس میں ہر خلاف قدیم

تفسیروں کے روایات کی طرف بغیر سخت ضرورت کے بہت ہی کم رجوع کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے قدیم تفسیریں با اتفاق تمام محققین اہل اسلام کے عموماً بے سند اور موضوع و ضعیف حدیثوں اور مہود لیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور اس کا ایک پدمیہ ثبوت یہ ہے کہ جس قدر روایتیں تفسیر القرآن کے متعلق صحاح میں وارد ہوئی ہیں اگر ان سب کو بعد حذف اسناد کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو تمام مجموعہ معدود صفحات سے زیادہ نہ ہوگا حالانکہ کتب تفسیر کی روایتوں اور قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے۔

اگرچہ روایات کے باب میں مفسرین کی لیے احتیاطی اور عدم مہالانت قدیم زمانہ میں بھی قابل الزام تھی لیکن اس زمانہ میں جبکہ ہر مذہب پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہے اور الحاد و دہریت کا ہر طرف زور شور ہے، ایسی روایتوں اور قصوں اور سو پے نیچرل افسانوں کو تفسیروں میں درج کرنا صرف یہی نہیں کہ اسلام کو مخالفین کے اعتراضوں کا نشانہ بنایا ہے بلکہ خود مسلمان نوجوانوں کو جو اس زمانہ کے علوم کی تعلیم پاتے ہیں اسلام سے بدگمان بلکہ متنفر کرتا ہے۔

## چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں برخلاف اکثر قدیم تفسیروں کے ہر ایک آیت کی تفسیر کے متعلق تمام اقوال مختلفہ نقل کر کے ناظرین کے ذہن کو پریشان نہیں کیا گیا بلکہ جو قول براہِ معلوم ہوا صرف اس کو ذکر کیا گیا ہے اور باقی سب جوج اقوال کو یا تو بالکل ذکر نہیں کیا اور یا بشرط ضرورت ہر ایک قول میں جو کمزوری یا ضعف دیکھا اس کو بھی



بیان کر دیا ہے۔ آج کل ایسی تفسیریں جن میں قرآن کے معنی معین نہیں کیے جاتے اور ایک ایک آیت یا ایک ایک لفظ کی شرح میں متعدد احتمالات اور مختلف اقوال نقل کیے جاتے ہیں، ان لوگوں کے دل میں جو مذہب کو مروی چیز نہیں سمجھتے اور تقلید کی قید سے آزاد ہیں بجائے اس کے کہ مفسر کے تبحر اور اعظم علمی کا نقش جہاں تک ممکن ہے کہ دوسری قسم کے خیالات پیدا کریں اور جس کتاب کی نسبت خدا نے یہ فرمایا تھا کہ "لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" اس میں بے شمار اختلافات دیکھ کر طرح طرح کے شکوک و شبہات میں پڑ جائیں پس اس وقت زمانہ کا اتنا ہرگز یہ نہیں کہ آیات قرآنی کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مختلف رائیں بیان کر کے ان کو اسی طرح غیر منفصل چھوڑ دیا جائے اور قرآن کے معنی معین نہ کیے جائیں۔

## پانچویں خصوصیت

پانچویں سب سے بڑی اور سحرگتہ الٰہیہ خصوصیت اس تفسیر کی جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے، یہ ہے کہ اسلام میں جہاں تک کہ معلوم ہے سب سے پہلی کوشش ان شبہات کو رفع کرنے کے لیے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے قرآن مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے اس تفسیر میں کی گئی ہے۔ اس باب میں جو کوششیں بلوغ سرسید نے کی ہے اس کا پورا پورا اندازہ بغیر اس کے کہ ان کی تفسیر کو اول سے آخر تک دیکھا جائے، کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ اس میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صدہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص صول کے موافق بیان کیے گئے ہیں اس لیے ممکن نہیں

کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہونی ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی نازل نہیں ہو سکتی بلکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمام تفسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوب قرآن اور اصول عربیت کے موافق ایسے بیان کیے گئے ہوں جن کی رو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے یقیناً رفع ہوتا ہے ہو تو گو وہ معنی تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے نہ لکھے ہوں، بلاشبہ تسلیم کرنے کے قابل ہیں۔

اگرچہ ہمارا ارادہ جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے اس تفسیر کی تذکرہ بالا خصوصیت پر مفصل بحث کرنے کا تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے جس کی ایک یا دو گرافی متحمل نہیں ہو سکتی اس کے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں ہوتی اس لیے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھیں گے اس کو کسی باوقعت میگزین کے متعدد نمبروں میں فرماؤقتاً شائع کیا جائے گا۔

# ریفارمیشن اور اسکانڈنا

ظاہر ہے کہ سرسید نے اپنی تصنیفات اور عام تحریروں اور سبک اسپچوں کے ذریعہ سے اور نیز خود مثال بن کر قوم کے پولٹیکل اور سوشل خیالات اور خاکساروں اور لٹریچر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور اس لئے ان کو قوم کا پولٹیکل سوشل اور لٹریچر ریفارمر کہا جاسکتا ہے، لیکن اس مقام پر ریفارمیشن سے ہماری مراد قوم کے مذہبی خیالات کی اصلاح ہے جو فی الواقع ایک نہایت سخت دشوار کام تھا اور جس کی وجہ سے اس قوم کے فدائی کو کافر و جال محمد اور مرتد سب کچھ کہا گیا۔

اگرچہ سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کی پولٹیکل اور سوشل حالت کا درست کرنا تھا لیکن چونکہ مسلمان اپنے مذہب کو ہمیشہ سے دین اور دنیا دونوں کا رہبر سمجھتے رہے ہیں اور کسی بات کو خواہ دینی ہو خواہ دنیوی جب تک کہ اس کا ثبوت مذہب کی رو سے نہ دیا جائے تسلیم نہیں کرتے اور نیز مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کو بہت کچھ تعلق ان کے مذہب کے ساتھ تھا، اس لیے سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اخیر دم تک برابر مذہبی مباحث میں مشغول رہنا پڑا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح ہر مذہب میں جس قدر کہ بانی مذہب کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے اسی قدر بہت سی باتیں جن کو اصل مذہب میں چنداں دخل نہیں ہوتا داخل ہوتی جاتی ہیں اسی طرح دین اسلام میں رفتہ رفتہ بہت سے امور ایسے شامل ہو گئے جو درحقیقت دین کی ذاتیات سے خارج تھے، مثلاً اصول عقائد میں صد ہا مسائل ایسے داخل کر دیے گئے جن کا اصل اسلام میں کوئی پتہ نہ تھا مگر اب وہی علم جس میں ان مسائل پر بحث کی جاتی ہے منجملہ علوم وینہ کے ایک نہایت مہتمم بالشان علم ہوسوم بہ علم کلام سمجھا جاتا ہے۔ یا مثلاً

فروع میں بے شمار جزییات جن کی بنیاد محض قیاس پر ہے، مثلاً نصوص کتاب و سنت کے واجب التسلیم سمجھی جاتی ہیں۔ مفسرین کی رائیں اور ان کے اقوال جو انھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر میں بیان کیے ہیں وہ بھی مثل آیات قرآنی کے واجب الادغان مانے جاتے ہیں۔ اصول فقہ جو بڑے بڑے مفسرین نے ایک وسیع علم بن گیا ہے، وہ بھی دینیات میں ایک نہایت ضروری علم شمار ہوتا ہے۔ جس قدر طب و یا سبب و یا دین اور بے سرو پا قصے کتب تفسیر و سلوک و سیر میں درج کیے گئے ہیں وہ سب بغیر اس کے کہ ان کو اصول تنقید کے موافق جانچا جائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں صحاح میں جو حدیثیں امت کی اصلاح معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جن کی آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "انتم اعلما با ما وردینا کم" وہ بھی ان حدیثوں کی طرح جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں تعلیم دین میں شمار کی جاتی ہیں اس کے سوا جب متعدد فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے تو بہت سے خیالات و ذرائع کار اپنے اپنے مذہب کی طرفداری اور تعصب کی وجہ سے بر مذہب کے اجزائے غیر منفق بن گئے، پھر جہاں اسلام پہنچا ان ملکوں کی اکثر رسمیں اور روایات اور اہل شدہ مذہب کے رنگ میں رنگے گئے اور اس طرح اسلام جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "المدین لیسر" ایک دفتر بے پایاں کا نام جو دائرہ حصر و احصا سے خارج ہے، قرار پا گیا اور ان تمام حشو و زوائد کا اصل دین سے جدا کرنا ایسا ہی مشکل ہو گیا جیسا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا۔ اگرچہ علم کلام و علم فقہ اصول فقہ اور تفسیر مسلمانوں کے لیے سرمایہ افتخار اور قوم کی اعلیٰ درجہ کی داعی اور ذہنی قابلیت کے نہایت روشن ثبوت ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ دین اسلام کو ان سے بے انتہام دہمپنی ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دینیات میں ان کو کتاب و سنت کے برابر درجہ دیا جائے ورنہ ضرور ہے کہ عربی

صرف و نحو و معانی و بیان و لغت کو بھی دینیات میں وہی درجہ دیا جائے جو علوم  
مذکورہ بالا کو دیا گیا ہے کیونکہ اسلام کو ان علوم سے بھی کچھ کم مدد نہیں پہنچی۔

اگرچہ اسلام کے ہر طبقہ اور ہر دور میں ایسے آزاد طبع اور روشن ضمیر لوگ  
ہمیشہ اٹھتے رہے ہیں جنہوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر میدان تحقیق میں قدم رکھا ہے  
اور بڑے بڑے مہتمم بالشان مسائل کے متعلق مذہب جمہور کی غلطیاں ظاہر کی ہیں  
لیکن چونکہ وہ زمانہ اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا تھا اور مقررین  
اسلام کی زبانیں آج کل کی طرح کھلی ہوئی نہ تھیں لہذا جو ضرورتیں اسلام کو موجود زمانہ  
میں پیش آئیں ان سے وہ بزرگ بالکل بے خبر تھے۔ اس کے سوا ممالک اسلامیہ  
میں علمائے اسلام کو یہ آزادی نہ تھی کہ بادشاہ محضت کے مذہب کے خلاف کئی بات  
بیجا کانہ زبان سے نکال سکیں اس لیے علمائے سلف میں کسی ایک شخص نے عام  
اصلاح کا کبھی ارادہ نہیں کیا، کسی نے احادیث کی تنقید کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا  
اور ان کے جانچنے کے قواعد مقرر کیے، کسی نے شریع اور مصالح میں تفرقہ کیا اور  
جو حدیثیں شریع سے متعلق تھیں ان کے لیے الگ اور جو مصالح سے متعلق تھیں  
ان کے لیے الگ وجہ قرار دیا، کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا، کسی نے اجماع  
اور قیاس کے حجت ہونے سے انکار کیا، کسی نے آیات متشابہات میں تاویل کرنے  
کی راہ کھولی، کسی نے مفسرین و واعظین کے لیے سرو پا قہقروں اور بے سند روایتوں  
کی بے اعتباری ظاہر کی، کسی نے آیات منسوخہ کو جن کی تعداد پانسو تک پہنچ گئی تھی  
بلکہ حصہ واحصا سے خارج ہو گئی تھی، بیس سے بھی کم میں محدود کیا، کسی نے مشکلمین  
کے منطقیانہ استدلال و توجیہات کو جو کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی نصرت  
و حمایت کے لیے آیات قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصد شائع کے خلاف  
ثابت کیا، کسی نے نعم و تشدد و یرود و قدح کی کسی نے شرک و بدعت کے

استیصال پر کمر باندھی اسی طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خواہیوں کی اصلاح ہوتی رہی مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ خاص اسلام کی تعلیم قرآن مجید اور حدیث صحیح میں منحصر ہے باقی جو کچھ ہے وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے نہ اسلام اس کا جواب دہ ہے اور نہ مسلمان اس پر اعتقاد رکھنے کے مکلف ہیں۔

سر سید نے، اگر غور کر کے دیکھا جائے، تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صدائیں اہل اسلام کی تصنیفات میں فروا فر دأصرت عنبط تحریر میں آتی تھیں اور اس کا بر علماء کے سوانہ سے کسی کو اطلاع نہ تھی، سر سید نے ان سب کو ایک ہی بار خاص و علم پر علی الاعلان ظاہر کر دیا، کیونکہ جو صورتیں اس وقت خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہو سکتی تھیں مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے جا چکی تھی اور قومی تعصبات، جو بعد سلب حکومت کے مفلوج قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں، مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور ان کا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا، مسلمانوں سے جو بری بات سرزد ہوئی تھی وہ ان کے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی، فقہاء کے فتوے جو مسلمانوں کی ذمہ داری تھی اس کے مانع تھے، اکثر انھیں قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمان ان کو وحی منزل کی طرح دل و جان سے قبول کرتے تھے، عیسائی مشنری مسلمانوں کی سیر اور تاریخ کی کتابیں اور ان کی تفسیریں دیکھ دیکھ کر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو ان کا جواب دہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مردوجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھ



دیکھ کر اسلام کی خالص تعلیم سے جو کتاب و سنت میں منحصر ہے بد اعتقاد ہونے لگے تھے، اور یہ تمام حالات اس بات کے مقضی تھے کہ خالص اسلام میں اور ان چیزوں میں جو اسلام میں مل کر اس کی ذات میں داخل ہو گئی ہیں امتیاز قائم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ سرسید نے اپنی ریفاہ مشین میں ان اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں، بہت ہی کم شجاذ کیا۔ سب سے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زائد حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلاحوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خیر متواتر اور غیر مشہور کے سوا جن کی تعداد کتب احادیث میں نہایت قلیل ہے۔ جو حدیثیں خیر احاد کہلاتی ہیں اور جن سے صحاح ستہ اور تمام احادیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں مفید یقین نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے اور اس اصول سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خیر واحد بشرطیکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جائے، اس پر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اس پر اعتقاد رکھنا ضرور نہیں اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضرور نہیں سرسید نے اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے، ان کی یہ رائے ہے کہ جب خیر واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خیر واحد کی رو سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی سنخواہی اس خیر کو تسلیم کر لیا جائے اور بعد تسلیم کرنے کے اس اعتراض کے جواب میں صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ خیر واحد مفید یقین نہیں اور اس لیے جو اعتراض اس کی رو سے وارد ہوتا ہے۔ اسلام اس کا جواب دہ نہیں ہے۔ یہ رائے صرف سرسید ہی کی نہیں بلکہ ان سے پہلے بھی علمائے اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا۔

ہے۔ امام رازی سے فرقہ حشویہ کے ایک شخص نے اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی کہ "ناکذب ابواہیم الاثلث کذبات" (یعنی ابراہیم نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا "بہتر ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کی جائیں" اس نے بطور تعجب کے کہا "اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو سادویوں کی تکذیب لازم آئیگی" امام نے کہا "اے مسکین اگر ہم قبول کہیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور اگر اس کو نہ مانیں تو سادویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ابراہیم ؑ کو جھوٹ سے بچانا بہتر ہے یہ نسبت اس کے کہ چند مجاہدین کو جھوٹ سے بچایا جائے۔

یاشلاً اول اول سلف صالح آیات تشابہات کی تاویل بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے پھر جب یونانی فلسفہ کا اسلام میں رواج ہوا اور آیات تشابہات کے ظاہری معنوں پر جو کہ علمائے اسلام بیان کرتے تھے، ملاحظہ اور مخالفین اسلام نکتہ چینی کرنے لگے تو علماء کو تشابہات کی تاویل کرنی پڑی مگر نہایت محدود آیتیں تھیں جن کے حقیقی معنوں پر اس زمانہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے اس لیے صرف وہی آیتیں مجازی معنوں پر محمول کی گئیں، اب چونکہ زمانہ علم و حکمت کی ترقی کا ہے اس لیے سرسید نے تاویل کو انھیں آیتوں میں محدود نہیں رکھا بلکہ اور بہت سی آیتوں کو چھپا کہ دوسری جگہ ہم نے مفصل بیان کیا ہے مجاز و استعارہ و تمثیل پر محمول کیا ہے۔

یاشلاً آیات نسخہ کی تعداد پہلے پانچ سو سے بھی زیادہ مانی جاتی تھی، پھر جیسا شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے۔ سیوطی وغیرہ نے ان کو بیس میں محصور کیا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے نسخہ کو صرف پانچ آیتوں میں محدود کر دیا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ آیات نسخہ کی تعداد پانچ سو سے گھٹتے گھٹتے

پانچ پندرہ گنی تو ان کو یقین ہو گیا کہ قرآن مجید میں نسخ حقیقی بالکل واقع نہیں ہوا اور قرآن کی جس آیت سے مفسرین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے کی نسخ و منسوخ ہیں اس آیت کا سیاق و سباق، جیسا کہ خطبات احمدیہ میں مفصل مذکور ہے، صاف دلالت کرتا ہے کہ وہاں نسخ سے مراد شرایح سابقہ کا قرآن سے منسوخ کرنا ہے نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا پس جیسا بیوں کا اعتراض جو کہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ نسخ پر کرتے ہیں، قرآن مجید پر وارد نہیں ہوتا

یامثلہ لکلمحقیقین نے فروع میں تقلید شفیعی کو اس بنا پر ضروری نہیں سمجھا کہ حق چاروں مذہبوں میں دائرے مگر سرسید جس طرح تقلید کو فروع میں ضروری نہیں سمجھتے اسی طرح اصول میں بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جس بنا پر حق چاروں مذہبوں میں دائرہ سمجھا گیا ہے۔ اسی بنا پر اُس کو اشاعرہ اور معتزلہ اور دیگر فرق اسلامیہ میں بھی دائرہ سمجھنا ضروری ہے۔ اور اسی وجہ سے انھوں نے اکثر اصولی مسائل میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔ اس رائے میں بھی سرسید متفرد نہیں بلکہ اگلے محققین اہل سنت نے بھی اکثر مسائل میں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالی پر لے مے ہوئی تو انھوں نے ایک رسالہ موسوم بہ تفرقة بین الاسلام والزندقة لکھا جس میں اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ "وہ مذہب اشاعرہ سے الگ ہونے کو گو کہ وہ بالنت بھر ہی کیوں نہ ہو، اور اُن کے خلاف کرنے کو، گو کہ وہ ذرا سی چیز ہی میں کیوں نہ ہو، مگر ہی جانتے ہیں۔" مگر چونکہ امام غزالی کے وقت میں سلطنت کی طرف سے علما کو پوری مذہبی آزادی نہ تھی اس لیے انھوں نے چند جزوی باتوں کے سوا اشاعرہ کے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن سرسید بلا تفسیر جس مسئلہ میں اختلاف کی ضرورت سمجھتے ہیں اشاعرہ کے اصول سے

اختلاف کرتے ہیں۔

الغرض سرسید کی اصلاحات کو جہانگیر دیکھا جاتا ہے اُن میں بہت ہی کم اصلاحیں ایسی ہوں گی جن کی اصل محققین اہل اسلام کی تصنیفات میں موجود ہے البتہ اگلے محققین کی اصلاحیں اسی حد تک محدود رہیں جہانگیر کہ اس زمانہ کی حالت اور ضرورت مقتضی تھی اور سرسید کی اصلاحات میں موجودہ زمانہ کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

سرسید کی ریفارمیشن کا منشاء جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، یہ سرگز نہ تھا کہ وہ اسلام میں ایک نیا فرقہ قائم کریں اور خود اُس فرقہ کے سرگروہ بنیں۔ وہ جس طرح نبی کے سوا کسی امام یا مجتہد یا اور کسی اُمّی کے مقتدا بنانے کو شرک فی النبوۃ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی طرح خود کسی فرقے کا مذہب پیشوا بننے کو اشتراک فی النبوۃ سمجھتے تھے چنانچہ لاہور میں جو انہوں نے اسلام پر کچھ دیا تھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "سیری یہ خواہش نہیں ہے کہ کوئی شخص، گو وہ میرا کیسا ہی دوست سے دوست ہو، میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں، جو خدا اور بندوں کے درمیان ولی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جس کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا انزل مذہب خدا ایدہ الا بالذمک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھے گا، کیونکہ جیسا وہ انزل ہے ابدی بھی ہے) ختم ہو گیا۔" پس ان کا سرگز یہ مطلب نہ تھا کہ لوگ اُن کی پیروی کریں اور اُن کو اپنا مذہب پیشوا جانیں بلکہ اُن کی ریفارمیشن کا اصل مقصد صرف مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مواقع کو دوسرا کرنا اور عیسائی قوموں کے اعتراض کو دفع کرنا تھا کہ "اسلام ترقی اور شائستگی کے ساتھ





سرسید کی نسبت یہ اعتراض اکثر سنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدد و مذہب ایسا شخص کیونکہ ہو سکتا ہے جو علوم مُرَوِّجِہِ اسلام میں متوسط درجہ سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ اعتراض اُس شخص کی نسبت زیادہ موزوں ہو سکتا ہے جو علوم سر و جبہ اہل اسلام میں کمال حاصل کرنے کے بعد مصلح یا مجدد و مذہب بننے کا دعویٰ کرے۔ انسان جس مذہب کی سوسائٹی میں پرورش بنھاتا ہے، اس مذہب کے ساتھ اس کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے، پھر جب اسی مذہب کی تعلیم پاتا ہے تو وہ مدورہ پرورہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ تعلیم کمال کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ تو اس مذہب کی تقلید اور اس کا تعصب اس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور کسی بات میں خود غور اور تحقیق کرنے کی مطلق قابلیت باقی نہیں رہتی، اگر مثلاً حنفی مذہب کی تعلیم اُس کو ہوئی ہے تو اس کے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس مذہب میں کوئی غلطی ہوگی، یہ اصول بھی کہ حق چاروں مذہب میں داخل ہے، محض تقلیداً مانا ہے کیونکہ عملاً حنفی مذہب کے ایک مسئلہ میں بھی غلطی کا ہونا اس کے نزدیک محال معلوم ہوتا ہے، باوجودیکہ بخاری کو صحیح الکتب بعد کلام اللہ جانتا ہے مگر بیسیوں حدیثیں جو اُس میں صریح حنفی مذہب کے خلاف ہیں ان کو قابل عمل نہیں سمجھتا، ایسا شخص بلاشبہ کسی مذہب کا مصلح یا مجدد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ منصب اس شخص کا ہے جو حق و باطل اور خطا و صواب میں تمیز کر سکتا ہے، ہر ایک امر پر غور کرتا ہے اور جو بات صحیح جانتا ہے پھر جب اس میں غلطی معلوم ہوتی ہے تو اسی بات کو غلط قرار دیتا ہے، یہ ممکن ہے کہ وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط سمجھ جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس بات کو غلط جانے اس کو وہ بنا کی شرم یا اعتراض کے خوف سے صحیح کہے جائے۔ مصلح یا مجدد کو علوم سر و جبہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے کہ حق بات



کے کہنے میں لومہ لائم سے نہ ڈرے کیونکہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو صدائیں محققین کی تحقیقات میں موجود ہیں اور تقلید نے ان کی طرف سے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، ان کو علی الاعلان ظاہر کرتا ہے۔

سرسید میں ابتداء سے وہ تمام خاصیتیں جو ایک مصلح یا مجدد یا رہبر یا مہر میں ہونی ضروری ہیں، موجود تھیں۔ ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ حق کی تلاش میں گزرا، کبھی صوفیت کا رنگ چڑھا کبھی وہابیت کا زور شور رہا، کبھی غیر مقلدی کی لے بڑھی اور آخر کو تمام جستجو اور تلاش اس نتیجہ پر آ کر ختم ہو گئی کہ الاسلام هو الفطرۃ والفقیرۃ هو الاسلام یعنی لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید کے مذہبی خیالات میں اس قدر شبہ لیبوں کا ہونا ان کے متکون مزاج ہونے کی دلیل ہے مگر یہ ان کی نادانی ہے۔ حق بات تک ہمیشہ اسی طرح بتدریج رسائی ہوتی ہے، ابراہیم خلیل اللہ نے چیلے ستارے کو پھر چاند کو اور پھر سورج کو اپنا رب سمجھا تب اس نتیجہ پر تک پہنچے کہ "انی وجمعی وجمی للذی نظر السموات والارض حنیفا وانا من الشکرین" محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر وہ عقبات پیش نہ آتے جو حق تک پہنچنے سے پہلے پیش آتے ہیں تو قرآن میں آپ کی نسبت یہ ارشاد نہ ہوتا کہ "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ" جب انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہوتا اور لوگ جو طالب حق ہیں، جب تک کچھ دنوں اوہرا دھر ڈالوں ڈول نہ پھر میں کیونکہ ایک ہی جہت میں منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں! ہاں جو لوگ تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھنا نہیں چاہتے اور جن کا یہ قول ہے کہ "انَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰى اٰمَةٍ وَاَنَا عَلٰى اٰمَانِهِمْ مُّقْتَدِرُونَ" ان کو کچھ دشواری نہیں ہے انہوں نے جس یگ پر اگلوں کو چلنے دیکھا ہے اسی پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔

بہر حال اگر سرسید مشرقی تعلیم کی اس صدمے آگے بڑھ جاتے جس پر ان کی تعلیم آ کر ٹھیر گئی تو تقلید کے پھندے سے ناز لیست ان کا چھٹکارا ہونا دشوار

تھا۔ پس علوم و سب کی تکمیل بجائے اس کے کہ اُن کے کام میں کچھ مدد دیتی، وہ تمام قدرتی قابلیتیں جو اُن کی طبیعت میں رکھی گئی تھیں بالکل فنا کر دیتی اور جسیں دلیری اور آزادی سے انھوں نے ریفارمیشن کا کام انجام دیا اس کا حوصلہ اُن میں مطلقاً باقی نہ رہتا۔

وہ ایک خط میں جو انھوں نے ۱۲۸۹ء میں سید مہدی علی خاں کو لکھا تھا لکھتے ہیں ”میرے پیارے مہدی! میں ہمیشہ آپ کو کہا کرتا ہوں کہ جو خواب اثر مشرقی طریقہ تعلیم کا انسان کے دل اور طبیعت پر مڑتا ہے اس سے آپ کبھی ایمن نہ رہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ بنی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہی محض رکھنے میں کیا حکمت تھی! یہی حکمت تھی کہ نیچرل فیض جو اندرونی چشموں کا جاری رہتا ہے۔ اُس کو کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو اور جو کچھ باہر نکلے خالص بے میل ہو۔ پس ہمیشہ نیچر کے سرچشمہ کے جاری رہنے پر متوجہ رہا کر لیا اور جس علم کی نسبت کہا گیا ہے کہ ”العلو حجاب الاکبر“ اس کے پیرو ہرگز نہ ہوؤں۔“

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص مذہبی خیالات کی اصلاح کا دعویٰ کرے اس میں مذہبی تقدس جو علمائے دین کا شعار ہے، ضرور ہونا چاہیے۔ پس سرسید جیسا دنیا دار آدمی جو نماز روزہ تک کا پابند نہ ہو، اس منصب جلیل کے کیڑ کر لائق ہو سکتا ہے! سو اس اعتراض کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکے کہ مذہبی تقدس جو ہمارے علمائے دین کا شعار ہے۔ اگر سرسید کو یہ درجہ عالی حاصل ہو جاتا تو مسلمانوں کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کرنے کی اُن کو فرصت ملنی دشوار تھی، کیونکہ اُن کی تمام عمر کسی مسلمان فرقہ کار دیکھنے اور کسی کو کافر اور کس کو فاسق بنانے اور طبقات و وزخ کے تقسیم کرنے میں گذر جاتی اور اگر بالفرض اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا سچا جوش بھی اُن کے دل میں ہوتا تو بھی وہ اس قابل نہ ہوتے کہ اسلام کی

کچھ حمایت کر سکیں، یا مسلمانوں کے مصائب کا کچھ تدارک کر سکیں۔ یعنی اس بات کا سمجھنا ان کی طاقت سے باہر ہوتا کہ اسلام اور اہل اسلام کو کن مشکلات کا سامنا ہے اور ان مشکلات کا کیونکر مقابلہ ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مذہبی تقدس کی پہلی شرط یہ ہے کہ دنیا اور اہل دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔

بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ و علماء کی زمیں میں رہنا اور نہ بار و عباد کیسی زندگی بسر کرنا ان لوگوں کے لیے ضرور ہے جو مذہبی پیشوا کہلانے ہیں جیسے واعظین جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں یا مشائخ و اہل اللہ جو تہذیب و نفس و تصفیہ باطن کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ خود ان صفات کا عمدہ نمونہ نہ بنیں جو اوروں میں پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ان سے لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ خلاف اس شخص کے جو محض قوم کی اصلاح معاش کا ارادہ رکھتا ہوں ان کو تنزل کے گڑھے سے نکالنا اور ان کے تنزل کے اسباب اور ترقی کے موانع دریافت کرنے چاہتا ہوں، حکمران قوم کو جو اس کے ہم مذہبوں کی نسبت غلط فہمی ہو اس کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ علمی دنیا میں جو خیالات مذہب کی نسبت پھیل رہے ہوں ان سے آگاہی حاصل کرنے کی فکر ہے۔ ایسا شخص جب تک گوشہ عزلت سے نکل کر دنیا کے بیچوں بیچ زندگی بسر نہ کرے اور عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے نشیب و فراز اور گرم و سردی کی آزمائش میں نہ گوارے اور حاکم و محکوم دونوں کے خیالات سے واقف نہ ہو وہ کیونکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے؟

یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس علماء جو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے سبب دنیا کے حالات سے بے خبر ہیں، ان کی شخریں جو اس آئادہی اور تکتہ چینی کے زمانہ میں انھوں نے مذہب کے متعلق لکھی ہیں یا کہتے ہیں، وہ سبائے

اس کے کہ غیر قوموں کے ول میں اسلام کی نسبت من عین پیدا کریں اللہ دین کے مضحکہ کا باعث ہوتی ہے۔ پس اس زمانہ میں مذہبی مصلح جیسے کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح معاش اور اسلام کی حقیقت دنیا پر ظاہر کرنا ہو، اس شخص کے سوا جو دنیا واری کے لباس میں زندگی بسر کرے اور دنیا کے حالات سے باخبر ہو دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ایک مصلح مذہب میں اس مشہور مقولہ کے موافق کہ: "النظر الی ما قال کو کا تنظر الی من قال" مقتضائے عقل یہ ہے کہ بجائے افعال کے زیادہ تر اس کے اقوال کو دیکھا جائے مع ذلک ہم سرسید کے افعال اور اخلاق و عادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ و اہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں اور جن کو ہم آگے چل کے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے بلاشبہ وہ آخر عمر میں بسبب فرہی مضرت اور کبر سن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے لیکن اپنے تصور کا اعتراف کرتے تھے جس کی نسبت کہا گیا ہے: "الاصوات یهدم الا لتراک" حج اور زکوٰۃ کی ان میں کبھی استقامت نہیں ہوئی اور قرصن روپیہ لے کر جس طرح کہ انھوں نے لندن کا سفر کیا اس طرح سفر حج کرنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ بیسیوں عیب جو بڑے بڑے دینداروں اور پرمیتر گاروں میں دیکھے گئے ہیں ان سے یہ شخص بالکل پاک تھا اور امت کی غیر خواہی جس میں مخیر صادق نے تمام دین کو حصر کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "الدین البصیحۃ" اس میں تمام قوم سے سبقت لے گیا تھا۔ اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کے لیے زہد و تقدس کی نہیں بلکہ عقل اور استبدادی کی ضرورت تھی جس کی نسبت سرفاروق نے فرمایا ہے کہ: "لا تنظر والی صلوة امری ولا حیامہ و لیکن النظر والی عقلہ و صدقہ" دینی کسی کے نماز روزہ پر نظر نہ کرو بلکہ اس کی عقل اور سچائی کو دیکھو۔

## مذہبی مسائل میں علمائے سلف کے اختلافات

سرسید نے جن مسائل میں علمائے سلف سے اختلافات کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جن میں جمہور علمائے اہل سنت ان کے خلاف ہیں مگر محققین اہل اسلام میں سے اور لوگ بھی اُس طرف گئے ہیں دوسرے وہ جن میں سرسید بظاہر متفرد معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں۔

دونوں قسم کے مذکورہ بالا اختلافات کا منشا جیسا کہ ہم پہلے کر چکے ہیں یہ ہرگز نہ تھا کہ سرسید کوئی نیا فرقہ قائم کرنا اور خود اس فرقہ کا سرگروہ بننا چاہتے تھے، بلکہ یہ تمام اختلافات محض اس بات پر مبنی تھے کہ آج کل جو اعتراضات اسلام پر مخالفین اسلام کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں، یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ان کو رفع کیا جائے اسی لیے ہم ان تمام اختلافات کو اس عنوان کے ذیل میں درج کرنا چاہتے ہیں مگر جن دلائل پر یہ اختلافات مبنی ہیں ان کو سرسید کی تصنیفات میں دیکھنا چاہیے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر مسئلہ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہر ایک اختلاف میں انھیں کی رائے صائب ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے جو لوگ دین اسلام کے دوست ہیں اور اس کو ہر قسم کے

اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں ان سے امید ہے کہ مسیحیہ کے مندرجہ ذیل اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں ناقابل انتفاع نہ سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل مسیحیہ کے قائم کیے ہیں ان پر نہایت بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ غور کریں گے۔ ان کا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق اول اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہ کے رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اس کو رفع کیا جائے دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کیے بغیر وہ اعتراض یا شبہ رفع ہو سکتا ہے یا نہیں؛ تیسرے جس طریقے سے مسیحیہ نے اس کو رفع کرنا چاہا ہے اس طریقے سے اس کا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں؛ امید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے۔

اس وقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برعکس ہو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا۔ اس معیار نے جو نتائج مذاہب کے حق میں پیدا کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف متوجہ ہونی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب کے دست بردار ہوئی جاتی ہیں۔ عیسائیوں نے بائبل کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کار بند ہوتے تو ترقی کے میدان میں ان کا قدم رکھنا ناممکن تھا، برہمن سماج والوں نے ویدوں میں سے فقط وٹھالی اچھڑ پریم کے لیے لیے ہیں اور باقی کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہے۔ آسیہ سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اس کو نہ سنان و ہرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یورپ کے بڑے بڑے سکریٹ واں اور وید کے محقق



صحیح جانتے ہیں، پس درحقیقت انھوں نے بھی وید سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔  
 سرستید کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں آج الہامی مانی جاتی ہیں ان میں صرف  
 قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائق موجودات کے غلط  
 ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانعہ پس مسلمان عالموں کا اس بات  
 پر غور کرنا کہ جو کچھ سرستید نے اسلام کی غرض سے لکھا ہے اس کی اس زمانہ  
 میں فی الواقع ضرورت تھی یا نہیں اور اگر تھی یا نہیں اور اگر تھی تو سرستید کی تحریرات  
 سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں! کچھ ضروری نہیں ہے۔

اب ہم ان اختلافات کا خلاصہ لکھتے ہیں جن میں دیگر محققین اہل اسلام بھی  
 سرستید کے ساتھ شریک ہیں!

- ۱- اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔
- ۲- قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔
- ۳- تقلید واجب نہیں ہے۔
- ۴- قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ  
 نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورہ بقرہ کی  
 اس آیت سے کہ ما نستعین ایتہ او نُنشہا قرآن کی کسی آیت کا نسخ اور کسی  
 کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس کی بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے  
 بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے۔
- ۵- قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا، وہ جس طرح  
 اور جس قدر نازل ہوا تھا اسی قیدہ زناٹہ نزل سے آج تک محفوظ ہے اور  
 جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال  
 سے قرآن کا نازل ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و منقہ بنی ہیں۔

۶۔ صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو جب تک کہ اصولِ علمِ حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے قابلِ وثوق نہیں سمجھنا چاہیے۔

۷۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارجِ عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امّارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے وہ مراد ہے۔

۸۔ طیورِ مشفقہ جن کو نصارے نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے۔

۹۔ چونکہ خبرِ واحد میں احتمالِ صدق و کذب باقی رہتا ہے اس لیے جو اعتراض اخبارِ آحاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں اسلام ان کا جوابدہ نہیں ہے۔

۱۰۔ سوا اُن کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ "اغابینہا کفر اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم من ديارکم و ظاہرہ علی ما اخرجوکم ان تولوہم" تمام کفار و مشرکین سے دوستی و مواصلت کرنا جائز ہے۔

۱۱۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں تحریفِ لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ اُن کا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے

۱۲۔ ہر شخص اُن مسائل میں جو قرآن یا حدیثِ صحیح میں منصوص نہیں ہیں آپ اپنا

۱۳۔ یعنی عداوت کو منع نہیں کرتا مگر ان لوگوں کی دوستی سے جہنم سے دین کی ہابت لڑتے اور جہنم سے تمہارے

کو تہدے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکلنے پر اوروں کی مدد کی ۱۳

مجہد ہے۔

۱۳- حضرت ہاجرہ جو اسمعیل کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت بوٹھی تھیں بلکہ رقیون بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں اور رقیون نے ان کو صرف تربیت کے لیے حضرت ساما کے ساتھ کر دیا تھا۔

۱۴- وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبیہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔  
 ۱۵- قرآن کی کسی آیت سے حیر پر ادکسی سے فسق پر استدلال کرنا جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے مقصد شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے ان آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضبناک ہو کر یہ نہ فرماتے کہ ”اجھذ اوزکم امر بهذا ازولت“

۱۶- معراج اور شق صدر دونوں روایا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں کیا مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک اور کیا مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک۔

۱۷- اگرچہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فرد تر مخلوقات موجود ہے اسی طرح اس سے بالاتر مخلوقات جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو لیکن ملائکہ یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے جو مختلف قوی اپنی قدرت کاملہ سے مادے میں دلالت کیے ہیں، جیسے چہاروں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت جذب و دفع و امثال ذالک، انھیں کو ملائکہ یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۸- آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی

خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے۔ جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قسمت بہیمہ جو اس میں ودیعت کی گئی ہے اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔

۱۹۔ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔

۲۰۔ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کے صاف ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۱۔ آیت ”الذین اتیناھم الکتاب یعمرونہ کما یعرفون انہارہم“ میں جو ضمیر مفعول لفظ یغرفونہ میں ہے وہ، جیسا کہ عام مفسرین کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے۔ تنویر قبلہ کے معاملہ کی طرف پھرتی ہے۔ جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ آیت میراث سے وصیت کا حکم، جو آیت وصیت میں والدین اور دیگر ہر شے کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا، پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے۔

۲۳۔ جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیت ”وعلی الذین یطیقونہ فلیہ طعام مسکین“ کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علماء فدیہ کی اجازت کو فاکر عمر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، مگر سرسید کے نزدیک یہ حکم عموماً ان سب لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڑھے ہوں اور خواہ جواں۔ لیکن یہ نسبت فدیہ دینے کے ان کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۲۴۔ جس ریائی سو رو کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے اسی قسم کا پیام او ہے جیسا کہ زائتہ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سو غولوں اور مٹھوں میں، جن کا پیشہ سو و خوری ہے، پانی جاتی ہے۔ مگر

اس سے اُس منافع کی حرمت جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں، ہوتی اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا کسی رفاہ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے، اس روپیہ کا سود میں لگانا اور اس کے منافع سے رفاہ عام کے کام کرنا یہ بھی برہا میں داخل نہیں ہے۔

۲۵۔ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہو۔

۲۶۔ شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مرہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اس لیے اُن کا علو درجات اور رومانی نحوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل آدموں کے کھاتے پیتے ہیں۔

۲۷۔ صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگھیہ یا سنگھ یا ترمی و قرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح ترمی کی آواز پر شکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعثت و حشر واقع ہوگا۔

۲۸۔ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسما و افعال متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے جیسے بعثت و نشر حساب و کتاب، میزان صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔

۲۹۔ قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے، اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے

کے بعد ساتویں دن آرام لیا اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا ”مَدَامَا سَنَآهِن لَعُوْب“ کیونکہ شارع کا مقصد حقائق اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہے، بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہ نشین ہوں اُن کا نازل کرنا ہے۔

۳۸۔ قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بد اخلاقیوں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے کسی کو زلزلہ سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حمشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتداءً آفرینش سے یہ خیالی تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہر ناک حادثہ دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور انبیاء کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصد نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ انہیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں۔

۳۱۔ خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے نہ دل کی آنکھوں سے۔

۳۲۔ قرآن مجید میں جو جنگ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ان فرشتوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا

۳۳۔ صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات اور نہ لایعین والا غیر



جیسا کہ شاعرہ کا مذہب ہے۔

۳۴ - حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔  
 ۳۵ - کوئی اسرعاتِ الہی یا قانونِ طبیعی کے خلوت کبھی وقوع میں نہیں آتا۔  
 ۳۶ - قرآن میں جو کفار سے بطور معاوضہ کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عند اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ، اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں یہ سراو نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ سراو ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرائین، بدذہنوں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

۳۷ - نبوت کاملہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتی ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "النبی نبی و لدو کان فی بطن اُمہ" وہ ماں کے پیٹ سے ہی پیدا ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قوائے نظری بتدریج ترقی کرتے ہیں اسی طرح مکہ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقتضا ہوتا ہے اور جس کو عورت عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں، اسی لیے جو وحی اس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایچی یا قاصد یعنی فرشتہ کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اسی کے دل سے اٹھتی ہے اور اسی پر گرتی ہے۔

۳۸ - قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے

ہیں وغیرہ وغیرہ ثابہت نہیں ہوتا

۲۹- انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے

ہیں ان میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں وہ سب

درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہل اسلام نے یہودیوں کی

پیروی سے ان کے معنی ایسے بیان کیے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہیں۔

۳۰- طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اسی قوم

اور اسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے۔

۳۱- حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارا کی عمر اُس حد کو نہیں

پہنچی تھی جبکہ عادتِ اولاد کا ہونا غیر ممکن ہے۔

اگر سرسید کی تصنیفات کو بالاستیعاب اول سے آخر تک دیکھا جائے تو

غالباً مذکورہ بالا مسائل کے سوا اور مسائل میں بھی مہیت سے اختلافات نکلیں گے

مگر یہ سب اختلافات ایسے ہیں جن میں سرسید متضرر نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسئلہ

میں کم یا زیادہ وہ لوگ اکابرِ علمائے اسلام ہیں سے سرسید کے ساتھ متفق رائے

ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، امام الحرمین، قاضی ابن رشد، شیخ اکبر شاہ ولی اللہ

وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی کو ان سب بزرگواروں کے نام اور ان کے اقوال دیکھتے

ہوں تو سرسید کی تصنیفات میں اور مولوی سید مہدی علیخان کے مضامین میں

جو زیادہ تر تہذیبِ الاخلاق کی سبب سے پہلی جلدوں میں اور کسی قدر اخیر

زمانہ کی جلدوں میں شایع ہونے ہیں، دیکھ لے۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو معجزہ کو

ویلِ نبوت نہیں سمجھتے، خرقِ عادت کا واقع ہونا محال سمجھتے ہیں، قرآن میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر ہونا تسلیم نہیں کرتے، آیاتِ قرآنی جو بظاہر

انبیائے بنی اسرائیل کے معجزات پر دلالت کرتی ہیں ان کو مائل سمجھتے ہیں، عیسیٰ

کابین باپ کے پیدا ہونا تسلیم نہیں کرتے، ملائکہ سے تو ائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوت بہیمیہ و سبعیہ مراد لیتے ہیں جن کے وجود سے، جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، انکار کرتے ہیں۔ نبی پر متعارف فرشتوں کی وساطت سے وحی کا آنا تسلیم نہیں کرتے، قرآن کو محض باعتبار فصاحت و بلاغت کے معجز نہیں مانتے، شہدا کو درحقیقت زندہ اور کھاتے پیتے نہیں سمجھتے، مبدأ و معاد کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اس کو مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں، طیسور منقطعہ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال جانتے ہیں، قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں، عرض کہ جس قدر سرسید کے اختلافات ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ان میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے، جس میں کچھ نہ کچھ لوگ محققین اہل اسلام میں سے سرسید کے ہمزبان نہ ہوں ہاں چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے لیے بھی کیے ہیں جن میں ظاہراً وہ متضاد معلوم ہوتے ہیں لیکن یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ سلف میں سے کوئی اس طرف نہیں گیا اور وہ اختلاف یہ ہیں۔

۱- اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے اور آیہ من و فدا جو سورہ مہر میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کوئی ہے۔

۲- دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے "الدعا، هو العبادۃ" پس دعا کے مستجاب ہونے سے اس مطلب کا جس کے لیے دعا کی جاتی ہے حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں

۳- آیت یا آیات یا بینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جا بجا آئے ہیں، ان سے وہ احکام یا مواظبات و نواہی مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے۔

۴۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسیٰ کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا یہ دونوں قول غلط ہیں۔ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں مَا قُتِلُوا وَمَا صَلَبُوا کے الفاظ واقع ہوئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود تھی وہ واقع نہیں ہوئی۔

۵۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکیگا تو اس کو ایک سے زیادہ جوہر و کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۶۔ سارق کے لیے قطع بد کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہاء اُس کو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد سرقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا دیکھائی۔

۷۔ قرآن میں جن اور جنہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے یا پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کروہ وہی مخلوق جو دیلا اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔

۸۔ سورہ نیل (الم ترکیب) میں جن الفاظ سے اصحاب نیل پر ابابیل کا کنکریاں چھینکنا سرا دیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چیچک سے استعارہ ہے جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چیچک عرب میں اسی سال نمودار ہوا ہے جبکہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔

۹۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیاء سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے بد بیضا، عصا کا اثر دیا، نبیانا، فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ہونا، گوسالہ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من و سلوے کا اترنا، عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، خلقِ طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چمکا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، ماندہ کا نزول

وغیرہ وغیرہ، ان کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پیسے کسی مفسر کے نہیں لکھا۔

۱۰۔ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے ایک ..... مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود ہے، اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا مثلاً کفار کے رحمت الہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "لا تفتح لہم ابواب السماء" چونکہ اصل مقصود ان کے حرمان کا بیان ہے اور اُس کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں استدلال نہ ہو سکے گا۔

۱۱۔ شریعت اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی۔ جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں جن میں حکم ایسا نہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں، پس ان کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے باقی جس قدر احکام اس سے متعلق ہیں مثل وضو اور قیام و قعود و رکوع و سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ یہ سب اس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجالانا ضروری ہے۔

# فاریشن کی مخالفت

اگرچہ مذہب کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی موجودہ گورنمنٹ کی طرف سے آزادی تھی پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اول تو مذہبی خیالات ایسی چیزیں کہ جس طرح ان کا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا۔ اس کے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی جیسی کہ چاہیے، کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جس ملک میں جو فرقہ برسر حکومت ہوا اس ملک میں ہمیشہ اسی فرقہ کے مذہب نے رواج پایا، باقی تمام فرقے مضمحل و متلاشی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادی رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تقلید کی بدترین علامت تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا نہ ہوئے تھے اس کو مسلمان کیونکر بغیر نفرت اور کراہت کے سن سکتے تھے۔ دوسرے آزادی رائے ایک ایسی چیز ہے کہ جب دفعۃً کسی غیر تربیت یافتہ قوم کو حاصل ہوتی ہے تو اختلاف آرا جو آزادی کو لازم ہے اس قوم میں ہمیشہ مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے آزادی ان کو اختلاف کرنا سکھا دیتی ہے۔ مگر سبب تربیت یافتہ نہ ہونے کے وہ اختلاف اور مخالفت میں کچھ فرق نہیں کر سکتے، وہ جس رائے سے اختلاف کرتے ہیں ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ یا اس کو توڑ دیں یا خود ٹوٹ جائیں، مسلمانوں نے چونکہ انگریزی سلطنت میں آزادی کا نیا



نیا سبق پڑھا ہے اس لیے جو بات ان کی رائے یا عقیدے کے خلاف یا ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اس سے ہمیشہ ایسا اختلاف کرتے ہیں جو آخر کو سنجیدہ مخالفت ہو جاتا ہے۔

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاصہ مسلمانوں میں قومی تنزل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی بعض جہالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالفت پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں یہ ایسی مخالفت ہے کہ اگر سرسید ریفارمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور ملے میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونہ پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت سے ہرگز نہ بچ سکتے تھے جب ندوۃ العلماء جو خاصہ دینی تعلیم اور دینی اعتراض کے لیے اکثر علما نے اسلام کے آفاق سے قائم ہوئی ہے۔ مخالفت سے نہ بچتی تو اور کسی کو اس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اگر ہمارا قیاس نسلط نہ ہو تو کوئی اسلامی انجمن کوئی اسلامی مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جاتا جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ پس سرسید کو مخالفت سے کسی طرح مفر نہ تھا۔

اگرچہ ان کے مذہبی خیالات کی نسبت اسی وقت بدگمانی شروع ہو گئی تھی جب کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کر دیا تھا، مگر جب کہ انھوں نے ”تبیین الکلام“ کی پہلی جلد شایع کی تو اس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی، سید مہدی علیخان جو آخر کو سرسید کی ریفارمیشن کے سب سے بڑھ کر مددگار ہوئے، ان کو تبیین الکلام کا دیباچہ دیکھ کر ایسا جوش آیا کہ باوجود جان پہچان نہ ہونے کے اسی جوش و خروش میں انھوں نے سرسید کے دیباچہ مذکورہ کے

برخلاف ایک طویل خط کھد کر بھیجا۔ سرسید نے نہایت نرم الفاظ میں یہ جواب لکھا کہ ”اب تقلید کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عقل و ہوش سے کام لینے کا وقت ہے، اس کے بعد جب سرسید کے پاس علیگڑھ جانا ہوا اور ان کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں دل میں خدشہ تو تھا ہی، یہ سمجھے کہ جدھر سرسید نماز پڑھ رہے ہیں یہ قبیلہ کا رخ نہیں ہے جب وہ نماز پڑھ چکے تو اپنا شبہ ظاہر کیا۔ سرسید نے یہ آیت پڑھی: ”اِنَّ كَلِمَاتَكَ اَوْفَقٌ وَجَعَلَ اللهُ“ جب اس پر خوب بحث ہو چکی تو سرسید نے کہا میں نے اس کو ٹھکی کو ٹھیک قبیلہ بنا لیا ہے پھر کپاس لگا کر ان کو اپنے کہنے کا یقین دلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید کی سچائی کا نقش ان کے دل میں بیٹھا۔

جب سرسید نے غازیپور میں مدرسہ قائم کیا اگرچہ وہاں مسلمانوں کی طرف سے کچھ مخالفت نہیں ہوئی مگر پادریوں نے سخت مزاحمت کی اور مسٹر سیٹ جی خانہ پورا اور کرائل گریہم ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے سوا ضلع کے تمام افسر پادریوں کے طرفدار ہو گئے مگر آخر کار سرسید کامیاب ہوئے اور مدرسہ قائم ہو گیا۔

جب وہ خانہ پور سے بدل کر علیگڑھ میں آئے اور ماٹنگ سوسائٹی اور اس کا پریس بھی جو اس وقت تک سرسید کا پرائیویٹ چھاپہ خانہ تھا ان کے ساتھ علیگڑھ میں منتقل ہو گیا اور سوسائٹی کا مکان بھی تیار ہو گیا اب سوسائٹی نے باقاعدہ اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے الفسٹن ہسٹری ادون انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہونے لگا اور اس کے اجزا چھپ چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہونے لگے مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہاں اسلام کا آغاز اور عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (عما ذاللتہ) پیغمبر باطل کا لفظ

لکھا تھا اردو میں بھی اُس کا اسی طرح ترجمہ بے کم و کاست کیا گیا، مگر سرسید نے جارج سیل کے ترجمہ قرآن اور اس کے دیباچہ سے اور کرنل کینڈی کی کتاب سے اور نیرتاریخ طبری سے چند مقام جن سے مصنف کے قول کی تردید ہو سکتی تھی فٹ نوٹ میں نقل کر دیے تھے مگر ان نوٹوں سے مسلمانوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی، جب یہ حصہ چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچا تو مولوی سمیع اللہ صاحب نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کیا تھا باطل کیوں ترجمہ کیا گیا، سخت مخالفت کی اور ایک تحریر جس میں بقول سرسید کے، ان کے کھروار تدار پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے سے استدلال کیا گیا تھا، اخباروں میں شائع کرائی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہے چنانچہ اکثر مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی مبری سے استعفا دے دیا۔

اگرچہ ممکن تھا کہ ترجمہ میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا مگر سرسید کا مقصد مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ عیسائی اسلام اور یاقی اسلام کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اور اب اپنے مذہب کے طعنوں سے کان بند کر لینے کا وقت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر قومیں جو کچھ اسلام کے برخلاف کہتی ہیں اُس سے اطلاع حاصل کی جائے اور ان کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے یا ان کے تعصبات کی قلعی کھولی جائے۔ اخیر دم تک ان کی ہی رائے رہی کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مسلمان مخالفوں کے اعتراضوں اور طعنوں اور بدزبانوں سے بے خبر رہیں، چنانچہ پچھلے دنوں میں جو ایک میٹو گرسچن نے ایک سخت کتاب موسوم بہ امہات المؤمنین چھاپ کر مسلمانوں کو مفت تقسیم کی تھی اکثر ذی علم مسلمانوں نے ناگواری کے سبب اُس کو فوراً جلادیا لیکن سرسید نے اُس کی جلد بندھا کر اُس کو اول سے آخر تک دیکھا اور فوراً اُس

کا جواب لکھنا شروع کیا جس کو مرض الموت نے انہوں نے بے کہ ختم نہ ہونے دیا۔  
 پھر اسی دن جانے سے پہلے جب انہوں نے ایک رسالہ احکام طعام  
 اہل کتاب پر لکھ کر شایع کیا تو عموماً ان کو کرسمس کا خطاب دیا گیا اور جا بجا اس  
 کے چرچے ہونے لگے جب ولایت کے سفر میں چند روز باقی رہ گئے تو انہوں  
 نے اس خیال سے کہ انگریزی طریقہ پر کھانا کھانے سے بخوبی واقفیت ہو جائے،  
 یہ معمول باندھ لیا تھا کہ مسٹر سماتیہ جو بنارس میں ایک سو و اگر تھے اور مرہیدی  
 کوٹھی سے ان کی کوٹھی ملی ہوئی تھی ایک دن شام کا کھانا یہ ان کے گھر پر جا کر  
 کھاتے تھے اور ایک دن وہ ان کے گھر پر آ کر کھاتے تھے۔ مرہیدی کہتے تھے  
 کہ ”اتفاق سے انہیں دنوں میں مولوی سید مہدی علیخان مرزا پور سے بنارس  
 میں مجھ سے ملنے کو آئے رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی۔  
 ہم دونوں میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مہدی علی آ پہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ  
 مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اس طرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا  
 کھاتے دیکھا تھا، سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہان ہونے کے  
 کھانا دکھایا اور کہا کہ میں کھا چکا ہوں۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس وجہ  
 سے کھانا نہیں کھایا میں نے کہا کہ اگر آپ کو بیوقوفیہ مالا پسند ہو تو دوسرا بندوبست  
 کیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے  
 خلاف دیکھنے سے نفرت ہوئی ہے آخر قبول کر لیا اور سب سے پہلی دفعہ  
 دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اس طرح گزر گیا مگر رات کو یہ مشکل  
 پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر سماتیہ کے ہاں تھا میں نے ان سے پوچھا کہ اگر  
 آپ کو وہاں کھانے میں تامل ہو تو یہاں انتظام کیا جائے انہوں نے پھر  
 اسی خیال سے کہ شرعاً ممنوع نہیں، اقرار کر لیا کہ میں بھی وہیں کھا لوں گا چنانچہ

رات کو وہیں کھانا کھایا پھر ایک آدھ روز بعد مرزا پورہ واپس چلے گئے، اللہ آباد میں ان کے ایک دوست کو یہ معلوم ہو گیا انھوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خیر سچ ہے؛ مولوی مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ بھیجا انھوں نے وہ خط بجنسہ ہمارے ایک نامہر بان دوست کے پاس جو اٹا وہ میں رونق افروز تھے۔ بھیج دیا انھوں نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرستان ہو گئے مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پیٹھ لگا کرتی تھی ہمارے شفیق نامہر بان نے اس گنوارہ دل میں جا کر خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سنایا اور تمام پیٹھ میں منادی کر دی کہ بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرستان ہو گئے جو سننا تھا۔ افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سید احمد خاں پر لعنت کرے۔

اس خیر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خورد نے کمال ستے نے پانی بھرنا، اور سب لگے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا کہ گھر والوں نے ان کو لکھا کہ تمہاری بدولت ہم پر سخت تکلیف گذر رہی ہے تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کر دو انھوں نے ایک طویل طویل خط اٹھیں بزرگ کو جنھوں نے یہ نواہ اڑائی تھی حلت طعام اہل کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹا وہ میں آئے اور سب کو سمجھایا کہ ہیں کرستان نہیں ہوں جیسا پہلے مسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں بغرض بڑی مشکل سے لوگوں کا شبہ رفع کیا۔

جب سرسید لندن جانے لگے کسی نے یہ مشہور کیا کہ مکہ کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی نے کہا کہ لندن جا کر نکسالی کرستان ہو کر آئیں گے۔ عرض جو جس کے دل میں آیا سو کہا مگر سرسید نے جو کچھ دل میں ٹھان لیا تھا اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور تاریخ معین پر بحم اللہ عظیمہ و مہمانا کہہ کر جہاز میں سوار ہو لندن روانہ ہو گئے، راہ میں وہ دریائی سفر کے حالات اور جہاز کے واقعات لکھ کر وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجتے جاتے تھے، اسی



کے ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ”جہاز میں یا ورحی اور جانور ذبح یا صاف کرنے والا انگریز ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے، جیسے پھیڑ بکری نیندھا وغیرہ، اس کو تو وہ ہمیشہ گردن کی شہ رگ میں آریا چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز یا حرام ہے یا اس کے اخراج کا رواج ہے اور پرندوں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ پرندوں میں مثل چو پاؤں کے دم مسفوح نہیں ہے اور ان کی مثال دریائی جانوروں جیسی ہے۔ پس ان کا ذبیحہ صرف ان کا مار ڈالنا ہے اس لیے پرندوں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ توڑ کر مار ڈالتے ہیں“ چونکہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً جس طرح کہ وہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے موافق کھانا جائز ہے اس لیے سرسید نے لکھا تھا کہ ”میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ مائل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت ٹین اور جیب اور مرغ و کبوتر کے کھائے۔ والہی اللہ الذی جعل فینا لیسرا و اعسرنا الصلوٰۃ والسلام علی ما الشریفا السہل الحدیث“ اور جہانک ہم کو معلوم ہے تمام ترک اور مصر و شام کے مسلمان جو عیسائی قوموں کے جہازوں میں سفر کرتے ہیں وہ بھی عموماً اسی طرح عیسائیوں کے ساتھ انھیں کے یا ورحیوں کے ہاتھ کا صاف یا ذبح کیا ہوا اور انھیں کے ہاتھ کا پکایا ہوا بے تکلف کھاتے ہیں۔

جب یہ خبر شد وستان میں پہنچی تو مخالفین کو ایک اور شہید سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مرڈی مرضی کھانے کو انھوں نے سید کے کافر ہونے کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا کیونکہ قرآن مجید کہہ دے مستفہ حرام ہے۔ پس جس شخص نے قرآن کے حکم سے انحراف کیا اسے کافر اور مرتد ہونے میں کیا کلام ہے؟



پھر لندن سے جو تحریر سرسید کی آتی تھی اور سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھی اس پر عام اخباروں میں برابر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی، ان کی ایک تحریر میں یہ فقرہ تھا کہ "ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تربیت و شائستگی میں وہ نسبت رکھتے ہیں جو ایک وحشی بد صورت ایک لائق اور خوب صورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے؟" اس پر مدت تک اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہوتے رہے اور عام مجلسوں میں بہت دن تک اس کا چر پار پانچا پنجہ انھیں دڑوں میں ایک جلسہ کی کیفیت جو بتقریب دعوت صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز جنگ مولوی سید مہدی علی خاں کے مکان پر منعقد ہوا تھا اور جس میں صاحبزادہ موصوف اور مولوی صاحب اور دیگر شرکاء کے جلسہ کے درمیان خوب مباحثہ ہوا تھا، سوسائٹی کے اخبار میں مفصل چھپی تھی۔

جب یہ تمام نکتہ چینی سے بھرے ہوئے اخبار سرسید کے پاس لندن میں پہنچے تو انھوں نے ایک مضمون جس کا عنوان "عند ز طرف گنہگار سید احمد" تھا۔ سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجا جس میں اول تمام وطن کے نکتہ چینیوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے میرے عیبوں سے مجھے آگاہ کیا اور آخر میں اہل وطن سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ "وہ دن آنے والا ہے کہ تم میرے ان لفظوں کو جنہیں اب گالیاں سمجھتے ہو سوایاں سمجھو گے..... اے بلران وطن سے رات تھوڑی حشر تیرا دل میں بہت صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی" "شکوہ و شکایت ہو چکے، بس اب گلے بل لیجئے اور اپنے لک کی بھلائی پر متوجہ ہو جیئے اپنے لک کے بچوں کی تربیت کا بند و بست کیجئے اور جو جو الزام ہمارے لک پر ہیں ان کو مٹائیے دنیا میں اپنے لک کو تربیت یافتہ اور شائستہ کر کے دکھلائیے اور چلے حوالوں کو اٹھا کر کیجئے۔"

جب اس پر بھی اہل وطن کی مخالفت کم نہ ہوئی اور اخباروں میں برابر مخالفانہ مضامین چھپنے رہے تو انھوں نے ایک تذکرہ جس کا عنوان ”عز و صداقت بخد مت اہل وطن“ تھا، سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیج جس کی ابتدائی سطروں سے کسی قدر اس مخالفت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت تک ہندوستان کے مختلف اطراف سے ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام اور کوشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”پس جو میرا گناہ ہے وہ سبجز اپنے ہوطنوں کی عموماً اور اسلام کی خصوصاً خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں۔“ نیست یارانِ طریقت غیر ازیں تقصیر ما....

اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہوطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ اٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علائقہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو، مگر چونکہ میری دلسوزی اپنے ہوطنوں سے یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لیے میرے ہوطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی، مجھ کو ناگوار نہیں گذری اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا، نہ پرانے دوستوں کی باتیں بری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دہتی ہے، نہ کانپور کی ہیبت آواز سے رنج ہوتا ہے، نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے، نہ الہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں، نہ مراد آباد اور رامپور کے فتوے اور دہلی کے اہل جہد و خانقاہ حاجیان حرمین شریفین کی گفتار و رفتار دل کو دکھاتی ہے۔ عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سامنے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی واللہ علی ذلک!!

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے جو بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے ان پر خاص کر مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفتوں کے ہونے کا ان کو کامل یقین تھا اور ولایت سے وہ ان مخالفتوں کے جھینے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔

وہ ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو اخبار شعلہ طود کا نمبر کی مخالفت تخریر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں جو مضمون کہ اس میں لکھا گیا آپ نے پڑھا ہو گا اور امیر رہے کہ اور بہت کچھ لکھا جانے گا۔ اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دل کو طلال ہوتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے۔ اور دل کو صرف دو خیالوں سے تسلی ہوتی ہے، اول تو اس خیال سے کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالف نہ کھڑا ہوا ہو آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ عیسیٰ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلافتہ اربعہؑ، محی الدین چلبانی، مجدد الف ثانی، محمد اسماعیل دہلوی، وعلیٰ ہذا القیاس۔ پس میں تو ان کی جوتیوں کی برابر بھی نہیں ہوں، میری مخالفت پر کمر باندھنی کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے وہ وہ نیکی بڑھتی گئی ہے، پس اگر میرا کاروبار و میری نیت سچی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا اور اگر وہ نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اس کو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلاشبہ ٹوٹ جائے گا اور مخالف جو اس صورت میں ضروری ہے کہ نیکی پر ہونگے کامیاب ہونگے اور ایسی حالت میں جھکو بھی ان کی کامیابی پر خوشی کرنی ہوگی، نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے کا نتیجہ۔

اس خط اور نیران کے دیگر خطوط سے جو ولایت سے انھوں نے مولوی صاحب مدوح کو لکھے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی سچائی پر اور اس کی وجہ سے اپنی کامیابی پر پورا پورا بھروسہ تھا اور لوگوں کی مخالفت کی ان کو مطلق پر وانی تھی، ایک خط میں خطبات احمدیہ کی نسبت مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "بعد چھاپے چند نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا، تاوانم کہ منذوم چہ میگوید؟"

خدا یا مخدوم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند پاک نیست نہ سیرا کہ این معاملہ مسدا  
 بالست نہ یا مخدوم من مہدی بیکن محبت من از دو محبت اول از من کم مگر وان  
 او خدا وانندہ رانہ ہائے پوشیدہ در دن بینہا تو میدانی کہ من یا تو دباوین حقہ  
 اسلام دادہ توجیہ میکنم وجیہ اعتقاد وارم؛ پس اگر مرا محبوب من مہدی لاند ہر ب  
 یا کافر گوید یا سمیع اللہ دادا والعلی مرتد واندر اچہ پاک؛ تو برین مہربان باش =  
 الغرض جب سرسید لندن سے واپس آئے اور الٹا باو میں پہنچے تو ان کو معلوم  
 ہوا کہ اضلاع شمال مغرب اور وہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے  
 ہیں کہ کوئی سید احمد خاں سے نسلے اور شان کے ساتھ کھانا کھاوے اور جو ایسا  
 کرے گا وہ واثرۃ اسلام اور جماعت اہل اسلام سے خارج ہو جائے گا ہم نے  
 سنا ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم رئیس لوہارو کے  
 پاس بھی جو سرسید کے بڑے گاڑھے دوست تھے، وہلی میں پہنچا تھا۔ انھوں  
 نے خط پڑھ کر کہا کہ "خدا مارے یا چھوڑے سید احمد کافر ہو یا مسلمان، مجھ  
 سے تو نہ ہو سکے گا کہ میں سید احمد خاں سے نہ ملوں اور ان کے ساتھ کھانے اور  
 کھلانے سے پرہیز کروں۔" سرسید کی زبانی معلوم ہوا کہ ولایت سے آنے کے بعد  
 بہت دن تک اکثر لوگ ان کے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے رہے مگر رفتہ  
 رفتہ بیماریاں اچھے ہونے لگیں، پرہیز ٹوٹا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں کا انگریزوں  
 کے ساتھ کھانا، جیسا کہ ظاہر ہے اب ایک عام بات ہو گئی ہے۔ وہی لوگ جو  
 میز اور کرسی اور چھری کانٹے کے نام سے بدکتے تھے اب انگریزوں کو اپنے گھر  
 بلا کر اور خود ان کے ہاں جا کر اسی طریقہ سے ان کے ساتھ کھانا کھانا فرماتے  
 ہیں اور کوئی شخص ان کو کرستان نہیں جانتا۔

لیکن مذکورہ بالا مخالفوں کو بمقابلہ اس طوفان عظیم کے جو آگے چل کر اٹھنے

والا تھا۔ محض ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک سمجھنا چاہیے۔ جو میں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور کالج کے قائم کرنے کے لیے کوشش شروع کی، مخالفت کی گھنٹا چاروں طرف سے امنڈ گھمنڈ کرا گئی۔

مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جگ گورکھ پور اگرچہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقاید و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنی پہلے سخت واپاری اور دوسرے سخت بدعتی اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق نہ ہا محال مادی معلوم ہوتا تھا، باوجود اس کے مدرستہ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہمزبان اور متفق الکلہ تھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جہانہ سے ہوئیں ان کا بیج انھیں دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ اگر ان کی مخالفت کا باعث مذہبی جہش اور سمیت اسلامی ہوتی تو ان کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح ان کی مخالفت بھی محض ذہنیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں، ایک اور وجہ ان کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرستہ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لیے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا تھا۔

پھر بہت سے ویسی اخباروں نے جب دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً بدگمان اور متنفر ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے اپنے اخباروں کی گرم بلاری اسی میں دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں



سرسید اور ان کے اصحاب و انصار پر اعتراضوں کی بوجھ پھاڑا نہ ہو۔ بعض مولوی جو زمانہ کے انقلاب سے نہایت کس مپرس حالت میں تھے انھوں نے سرسید کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہا کہ ان کی تصنیفات کا رد لکھنے پر کمر باندھی اور فی الواقع اس سے ان کو بہت بڑی کامیابی ہوئی ان کی کتابیں تمام ہندوستان میں شایع ہو گئیں اور کئی کئی بار ان کے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسید کے خیالات اور ان کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے۔ رسالہ طعام اہل کتاب کی رو میں مولوی امداد العلی نے امداد الاحساب لکھی، مولوی محمد علی نے منزل الادہام نام ایک رسالہ شایع کیا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پیر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے، کانپور سے نور الآفاق اور نور الانوار اور مراد آباد سے لوح محفوظ نکلا، اگرہ سے تیرھویں صدی شایع ہوا، اور امداد الآفاق، شہاب ثاقب اور تائید الاسلام وغیرہ اخلاص شمال مغرب سے اور اشاعت السنہ پنجاب سے شایع ہوئے سرسید کو محمد، لامذہب، کرستان، نیچری، دسیریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطاب دیتے گئے ان کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہری اور دستخط کرائے گئے یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے ان کی بھی تکفیر ہونے لگی، سرسید کے نام کالی اور دشنام کے بھرے ہوئے گنہام خط چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گنہام خطوں کا سلسلہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کم و بیش اخیر تک جاری رہا۔ سرسید نے ان نالائق خطوں میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھایا ہے اور ایک خط جب کہ منشی سراج الدین احمد سرسید کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے سرسید کے پاس آیا تھا اور ان کے پاس سرسید نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اس کو نہایت جلی حروں میں



میری لائف میں درج کر دینا چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسودات میں ہم کو دستیاب ہوا ہے جس میں اول سے آخر تک نہایت منغلط گالیاں جو رفیل سے رفیل آدمی کی زبان پر بھی نہیں آسکتیں، بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ وہ خط سنجیدہ ان کی لائف میں درج کیا جائے مگر ہماری غیرت نقاضا نہیں کرتی کہ اس ملعون تخریب کو سرسید کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دنیا پر ظاہر کریں۔ چونکہ سرسید کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افتراء اور تہمت و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے اس لیے سرسید جہاں تک ہو سکتا تھا کسی کا جواب نہیں دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے مگر اول اول جبکہ مخالفوں نے سرسید اور ان کے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اڑانی شروع کیں اور لوگوں نے سرسید کو مجبور کیا کہ یا تو ان باتوں کا جواب دیجیے ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزامات سب صحیح ہیں اور نیران تخریروں سے چند سے رک جانے کا بھی اندیشہ تھا اس لیے کبھی کبھی سرسید اور مولوی سید مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں ان کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا ہے۔ انراغلہ سرسید کا مضمون ”واقع البہتان“ اور سید مہدی علی کا مضمون ”تکفیر مسلمان“ اور سوال و جواب ”خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

”واقع البہتان“ سرسید کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے مولوی علی بخش خاں مرحوم سبار ڈینیٹیٹ جج گورکھپور کی کتاب ناسیہ الاسلام کے جواب میں لکھا تھا اس مضمون کو سرسید نے ذیل کے فقرہ پر ختم کیا ہے :

”جو کوئی میری اس تخریب کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج

(یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کیے

ہیں؛ ظاہر اسکا سبب... یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ

رسالہ لکھا ہے قریب اسی زانہ کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے انہوں نے خیال کیا ہو گا کہ لاف حج کو تو جانتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جائیں گے جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھاپا پیمانہ جاوے گا مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرا جا ہیے کہ حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں جب تک میں ہی نہ معاف کروں، معاف نہیں ہو سکتے پس مقتضائے ایماندارمی یہ ہے کہ آپ حج و راحمد کا احرام باندھیں اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا سزا آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

ایک اور مضمون سرسید نے انہیں مخالفوں کے مجرم کے زمانہ میں لکھا تھا جس کا عنوان ”حال خود و بابرانی خود“ ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہے۔ جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

”ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

بدگفتی و خرسندم سخاک اللہ لکوفتی جواپ تلخ مینرید لب لعل شکر خارا  
 پرانے دل بعضے تو ہم کو سیرا کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش  
 پر ہیں اور ہم کو سیرا کہنے پر نہایت تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں  
 ہے۔ ہم کو وہی جوش محبت و مہر دی اپنی قوم کے ساتھ ہے ان کی دین و دنیا  
 کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے، ان کے غصہ سے ہم کو  
 رنج نہیں، ان کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں  
 جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے۔ ہم کو پھلوں کے حالات سے اور خود

اپنے دادا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بالکل تسلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھ لیا ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے ان کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالخصوص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؛ کوئی سولی دیا گیا، کوئی آ رہ سے چیرا گیا، کوئی جلا وطن کیا گیا، ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اس کا کروڑوں حصہ بھی ابھی نہیں ہوا، ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا؛ کچھ نہیں کیا، بہت کیا تو یہ کیا کہ دو چار خط گنام دشنام کے لکھ بھیجے، ہم نے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اور ان کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی انفاق سے ان کا دورت نہو یا دوپتھر اور ایک کاٹھ کی کل ان کے ہاتھ میں ہوئی تو انہوں نے اپنے دل کے غصہ کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپوا کر ٹھنڈا کیا ہم تو اس پر بھی راضی ہیں، گمراہ دن کا ہم کو افسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر افسوس کریں گے اور تمہیں گے جو سمجھیں گے۔

ہم کو ملحد اور زندیق اور لاندہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرا زمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنا لیا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جہاں سے جدا مجدیر اہم اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے، ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت و نیامیں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لاندہب

مذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؛ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرستان بھی کہتے ہیں اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپاکہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں جا کر بتسما یعنی اصطبلان گیا۔ ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ علانیہ جھوٹا بولنے اور جھوٹا چھاپنے میں کچھ شرم و غیرت و حیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، خدا نے ہماری قوم کے دل کے کسی ستادی ہے۔ اس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹا بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بہ لحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا۔ مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں۔ **وَمَا ظَلَمْنَا الْقِسْمَانِ لَمْ نَغْفِرْ لِمَا**  
**وَنَرَحْمَنَا لِنَكُونِ مِنَ الْخَاسِرِينَ**۔

معاویہ اور العلی نے جو تین اشرف بنندستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کیے تھے ان میں سے ایک استفتاء اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقاید اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان سمجھا جائے یا نہیں؛ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہتا ہے چاہے وہ دینا اور اس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؛ اور تیسرا اسی تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھا جس میں مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور نالائتم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام

فتوے اور استغنیٰ مولوی امداد العلی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جس کا نام ”امداد الآفاق پر ہم اہل التفیق، بحواب پرچیہ تہذیب الاخلاق“ ہے چھاپ کر اس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گزری ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سستی کیا شیعہ، کیا مقلد کیا غیر مقلد، کیا دہابی کیا بدعتی سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر ممبری یاد تخط ہیں اور خاص کر سستی مولویوں میں سے اکثر نے بہت مٹرج اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ زانجلہ دلی اور لکھنؤ کے دو سب سے بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ نقرے بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں ”در سنج این سامحہ ایمان زوایے و وقوع این واقعه موش رباہ ظہور این سعائتہ بجمیعیت افزا و حدوث این حادثہ الحاد افشا کے تعبیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرن ایسے طلبہ کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اس محوش عقیدہ کے کہ جس کا حال بد مال اس سوال میں مذکور ہے، بالکل باطل، اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تسلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکالنا ہے اور زمرہ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ اعوذ باللہ من الحورید الکور بل بالکل باطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم، اور ایسے بے عمل میں سامعی ہونا ہیجہ اور حطب بنتا لازم.... الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور بٹہ سمجھنا اپنے ال کا خیال خام ہے۔

نے نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں۔ پس سرودیندار لیکہ تمام سنی و شیعہ و خارجی و سائتر



ہنود و قادیان سکنائے اہل زمین پر واجب اور مستحکم ہے کہ ایسے کلام وہی اور ایسے عقیدہ وہی پر عقیدہ اپنانا نہ جمائیں بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو ہادہم بنائے اپنے مذہب کا بوجھ اور اس اسر لپچ پر دل نہاؤ نہ ہو وے اور اپنے دل میں اس کا انجام سوچے کہ کیا جاں بچھا یا ہے۔

مولوی عبدالرحمن صاحب مرحوم مکھنوی، جو علمائے فرنگی میں تہابیت نام آور رہے تھے، معتقد عبارت میں تخریب فرماتے ہیں ”وجود شیطان اور اجنبہ کا منصوص قطعی میں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کہو کہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے منکر افس کا بقلائے وسواس شیطانی ہے۔ حرمت منحنقہ طور منصوص کلام رب غفور ہے، اور سلف سے ناخلف اتفاق اس پر ماثر ہے، انکار اس کا حویب گمراہی و فجور ہے۔ مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر تشریح اور منہدین کو اس کے قبول سے ایسا ہے..... ہر مسلمان کو حق جل شانہ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے، اور مذہب نیچر اور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسدہ ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص محرب دین ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام اسلام میں تخریب دین محمدی کی نگر میں ہے اور بنام تنجید بد مدرسہ جدیدہ انسا شریعت اس کی منظور نظر ہے جو چیزیں کہ اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں۔ فلخذوا لحدیبا للسلوون والحدیبا للکفر یا ایہا المؤمنون“

ان تمام فتوؤں کا جواب اور جن عقائد و اقوال پر سرسید کی تکفیر کی گئی ہے ان کا ثبوت محققین اہل اسلام کی تصنیفات اور ان کے کلام سے مولوی سید مہدی علیخان نے ان دو مضمونوں میں جو ”تکفیر مسلمانان“ اور ”سوال و جواب“ کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں اسی زمانہ میں پھیرے تھے اور نیز دیگر مضامین



میں بوجہ استیفاء دیا ہے اور سرسید کی تصنیفات میں بھی ان کے جوابات متفرق طور پر مل سکتے ہیں اس لیے ان تمام استفتاءوں اور فتوؤں اور ان کے جوابات کا اس مقام پر نقل کرنا کچھ ضرورہ نہیں ہے مگر سرسید کے دو ایک لطیفے جو مخالفوں کی نسبت تحریر کی رو میں ان کے قلم سے شیک پرشے ہیں یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لطیفہ : جس زمانہ میں سرسید ولایت میں تھے ان کے پاس اخبار شعلہ طور کانپور میں مولوی سید امداد العلی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا، اس میں تاریخ الفسٹن کا وہی ترجمہ جس پر آخر کار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بعینہ نقل کر کے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا بہنمی ہے" سرسید ولایت سے ایک خط میں مولوی مہدی علیجاں کو لکھتے ہیں "دیکھو دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہے اسی اخبار شعلہ طور، میں تاریخ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے بشد و مد لکھا ہے کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا بہنمی ہے۔ حالانکہ خود بھی اسی عبارت کو لکھتے ہیں، پھر مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؛ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور انھوں نے اردو سے"۔

یہ نثر لطیفہ ہی نہیں ہے بلکہ اس فتوے کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اسی ترجمہ کی بابت سرسید کی نسبت دیا ہے، مولوی امداد العلی بھی تکفیر کے مستحق ٹھہرتے ہیں، کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی تائید میں شغالی قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے امام مالک سے پوچھا کہ تم شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے؛ امام مالک نے حکم دیا کہ ان الفاظ کا پورے والا کافر ہے اس کو قتل کر ڈالو۔ اس نے کہا حضرت میں نے تو

دوسرے شخص کا قول نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہم نے تو سمجھی سے سنا ہے، لطیفہ پھر جب کہ سرسید ولایت سے واپس آگئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا اُس وقت مولوی امداد العلی نے سرسید کے پاس ایک ایسا رسالہ چھپا ہوا بھیجا جس میں اسی فتوے کی دھمکی دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ "مفتی سعد اللہ صاحب کا فتوے تکفیر میں جناب احمد خاں کی جو ترجمہ تاریخ پدمرتب ہوا ہے، راسم کے پاس موجود ہے معلوم نہیں کہ سید احمد خاں کے حواریوں اُس فتوے پر بھی اجماع رکھتے ہیں یا نہیں" سرسید تہذیب الاخلاق میں اسی دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں "پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ صاحب کون ہیں؛ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلی میں دیکھا ہے؛ اور یہ وہی مفتی سعد اللہ صاحب ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں ایک نیک نجات مسلمان آل رسول ابن علی اولاد نبی کے کفر اور قتل کا فتویٰ دیا کہ مشرک و محرم میں ان کا سر ہنومان گڑھی سے نیزہ پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا، تو ہمارا

مفتی سعد اللہ صاحب ہندوستان کے ایک مشہور عالم تھے جن کا قدیم وطن مراد آباد تھا، جس زمانہ میں سرسید کی آمد دہلی سے دہلی کے مکان پر بہت زیادہ تھی غالباً اسی زمانہ میں مفتی سعد اللہ صاحب بطور طالب علموں کے دلی میں وارد تھے اور مفتی سعد اللہ خاں سے پڑھتے تھے جب یہ تمام علوم مکتبہ و نعلیہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں جب کہ غالباً امجد علی شاہ زندہ تھے ان کو مذہب اہل سنت کے افتا کا محرز عہدہ مل گیا تھا اور اُس وقت سے واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ تک یہ اسی عہدہ پر مامور رہے اسی زمانہ میں وہاں ایک بہت بڑا واقعہ مولوی سید امیر علی صاحب کے قتل کا گذرا تھا۔ ہنومان گڑھی میں ہندوؤں نے ایک مسجد ٹھکانا بنا چاہا تھا اور اہل دربار کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا تھا سید امیر علی کچھ جمعیت لے کر وہاں ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کو پہنچے، چونکہ سید امیر علی سنی المذہب تھے اس لیے نائب نے مفتی سعد اللہ سے اسکو بات کانتی لکھوایا کہ فوج بھیج کر سید امیر علی کو اس ارادہ سے روکا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کو قتل اور ان کی جمعیت کو پرانندہ کر دیا جائے چنانچہ سید امیر علی شہید کیے گئے ۱۲۔

دل ٹھنڈا ہو گیا اور سمجھے کہ آل رسول کے قتل و کفر پر فتوے دنیا اُن کا قدیمی پیشہ ہے۔  
 اگرچہ مولوی ادا و لعلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل  
 کرنے میں حد غایت کو پہنچ گئی تھی ولی۔ رام پور، امر وہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ،  
 بھوپال اور دیگر مقامات کے ساتھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر  
 کے فتووں پر مہر اور دستخط کیے تھے، گویا ہندوستان کے تمام اہل حل و عقد  
 کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب  
 باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی پوری کر دی، انھوں نے  
 غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر ملا سب  
 اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفتے عربی زبان پٹنیا کیے جن میں سے ایک  
 کا ترجمہ یہ ہے:۔

”آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی  
 سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس سے مراد قوت بہیمیہ ہے جو نفس انسان  
 میں ہے اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قوی  
 کا مطیع ہونا مراد ہے اور ابی وائٹنگبر سے عدم اطاعت قوت بہیمیہ مراد  
 ہے جو آدمی کی انکار کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا۔ اور کہتا ہے  
 کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضا بے بیط یا سبع سیارات مراد ہیں  
 اور کہتا ہے کہ لونی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے۔ آیہ انا متابعون و اما فداء سے  
 اور یہ آیت نازل ہوئی ہے فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو  
 قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی  
 تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے سے انکار  
 کرتا ہے شق صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوئے

پر مدحلال ہیں، پس ایسے شخص کے اب میں کیا حکم ہے؟  
 اس استفتے کے جواب میں مذہب اربعہ کے چاروں مفتیوں نے جو کہ  
 معظمہ میں رہتے ہیں علیحدہ علیحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے  
 جوابات کا حاصل یہ ہے کہ ”یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ  
 ہے کہ مسلمانوں کے سوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے  
 فتنے سے بھی بڑھ کر ہے خدا اس کو سمجھے، واجب ہے اولوالامر پر اس شخص سے  
 انتقام لینا، اس کو تہذیب کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آوے  
 تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اس کی تادیب کرنی چاہیے اگر ولایت اسلام  
 میں کوئی صاحب غیرت ہو، نہیں تو خدا اس کو سمجھے گا اور اس کی اصلاحیوں اور  
 رسوائیوں کی سزا دے گا“ اس کے بعد سپہ محمد کبشی حنفی مدرس حرم شریف  
 اور مولانا رحمت اللہ مرحوم ہندی ہاجر کہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں  
 کی تصویب کی ہے۔

پھر مولانا علی بخش خاں مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتاء شیخ  
 محمد امین بابی مفتی احناف کی خدمت میں پیش کیا ہے، ان کے جواب کا خلاصہ  
 یہ ہے کہ ”جو کچھ دُرِ مختار اور اس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا حاصل  
 یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے،  
 یا زندق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا ابا جحہ ہے کیونکہ مختلفہ کا کھانا حباح  
 بتلاتا ہے، اور اہل مذہب احنفی کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے

لہ یعنی شیخ عبدالرحمن بن شیخ عبداللہ سراج مفتی حنفیہ اور احمد بن رحیم دحلان مفتی شافعیہ

اور محمد بن عبداللہ بن حمید مفتی حنبلیہ اور حسین بن ابی اسیم مفتی مالکیہ ۱۲۔

لوگوں کی توجہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توجہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اُس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لیے اور ولایتِ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔“

دوسرے متفقے کا ملخص یہ ہے کہ ”اُس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقاید اور اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ وہ ستہ ضروریہ میں یورپ کے فلاسفہ جدید کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدون کیے ہیں بے قاعدہ ہیں اس لیے ضروریہ ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر ستہ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتب دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفہ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں۔ اور جب لوگوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہو گا۔ اور اُس کی اعانت سے انکار کیا تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادہ سے بھی باز نہ آؤں گا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہو گا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہو گا۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اسی کے گروہ کے ہیں اور اُن کی رائے ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پھپھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اس کی اعانت کرنی جائز ہے یا نہیں؟ بینوا نوجروا۔“

اس کا جواب بھی حرمین شریفین کے مہبتوں نے الگ الگ لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ”یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اُس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیلہ ہو جائے تو اس کو منہدم

کرنا اور اس کے بانی سے اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب  
 ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیت اسلامی ہو واجب ہے اس مددگار کی لغت  
 جہاں تک کہ قدرت ہو اور اونٹے درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کا مخالف ہو،  
 حسن اتفاق سے جس زمانہ میں یہ فتویٰ مولوی علی بخش خاں حرمین شریفین  
 میں وہاں کے علما اور مفتیوں سے لکھوار ہے مجھے حافظ محمد حسین نام ہندوستان  
 کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے جو حج اور زیارت کے ارادہ سے وہاں گئے  
 تھے۔ اُدھر تو مولوی علی بخش خاں نے عرب سے آکر مذکورہ بالا فتوؤں کی ہندوستان  
 میں منادی کرنی شروع کی اور اُدھر اُس نیک دل مسلمان نے باوجودیکہ سرسید  
 سے مطلق شناسائی مدغمی ایک طول طولی مضمون سرسید کی تکفیر کی تردید میں  
 انھیں دنوں میں اخبار کوہ نور لاہور میں چھپوا یا جو تہذیب الاخلاق میں نقل کیا  
 گیا تھا اور جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرنے مناسب سمجھتے ہیں۔  
 وہ علمائے حرمین شریفین کے فتوؤں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :  
 "فتوے لکھنے لکھانے کا جو حال یہاں ہے (یعنی ہندوستان میں) وہی وہاں (یعنی  
 حرمین شریفین میں) ہے جس مضمون سے چاہا فتوے لکھ لیا جس سے دستخط  
 کراتے ہوئے جو چاہا سمجھا کر دستخط کرایے۔ جیسے عالم یہاں ہیں ویسے ہی وہاں  
 ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ان کی زبان ہندی ہے ان کی عربی، وہاں جو ہندوستانی  
 اہل سنت و جماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں ایک بدعتی، دوسرے وہابی  
 جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو کافر کہتے ہیں جب  
 بدعتیوں کا وار چل جاتا ہے وہابیوں کو نکلوادیتے ہیں، جب وہابی غالب ہو  
 جاتے ہیں بدعتی چپ ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں بدعتیوں کا وار چل رہا ہے۔ سید  
 احمد خاں صاحب حرمین شریفین میں بھی مشہور ہیں، اکثر ہندوستانی اور بعض



عرب اُن کے نام اور اُن کے خلاف واقع حال سے واقف ہیں۔ وہاں مشہور ہے کہ سید احمد خاں لندن گئے تھے وہ انگریزوں سے اقرار کر کے آئے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو جہاں تک ہو سکے گا کرستان کریں گے اور دین اسلام سے پھیریں گے اب وہ اپنے اقرار کے موافق مسلمانوں کو بہکا کر دین اسلام سے پھیرتے ہیں اور نئے نئے عقاید سکھاتے ہیں۔ یہ جو فتوے میں لکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اُن کا فتنہ بڑھ کر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں مسلمان رہ کر اور دین اسلام کے نام سے وعظ و نصیحت کر کے عیسائی کرتے ہیں جس کسی نے سید احمد خاں صاحب کا یہ حال سنا۔ وہ اُن سے نفرت کرنے لگا اور بُرا جاننے لگا۔ جب سے واقعی مال کہا گیا کہ سید احمد خاں ایسے آدمی نہیں ہیں، کچے مسلمان ہیں ظاہر اور باطن میں یکساں ہیں مسلمانوں کو مسلمان رکھنا چاہتے ہیں، قرآن کے معنی جو ہیں وہی کہتے ہیں حدیث کو معتبر جانتے ہیں، جو حدیث نہیں ہے اسکو بے اعتبار سمجھتے ہیں، اہل کتاب کے ذبیحہ کو قرآن مجید کے موافق حلال کہتے ہیں، سورہ اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں، انسانوں سے انسانیت کی وجہ سے قرآن مجید کے مطابق دوستی رکھتی اور ہر ایک کی بھلائی چاہتی اور جو بے ثواب بتاتے ہیں، شیطان اور آسمان کے منکر نہیں مقرر ہیں، صورت اور طرح میں جو بعض عالموں نے بیان کی ہے اُن کے ہمزبان ہیں اکثروں کے ساتھی نہیں، امام کو امام جانتے ہیں پیغمبر نہیں مانتے، مفسر کو مفسر مانتے ہیں الہامی نہیں جانتے، مجتہد کو مجتہد کہتے ہیں۔ خاتم المجتہدین نہیں سمجھتے ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کی دین و دنیا درست ہو، ہزاروں روپے اپنے خرچ کرنے میں، دل و جان سے ہر وقت اسی کے خواستگار ہیں، اپنا جان و مال مسلمانوں کے واسطے وقف کر رکھا ہے، چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں مالدار ہو جائیں اور دین میں

ایماندار، یہ من کر وہ سید احمد خاں کی تعریف کرنے لگا، ہندوستانی نے کہا بہت اچھے آدمی ہیں اور عرب نے کہا طیب، جناب مولانا علی بخش خاں صاحب بہاؤر جب تک مکہ معظمہ میں رہے ان کو یہی شکل رہا، جب مدینہ منورہ میں گئے وہاں بھی انھیں فتوؤں کی فکر نہ تھی، حالانکہ مدت قیام مدینہ منورہ کی تھوڑی تھی یعنی آٹھ سات روز کہ ضروری کام اور زیارات طیبات بھی مشکل سے انجام ہوتے ہیں۔ مولانا صاحب اسی انتظام میں رہے، سوالات کا مسودہ مسجد نبوی میں روزانہ سطرہ کے زور سے ہوا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہتے اور اس کی بحث ہوتی رہتی مولانا صاحب شہاب ثاقب اور ایک اور رسالہ کی کئی جلدیں لے گئے تھے وہ بھی وہاں تقسیم فرمائیں سید احمد خاں صاحب کا کفر اولاً سلام اور ان کے کفر کے فتوؤں کا ملا ان کا حال بیان کرنے والوں پر منحصر ہے، نہ مکہ والے ان کو جانیں نہ مدینہ والے ان سے واقف، اگر کوئی چاہے تو سو فتوے ان کے اسلام کے حرمین شریفین سے واقعی حال بیان کر کے لاسکتا ہے سید احمد خاں صاحب کا اسلام مسلمانوں کے دلوں پر نسلاً بعد نسل کندہ ہوتا چلا جائے گا اور تھوڑے عرصہ بعد سید احمد خاں صاحب کے نام کے ساتھ محنت و مجدد کا لفظ لکھنا، شروع ہو جائے گا، ان کے اسلام کے ثبوت میں کاغذ اور سیاہی کی مدد ضرور نہیں، خوبانت کفر کی بے وہ کفر کی بے اور جو اسلام کی بے وہ اسلام کی بے بیا احمد خاں صاحب صرف اس سبب سے کہ حرمین شریفین کے عالموں نے ان کے کفر کے فتوے دیدیے، کافر نہیں ہو سکتے جیسے یہاں کے عالم ہیں ویسے ہی وہاں کے، صرف زبان کا فرق ہے، انھیں کتابوں سے وہاں والے فتوے لکھتے ہیں انھیں سے یہاں والے :-

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ ہندوستانی مولویوں کا جو کہ مغلمہ میں رہتے ہیں۔  
 ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”دو تین مولانا صاحبوں کے سلسلے میں نے سید احمد خاں  
 صاحب کی تعریف کی اور واقعی حال اُن کا بیان کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ فلاں  
 مولانا صاحب یا حکیم صاحب یا قشی صاحب ابھی ہندوستان سے آئے ہیں۔  
 وہ اس سکتے خلافت کہتے ہیں، تم ہرگز سید احمد خاں کا کہنا نہ مانو، ورنہ کافر ہو جاؤ  
 گے میں نے کہا بہت اچھا سید احمد خاں صاحب کا کہنا نہ مانوں گا، اُن کو برابر جانوں  
 گا مگر پھر کس کا کہا مانوں! آپ کا! سزا آپ کر بھی تو فلاں مولانا کافر کہتے ہیں اس  
 کا کیا علاج! غرض ہندوستانی عالموں اور جاہلوں کا وہاں بھی یہی خراب حال  
 اور لڑائی ہے“

اگرچہ حافظ محمد حسین صاحب نے حرمین شریفین کے فتوؤں کی حقیقت  
 اپنے مضمون میں اچھی طرح ظاہر کر دی ہے پھر بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے  
 ساتھ عالموں کا سرسید کی تکفیر پر اتفاق کرتا اور حرمین شریفین کے مفتیوں اور  
 دیگر عالموں کا ان کے ساتھ ہم زبان ہونا بعض ناواقف لوگوں کو سرسید کے مسلمان  
 ہونے کی نسبت شبہ میں ڈالے اور ممکن ہے کہ بعض ناظرین کتاب کے دل میں  
 یہ خیال گذرے کہ تیس برس بعد ان وہ بے دباے فتوؤں کا سرسید کی لائف میں  
 ذکر کرنا گونا گوں کی تکفیر میں از سر نو جان ڈالنی ہے، مگر ہمارے نزدیک سرسید کی  
 لائف ناتمام رہتی اگر اُن فتوؤں کا ذکر اس میں نہ کیا جاتا تو حقیقت یہ کفر وارد نہ آد  
 کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سرسید کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہونے کے وثیقے  
 ہیں، یہ قلمی ہمیشہ انہیں لوگوں کو نصیب ہونے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے  
 خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چو کے، امام غزالی اپنے ایک رسالہ میں  
 لکھتے ہیں کہ ”جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اس کو حقیر جان! اور جس کو کافر اور

گمراہ نہ کہیں اُس کو ناچیز سمجھو۔ ابوالاثرہ علی مرتضیٰ نے جو ایمان کی تعریف بتائی ہے۔  
 یہ سچ ہے کہ ہم نے اپنے زمانہ میں اُس کا صحیح مصداق سید احمد خاں کے سوا کسی  
 کو نہیں دیکھا، وہ فرماتے ہیں۔ اَلْاِيْمَانُ اَنْ تُوْتِرَ الصَّدَقَ حَيْثُ يَضْرِكُ عَلٰى الْكُذْبِ  
 حَيْثُ يَبْقَعُ رَيْبِيْنَ اِيْمَانِ كَيْ يَرْسُوْا مَفْضِرًا مَّرْوِيًّا جَهْرًا وَجَهْرًا كَيْ يَكُنَّ مَفْصِيْدًا  
 اس وقت سچ کو جھوٹ سے مقدم سمجھا جائے، سرسید کو اپنی سچائی کی بدولت  
 صرف مسلمانوں ہی کی مخالفت کا نشانہ بننا نہیں پڑا بلکہ اکثر موقعوں پر محض ملک  
 اور قوم کی غیر خواہی کی بدولت جیسا کہ اُن کی بائبل گرافی جا بجا شہادت دیتی ہے۔  
 بڑے بڑے جلیل القدر مسرور اور حاکموں کی خشکی اور حد سے زیادہ ناراضی،  
 برداشت کرنی اور بعض اوقات اپنی جان کو خطر میں ڈالنا پڑا ہے۔ خدا تعالیٰ  
 نے ایمان کی سچائی کا معیار یہ نہیں بتایا کہ کسی مفتی نے اُس کے کفر کا فتوے نہ دیا  
 ہو بلکہ اس کا صحیح معیار آزمائش میں پورا ترسے کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:  
 ۱۰۰ اَحْبَبُ النَّاسِ اَنْ يَمُرَّ كُوَانٌ يَقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُوَ لَا يُفْتَنُوْنَ رِبْعًا كَيْ لَا يُوْجَدُ  
 اتنا کہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور اُن کی آزمائش نہ کی جائے گی اب  
 ہم پوچھتے ہیں کہ اس معیار کے موافق سید احمد خاں کا ایمان کامل ٹھیرا ہے یا اُن  
 لوگوں کا جنہوں نے اُس کو کافر اور واجب القتل ٹھیرا یا؟ خدا کے بعد جب  
 کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا، اور دین اسلام امن  
 اور انتظام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا، اس سے زیادہ تمہیت  
 اسلامی اور جو ش ایمانی کے امتحان کا وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؛ اُس وقت  
 اسی کافر واجب القتل کے سوا اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے نہ اُن مستفتیوں  
 میں سے کوئی اٹھا جنہوں نے اُس کے کافر و مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور  
 نہ اُن مفتیوں میں سے جنہوں نے اُس کے کفر و ارتداد کے فتووں پر آنکھیں بند

کر کے مہرباں اور دستخط کیے۔

”در بعد چراو کیے قال ہم کافر پس در سبہ ہند یک مسلمان بنو“

باوجود ان تمام مخالفتوں کے سرسید نے اپنے سخت ترین مخالفوں سے جب کہ وہ کفر اور واجب القتل ہونے کے فتوے تمام ملک میں شایع کر چکے تھے، التجا کی کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم جس میں سیری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے اس کا انتظام اور انتہام آپ اپنے ہاتھ میں لیجیے، میں اس میں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس پر مولوی امداد العلی نے ان کو لکھا کہ ”تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو و صدم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں“ مگر مولوی علی بخش خاں نے اس شرط پر منظور کیا کہ آپ کو اور آپ کی کمیٹی خزانۃ البضاعتہ کو امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہے اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دیں اس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اس کی آمدنی جائزہ صحت مذہبی تعلیم میں خرچ کی جائے۔ سرسید نے ان کی تمام شرطیں منظور کر لیں اور ان کو قواعد مدرسۃ العلوم میں داخل کر دیا اور مولوی صاحب کو لکھا کہ میں عنقریب یہ تمام خط و کتابت ممبران کمیٹی خزانۃ البضاعتہ کے پاس بھیج کر منظوری حاصل کر لیتا ہوں۔ اگرچہ بعض ممبروں نے اس بات سے سخت اختلاف کیا کہ کمیٹی خزانۃ البضاعتہ کو تعلیم مذہبی سے کچھ تعلق نہ رہے، مگر کثرت رائے سے وہی تجویز جو مولوی علی بخش خاں چاہتے تھے، منظور ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ اہلسنت کے مشہور دیندار عالموں میں سے جس بزرگوں کی خدمت میں درخواست کی جائے کہ وہ تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت کی کمیٹی کے ممبر انتخاب کریں۔ البتہ اتنا گناہ ہو گیا کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب کرنے والوں میں بشمول مولوی



علی بخش خاں علمائے اہل سنت کے بہت سے نام کیٹی کی خزانۃ البصائر نے خود بنجوزیہ کر دیئے اور منجملہ میں بزرگوں کے دو یا تین ممبر خزانۃ البصائر کے بھی مذہبی کمیٹی کے ممبر انتخاب کرنے کے لیے نامزد کیے گئے جس وقت مولوی علی بخش خاں کے پاس اس روڈاد کی نقل پہنچی وہ سخت ناراض ہونے آٹھ سو روپیے کا چھندہ جو انھوں نے مدرسۃ العلوم میں دیئے کا وعدہ کیا تھا اس کے دینے سے انکار کیا اور مدرسۃ العلوم کی مذہبی کمیٹی کے اہتمام وغیرہ سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے جن دین دار عالموں سے درخواست کی گئی تھی کہ کمیٹی مذہبی کے ممبر انتخاب کریں ان میں سے اکثر نے جواب تک نہیں دیا اور مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہر گاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔

ان تمام واقعات کی طرف سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جناب حاجی مولوی سید اعدا العسلی صاحب نے لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرنا ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں" اگرچہ اس امر کو اس بات سے جو پیش کی تھی کچھ تعلق نہ تھا یا اینہم میں اس کو قبول کر لیتا مگر مجھے خیال ہوا کہ اگر ہمارے محب قلبی منشی چراغ علی صاحب اہل شیعہ مذہب رکھتے تھے (مجھ سے کہیں کہ تم ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں) تو پھر میں کیا کروں گا! بقول شخصے کہ "گوری کا جو بن چٹکیوں ہی میں گیا" میرا تو یوں ہی نکالوٹی ہو لے گا۔ جناب مولوی محمد صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو متعصیانہ جواب دیا اس ہر شخص جس کو خدا نے عقل اور محبت اور حب ایمانی دی ہوگی نفرت کرتا ہوگا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علیحدہ ہے جس سے اہل سنت



و جماعت کو کچھ تعلق نہیں، پس یہ کہنا کیسا بیجا تعصب ہے کہ ہر گاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لیے ہم شریک نہیں ہونے۔ خدا کرے کہ وہ خیال فرما کر کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں، مگر معظمہ کو سدھاریا مگر افسوس ہے کہ میں سنا ہوں حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں۔“

”افسوس ہے کہ شیعہ کُسنی میں اس زمانہ میں یہ نسبت اس زمانہ کے جب کہ امام محمد اسماعیل بخاری شیعوں سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں فرماتے تھے، نفاق اور شقاق بہت زیادہ ہو گیا ہے، مگر حالت زمانہ کی ایسی ہے کہ اگر شیعہ اپنے تعصب سے سنیوں کو چھوڑیں اور سنی اپنے تعصب سے شیعوں کو چھوڑیں تو دونوں غارت اور برباد ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں، عہدوں میں کم ہیں، اگر پھر ان میں سے بھی شیعہ کُسنی و خارجی و تاحبی اور وہابی و بدعتی کا فرقہ پرشے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہے! ارے کجنت متعصبو! تم آپس میں لڑنا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر کہا کرنا مگر جو بات سب کے فائدے کی ہے اس میں کیوں ایک دل ہو کر شریک نہیں ہوتے! عالمگیر نے ایک عامل کی یہ دیانتی کا ذکر نظیر کسی دوسرے عامل سے کیا، اس نے عرض کیا ”محضور! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔“ عالمگیر نے کہا ”بلے، مگر بوقت خوردن ہم برابر بیٹھتے۔ پس اے بزرگو! اس بات میں کیوں تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہے۔“

”جناب سید الحاج مولانا حاجی علی بخش خاں صاحب سے جو معاملہ پیش آیا

۱۔ خدا کا شکر ہے کہ سرسید کی چیخ بکار سے ہمارے علماء اب اس تفرقہ کو مٹانے کی فکر میں ہیں چنانچہ

ندوستانہ العلماء نے سب فرقوں کو شریک کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض علماء اس کے خلاف ہیں۔ ۱۲۔

وہ تو پشت الیام ہے، ان کی اور ہماری تو وہی مثل ہو گئی۔ ”من ترا حاجی بگویم تو سرا  
 حاجی بگو۔“ یعنی وہ ہم کو بدعہد کہتے ہیں ہم ان کو بدعہد کہتے ہیں۔ مہر حال کسی نے  
 بدعہدی کی ہو، وہ بات جس سے کھٹرتا پڑ گئی ہو اس قدر ہے کہ تمام امور  
 تسلیم مذہبی تنہا جناب ممدوح کو کیوں نہ سپرد کیے گئے دیگر بنہ گان دین کو  
 کیوں شریک کیا، واهلہ الاشفاق صین۔“

سر سید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیت اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی  
 تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اس کا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اس سے پاجا ہاتا کہ مسلمانوں  
 کو دین و مذہب کی کچھ پر وا نہیں رہی، چنانچہ اسی خیال سے سر سید اکثر کہا کرتے  
 تھے کہ ”جو لوگ میرے مخالف میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف  
 ہوں اور میرے خیالات سے اسلام کو نقصان پہنچانا ہے پس جو کچھ کہ وہ اپنی  
 دانست میں اس خیال سے کرتے ہیں اس پر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ  
 مذمت کے“ مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ زیادہ مخالفتیں محض نفسانیت  
 خود غرضی، یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لیے بجائے اس کے کہ سر سید کے  
 اقوال جو انھوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جہور کے خلاف سمجھے ہیں راست  
 راست بلے کم و کاست بیان کیے جلتے۔ بیسیوں ہاتیں ان کی نسبت غلط مشہور  
 کی گئیں، ان کی تفسیر کی نسبت اس بات کو عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں  
 نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لیے ہیں اور بیس نکال ڈالے  
 ہیں، اکثر یہ بھی ستا گیا کہ انھوں نے سورۃ الرحمن میں ”فبأی الاعداء یؤمنون“  
 صرف ایک جگہ رکھا ہے باقی مگر سمجھ کر سورت میں نکال ڈالی ہے۔

مولوی علی بخش خاں نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سر سید کے  
 خلاف لکھی تھی اور جس کی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شایع کرنے کو لے

گئے تھے اس میں بشمار عقائد سرسید کی طرف ایسے منسوب کیے ہیں جو بالکل خلاف واقع ہیں، مثلاً یہ کہ مادہ مثل ذات باری تعالیٰ ازلی ہے، یا ذات باری تعالیٰ خود مادی ہے، یا یہ کہ باوجود قانون قدرت کے بعثت انبیاء کی ضرورت نہیں، یا یہ کہ جب علوم جدیدہ یا انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں ضعف پیدا ہو گا تو مذہب اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے۔ یا یہ کہ نبوت انبیاء نے سابقین یا کتب سماویہ کے انکار سے، یا معاذ اللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اس کے پھینک دینے سے، یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھیرانے سے، یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے، یا ہمیشہ و دوزخ اور قیامت کے انکار سے یا ضروریات دین کے انکار سے آدمی کافر نہیں ہوتا، یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزہ فرض نہیں ہو سکتے، یا تھوڑی سی شراب جو پچکا متوالانہ کر دے یا اتنا جو کھیلنا جو بے قید و بناوے حرام نہیں ہو سکتا، یا یہ کہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینا ہے اور وہی واسطے ادا نے فرض کے کافی ہے، باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے وہ اصول مختصرہ و علماء کا اتباع ہے۔ اسی طرح اور مہبت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کیے گئے ہیں جن کو سرسید نے اپنے معنون واقع البہتان میں ایک ایک کر کے لکھا ہے اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھے جاتے ہیں کہ "لعنة الله على قائله وعلى معتقده" مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اس خیر خواہ خلاق پر لگائے جاتے تھے۔ اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ انہوں نے اپنا سردس ہزار روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز ان کا سر کاٹ کر لندن لیجائیں گے اور لندن کے عجائب خانہ میں رکھیں گے۔

ایک بار یہی سز بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا، اس وقت راقم بھی موجود تھا اس مرحوم نے نہایت کشادہ دل کے ساتھ فرمایا کہ "جو چیز خاک میں مل کر خاک ہو جانے والی ہے اس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دانشمند لوگ اس کو روپیہ دے کر خریدیں اس کے ڈسٹیکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں، اور اس کی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے اس ہزار چھوڑ دس روپے بھی اگر اس کی قیمت میں ملیں تو میرے نزدیک نعمت ہیں۔"

بمذہب ان بشمارا تہلمات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو ۱۸۷۶ء میں بمقام بنارس ان پر لگایا گیا۔ سرسید پیش لے کر علی گڑھ آنے سے چند مہینے پہلے، جب کہ حضور پرنس آؤف ویز بنارس میں تشریف لائے، ان کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفاخانہ بنارس میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قائم کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی اس کے ایک ممبر سرسید بھی تھے، کمیٹی کی درخواست پر میونسپلٹی بنارس نے شفاخانہ کے لیے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس میں علاوہ اور کچے گھر والے کے ایک چھوٹا سا خانہ چوترا بھی تھا جس کو مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لیے عارضی طور پر بنا لیا تھا۔ میونسپلٹی نے خود اس میدان کو صاف کرادیا اور جس طرح اور گھروں کے مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلوا یا تھا اسی طرح اس چوترا کے معاوضہ میں ۳۲ روپے دینے تجویز ہوئے، سرسید نے اس خیال سے کہ یہ قلیل رقم مسلمانوں کے کس کام آئے گی، نواب لٹنٹ گورنر سے جو ان دنوں بنارس آئے ہوئے تھے، عرض کر کے اسی میدان کے قریب مسجد کے لیے ایک دوسرے قطعہ کے ملنے کی اجازت دلوا دی اور شفاخانہ کے چندے میں سے دھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلوا کر وہاں

مسجد تعمیر کراوی بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکر گزار ہوئے اور مسجد کے پیش طاق پر یہ بیت کندہ کرائی تجویز کی۔

۷ " در آوان سعید و از برائے طاعت نیز دراں

بن گروید این مسجد ز سعی سید احمد خاں "

مگر سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی۔

بنارس میں تو یہ کارروائی بوری تھی اور تمام ہندوستان کے ویسی اخباروں میں یہ لکھا جا رہا تھا کہ سید احمد خاں نے شقاخانہ کے واسطے مسجد منہدم کراوی۔ یہ شور و شغب ایک مدت تک ہندوستان کے نالائق اخباروں میں رہا مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا۔ آخر سوسائٹی اخبار کے ایڈیٹر نے ایک پرچہ میں لکھ دیا کہ ہم اصل حالات دریافت کر کے اپنے اخبار میں چھاپیں گے۔ سرسید نے ایڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھ کر اس کو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کرنے کے لیے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو کہنے دیں۔ چند روز بعد ایڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی کہ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کیا کیونکہ سرسید سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا۔ آخر علیگڑھ اخبار کے ایڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶ مئی ۱۸۷۷ء کے پرچہ میں تمام حال اول سے آخر تک بحوالہ کاغذات مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا اب اخباروں میں یہ چھپنا شروع ہوا کہ نہایت افسوس ہے نہ سرسید نے اصل سے مطلع کیا اور نہ سوسائٹی اخبار کے ایڈیٹر نے مدت تک اس وقت واقعہ پر کچھ روشنی ڈالی۔ تب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک آرٹیکل لکھا جس میں تمام اخباروں کے اقوال، جو سرسید کے برخلاف لکھے گئے تھے، نقل کر کے ہر

ایک پریچہ پر جلد جدا ریمیاک کیے ہیں۔ انہاں جگہ اودھا خیار میں جس کے ادھیڑ اُس وقت مرحوم غلام محمد خاں تپش تھے، یہ فقرہ چھپا تھا "اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا، یعنی اُس وقت جب کہ سید صاحب کی بدنامی تمام دنیا میں مشتہر ہو چکی" اس پر سرسید مرحوم نے نہایت لطیف ریمارک کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "اس کے غدر میں نہایت ادب سے اپنے شفیق کے سامنے حافظہ کا یہ شعر پڑھتا ہوں:

در کوئے نیک نامی مارا گذرندا دند

گر تو نمی پسندی تغیر کن قصارا

لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے یہ "مضمون نہایت دیر میں چھپا، یعنی اس وقت جبکہ تمام اخباروں کی بدنامی دنیا میں ہو چکی" پھر لکھتے ہیں "ہم کو امید ہے کہ خدا وہ دن بہت جلد لائے گا کہ ہماری قوم بدنام کے صحیح معنی سمجھے گی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے۔"

اسی طرح بیسیوں اہتمام سرسید پر، مدرسۃ العلوم پر، اس کے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے، مدرسہ کی نسبت ایسی خبریں اڑائی جاتی تھیں جن سے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اُس کے معادلوں کو بیخ اور مخالفوں کو خوشی ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک تنگ اسلام داخل اسلام نے مشہور کر دیا کہ جس کو ٹھی میں اپنی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اُس کی چھت گر چڑھی اور بیس تیس طالب علم اُس کے بیچے دب گئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں مگر جو مثل مشہور ہے کہ "اپنا گھٹنا کھولے اور آپ ہی لاجوں مرے" ایسی باتیں بیان کرنے سے سوا اس کے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالائقی سارے زمانہ میں مشہور ہو



اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جب سرسید کے کفر وازنداد اور واجب القتل ہونے کے فتوے سے اطراف ہندوستان میں شایع ہوئے تو اُن کی جان لینے کی دھمکیوں کے گناہم خطوط اُن کے پاس آنے لگے، اکثر خطوں کا یہ مضمون تھا کہ "ہم نے اس بات پر قرآن اٹھایا ہے کہ تم کو مار ڈالیں گے: ایک خط میں لکھا تھا کہ "شیر علی جس نے لارڈ ڈیو کو مارا تھا اس نے نہایت حماقت کی اگر وہ تم کو مار ڈالتا تو یقینی بہشت میں پہنچ گیا ہوتا۔" ۱۸۹۱ء میں جبکہ سرسید کالج کی طرف سے ایک ٹرپوٹیشن لے کر حیدرآباد گئے تھے اور حضور نظام (خلد اللہ ملکہ) کے اس بشیرِ راغ میں وہاں تھے ایک مولوی نے ہمارے سامنے سرسید سے یہ ذکر کیا کہ کلکتہ میں ایک مسلمان تاجر نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنا چاہتا تھا اس بات کی مجھ کو بھی خبر ہوئی، چڑکھ میں علیگر ٹھہر کر اُس نے والا تھا اس سے خود جا کر ملا اور اُس سے کہا کہ میں علیگر ٹھہرانے والا ہوں اور میرا ارادہ سید احمد خاں سے ملنے کا ہے، جب تک کہ میں اُن کے عقائد اور مذہبی خیالات دریافت کر کے آپ کو اطلاع نہ دوں آپ اس ارادہ سے باز نہیں چنانچہ میں علیگر میں آیا اور آپ سے ملا اور دریافت حالات کے اُس کو کھ بھیجا کہ سید احمد خاں میں کوئی بات ہے، نے اسلام کے خلاف نہیں پائی تم کو چاہیے کہ اپنے منصوبے سے توبہ کرو اور اپنے خیالِ خام سے تاوم ہو، معلوم نہیں کہ اس مولوی کا یہ بیان صحیح تھا یا غلط مگر سرسید نے جو یہ حال سن کر اس کو جواب دیا وہ لطف سے خالی نہ تھا۔ انھوں نے کہا "افسوس ہے کہ آپ نے اُس دیندار مسلمان کو اس ارادہ سے روک دیا اور ہم کو ہمارے بزرگوں کی میراث سے جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں، محروم رکھا۔"

ایک دفعہ فاضل علی گڑھ میں کسی نے بذریعہ گناہم تحریر کے سرسید کو یہ دھمکی دی کہ اگر آئندہ تم گاڑی میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی سے ماہر نکلے تو تمہاری خیر نہیں، میں بندوق مارے بغیر برگز نہ رہوں گا مگر سرسید نے ان دھمکیوں کا کبھی کچھ خیال نہیں کیا، نہ ان کی کسی عادت میں فرق آیا اور نہ انہوں نے اپنی حفاظت کا کبھی کوئی خیال انتظام کیا۔ سرسید کی وفات سے چھ ماہ پہلے ایک مخالفت گروہ کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ ان کا ارادہ سرسید کے قتل کرنے کا ہے اور فی الحقیقت اس گروہ کا جوش اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ ان سے ایسی حرکت کر بیٹھنا کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سرسید کے بعض احباب نے ان سے کہا کہ آپ سوار ہونا چھوڑ دیں اور کچھ ٹولید چوکیدار رات کے پہرے کے لیے کوٹھی پر مقرر ہونے چاہیے اور ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کوئی اجنبی شخص بلا اطلاع اور بغیر تفتیش حال کے کوٹھی کے اندر نہ آسکے، سرسید یہ باتیں سن کر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے صلاح کار دوستوں کو نادان اور وسواسی سمجھتے ہیں اور ایسا انتظام کرنے کو ایک نہایت سبک حرکت خیال کرتے ہیں، چنانچہ کسی طرح کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کسی کے آنے جلنے کی روک ٹوک کی گئی، نہ چوکیدار رکھے گئے نہ سوار ہونا موقوف ہوا۔

۱۸۸۸ء میں جب پہلی بار محمد بن ایچو کیشنل کانفرنس کا منعقد ہونا لاہور میں قرار پایا تو خان بہادر برکت علیاں، جن کی شکرید سے لاہور میں اس جلسہ کا ہونا قرار پایا تھا ان کے ایک مخالفت کی طرف سے کانفرنس کی تاریخوں سے ایک دن پہلے ایک نہایت گستاخ تحریر سرسید کے نام پہنچی جس میں علاوہ اور نالائق باتوں کے نہایت بڑے لفظوں میں یہ مطلب بھی ادا کیا گیا تھا کہ تم کانفرنس میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا اور جو حال کل رات کو خاں بہادر کا کیا گیا ہے اس

سے بدتر تمھارا حال کیا جائے گا۔ سرسید نے جو وقت علیگڑھ سے لاہور کی روانگی کا مقرر تھا اس میں کچھ تبدیلی نہیں کی صرف خان بہادر کی خیر و عافیت دریا کرنے کے لیے چلنے سے پہلے ان کو تار دیا اور جب ان کی خیریت معلوم ہو گئی تو فوراً لاہور کو روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچ کر وہ سحریریا نھوں نے خاں بہادر اور سردار محمد حیات کو دکھائی۔ دونوں صاحب ان گستاخیوں کو دیکھ کر جو سرسید کی نسبت کی گئی تھیں شدت غیظ و غضب سے از خود روتے ہو گئے۔ کاتب کی نسبت یقین ہو گیا تھا کہ اخبار رفیق ہند کا ادوٹیر ہے اور سرسید نے خود اس کا خط اچھی طرح پہچان لیا تھا، بالنتیجہ اس مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ کاتب خط کی اس حرکت سے درگزر کی جائے اور اس کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ خود اس تحریر کے لکھنے سے انکار کرتا تھا۔ مگر خان بہادر اور سردار صاحب اور دیگر اہل پنجاب نے سرسید کی سفارش اس کے باب میں منظور نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنا اخبار، جو غالباً بند ہو گیا تھا، چھتہ مدت بعد پھر جاری کیا پہلے یہی اخبار سرسید کا حد سے زیادہ طرفدار اور مداح و ثنا خواں تھا چنانچہ ۱۸۸۷ء میں جب سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور لاہور میں پہنچے تو اسی اخبار میں سرسید کی نسبت ایک لمبی مدحیہ عبارت تھی تھی جس کے سرے پر یہ شعر لکھا تھا:

”مرحبا سید اولادِ نبی مدنی جاں جاں باو فدائیت کہ وحید زمنی“

مگر جب دوسری بار یہ اخبار جاری ہوا تو سرسید کی مخالفت میں تمام اگلے پچھلے مخالفوں سے گونے سبقت لے گیا۔ وہی شخص جس کی نسبت پہلے ”سید اولادِ نبی مدنی“ لکھا گیا تھا اس پر چہ میں کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جو اس کی طرف منسوب نہ کی گئی ہو اور کوئی آلہ لوگوں کو اس سے بدظن کرنے کا ایسا نہ تھا جو

اس پر چہ نہیں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ سرسید کے دوست اس کی زبان درازیاں دیکھ کر گبرگرتے تھے اور اس کا جواب کہنے پر آمادہ ہوتے تھے مگر سرسید سب کو منع کرتے تھے اور کسی کو اس سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "موسم کی آمدھی ہے چند روز میں خود بخود فرد ہو جائے گی"۔

اب سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ایک مدت تک بند رہ کر تیسری بار پھر جاری ہوا ہے اور چشم بددوراب بھی باوجود اس کے کہ سرسید دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اپنی وضعداری بنا ہے جاتا ہے لیکن اب سرسید کا نام حجاز کم تیا ہے بلکہ جو کچھ سرسید یا ان کے کاموں کے برخلاف لکھنا ہوتا ہے اس کو علی گڑھ مشن پر فعال دیتا ہے مگر ہم خوش ہیں کہ سرسید کی مخالفت کی بدولت اب کی بار اس میں خود بخود ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو ملک کے حق میں نہایت مفید ہے وہ برخلاف ان اخباروں کے جو ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں دونوں قوموں میں آشتی اور مصالحت کی بنیاد ڈالنا معلوم ہوتا ہے اس کی یہ پالیسی جیسا کہ اس کے مخالفت خیال کرتے ہیں کسی غرض پر مبنی کیوں نہ ہو ملک کے حق میں بہر حال مفید ہے۔

ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر ان کے پاس بھیجے جس میں بہت سی باتیں خلاف واقع درج تھیں اور جا بجا ان کی تنقیص کی گئی تھی اور موٹے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اس پر یہ ریمارک کر کے اخبار میں چھپوا دیا "ایک ہمارے شفیق نا شبانہ نے جن سے ہم سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ہم خود واقف نہیں ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ رہا بھی حسب حال لکھتے ہیں"۔

اے آنکہ مراندیدہ شناختہ نادیدہ تصورم جہاں ساختہ  
 با ایزوبے مثال مانند نیم حقا کہ ندیدہ و شناختہ  
 سب سے زیادہ سرسید کا ذکر خیر و سچ اخباروں میں ہوتا تھا جن کے اڈیٹر اور  
 پیرو پرائیڈر عموماً مسلمان تھے اور گرم بازاروں میں صرف اس بات پر منحصر تھی کہ اپنی قوم  
 کے خیر خواہ اور جاں نثار پر پھتیاں اڑائیں اس کے کارٹون بنائیں اس کی ہجو  
 کے اشعار شایع کریں اس کی غویوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح نہ صرف  
 آپ کو بلکہ تمام قوم کو جس کے مذاق پر اخباروں کی برائی بھلائی کا انحصار ہے دینا  
 میں رسوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آواز سے آواز سے سنتے  
 سنتے ان کے عادی ہو گئے تھے یہاں تک کہ جس اخبار میں ان پر کوئی چوٹ نہ  
 ہوتی تھی اس کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک  
 لکھتے ہیں " ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لوٹے چھپڑا  
 کرتے تھے اور جب وہ چھپڑے والے نہ ہوتے تو کہتی کہ کیا آج بازار کے  
 لوٹے مر گئے۔"

اسی طرح سرسید کی تمام تحریریں جو اس مخالفت کے زمانہ میں تہذیب الاخلاق  
 میں چھپی تھیں نہایت لطیف اور دلچسپ ہوتی تھیں ازاں جملہ دو تین فقرے  
 مختلف مقالات سے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں " ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ صلیح  
 سہارنپور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی... ایک صاحب نے کہا کہ "سہارے تو  
 کرستان مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسکی کرستان سے ہوگی" یہ نقل سنگھ  
 میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو تو اس  
 کرستانی خطاب پر ہزار مسلمان نثار ہے... صاحب نے ایک ناواقف

شاعر سے پوچھا کہ صاحب کیسا شعر کہتا ہے اس نے نہایت دلی جوش سے کہا کہ  
 ”آں قمر ساق بہ خوش میگوید“ صاحب کہتا ہے کہ ”جیسی عزت مجھ کو قمر ساق کے  
 لفظ سے حاصل ہوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں“ اسی طرح خدا  
 کرے کہ یہ لفظ کرستان کا میرے لیے عزت قومی کا باعث ہو۔

ایک جگہ لکھتے ہیں ”حضرات ہماری تو وہی مثل بے دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ  
 کا، اندر برادران دور واز بیگانگان نفور، ایک گوشہ میں پڑا ہوں، نزدیک و دور بیگانہ و بیگانہ  
 سے لعن و طعن سنتا ہوں، جس طرح بیگانگان مجھ سے نفرت کرتے ہیں برادران وطن  
 بھی الا ماشاء اللہ اسی طرح متنفر ہیں۔ فقور یہ کہ اپنی دانست میں بھائیوں کا بھلا  
 چاہتا ہوں، ان کی عام رائے کی مخالفت سے نہیں ڈرتا بلکہ جو ان کے بھلے کی بے  
 وہی کہتا ہوں، یہی کینت خصلت ہے جس نے مجھ کو اس حال پر پہنچایا ہے۔“

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں ”دنیا میں کوئی نہیں رہا، پیر نہ پیغمبر نہ زاہد خدا پرست نہ  
 فاسق نفس پرست، سب کو گذرنا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں، بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی  
 نہ ہو، کہ حضرت مرزا جانچنا ماں، ظہر علیہ الرحمۃ، جن کو یہ لحاظ ان نسبتوں کے جو مجھے  
 اس خاندانہ سے ہیں ناز سے پر دادا کہنا زیا ہے، ان کا یہ شعر میری فاک مرقد کا  
 کتا بہ ہو گا۔“

بلوچ تربت من یا فندار غیب تحریر ہے

کہ ایں مقول اجز بیگنا ہی نیست تصحیر ہے

میرسید نے جو لباس و طعام اور طرز ماند لود اور طرز معاشرت وغیرہ میں تعلیم  
 یافتہ ترکوں کا طریقہ اختیار کیا تھا اس سے انگریزوں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا  
 کرنا مقصود تھا مسلمان تو اس طریقہ کو ناپسند کرتے ہی تھے بلکہ اس کو عیسائی ہو  
 جانے کے برابر سمجھتے تھے مگر تماشایہ ہے کہ بعض مستصحب اور مغرور انگریز بھی اس



سے نہایت ناراضی ظاہر کرتے تھے اور گویا اس بات کا ثبوت دیتے تھے کہ انسانی اخلاق میں منو کے زمانہ سے آج تک باوجود اس قدر علمی اور عقلی ترقیات کے ایک ذرہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی اور جو فرق منو نے شدر اور برہمن میں رکھا تھا وہی فرق اس زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے شائستہ لوگ حاکم و محکوم میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اگرچہ فیاض طبع اور کشادہ دل انگریز جو ہندوستان میں رہ کر انگلستان کے اصلی جوہر یعنی آزادی کو کھو نہیں بیٹھتے وہ ان باتوں کا کچھ خیال نہیں کرنے اور ہندوستانیوں سے خواہ وہ کسلی لباس میں ہوں تاکہ بھوں نہیں چڑھانے مگر تھکل انگریزوں کو ہرگز گوارا نہیں کہ ہندوستانی جو ہماری جوتیوں کے تلے ہیں وہ ٹرکس کوٹ تپلون اور ترکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہن کر ہم سے ملنے کو آئیں، چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات ان لوگوں کو جو وضع اور لباس میں سرسید کی پیروی کرتے تھے سخت مشکلیں پیش آئیں بلکہ خود سرسید اسی روک ٹوک کے سبب بعض یورپین افسروں سے، باوجودیکہ برسوں ایک جگہ رہے، کبھی نہ مل سکے، مگر جس بات کو انھوں نے اپنے نزدیک بہتر سمجھا کسی کی مخالفت کے خوف سے اس کو ترک نہیں کیا، جیسا سمجھا ویسا ہی کہا اور وہی کیا، جب کبھی ان کو معلوم ہوا کہ کسی افسر یا حاکم اعلیٰ نے ہندوستانیوں کے یورپین ڈریس پر اعتراض کیا ہے فوراً اخبار میں اس کا جواب لکھا یہاں تک کہ جب لارڈ ڈفرن نے اسی تبدیل وضع کے خلاف ایک عام مجمع میں کچھ تقریر کی اور وہ اخباروں میں چھپی تو سرسید نے ایک نہایت زبردست آرٹیکل اس کے برخلاف لکھ کر اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس طرح کبے شمار آرٹیکل سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں ان کے لکھے ہوئے موجود ہیں جو مسلمان سرسید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے قلذہ اٹھانا چاہتے تھے، چنانچہ مولوی امجد علی اپنی ایک تخریر میں لکھتے

ہیں۔ بعض اہالیان ہند نے واسطے دھوکا دینے حکام وقت کے اپنا طریقہ مذہبی اور لباس لگی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے بوطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جاگٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کاٹے سے کھانا اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکام وقت جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے اپنا مخلص اور مطیع اور سپرو جائیں اور ان کے محکومین ہم کو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں۔ سو نتیجہ ان کے غریب طینت کا کہ مکروہ و غائبے یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغا باز سمجھنے کے ان کو اچھا نہیں جانتے اور ان کی وضع اور حال چلن کو پسند نہیں کرتے :-

باوجود ان مخالفوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سرسید نے چونکہ مخالفہ میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا بغیر اشد ضرورت کے کبھی اس کو ترک نہیں کیا نہ وہ خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے چنانچہ ان کو بہت سی تحریریں دکھینی گئی ہیں جن میں انھوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں کا جواب دینے سے روکا ہے۔ بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپوانے پر نہایت شرمندہ کیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسہ تھا اور کہاں تک وہ سلف کے اس پے مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ "مَا ذَلَّ ذُو حَقٍّ وَ لَوْ اَتَقَّ الْعَالَمَ عَلٰی خِلَافِهِ"

انھوں نے ۱۸۶۹ء میں ولایت سے سوسائٹی اخبار کے ادیب کو لکھا تھا "رد و قدح پر نتوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانہ میں مثل جھوٹے موتی کے بے آب ہو جاوے گی، خواہ وہ بات خروا جس شخص کی (یعنی میری) ہو اور خواہ اس کے مخالف کی پس میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جو لوگ میری بُرائی لکھیں آپ بلا تکلف اپنے

اخبار میں نقل کیجیے، صرف اس کی صحت اور عدم صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ  
دیجئے امید ہے کہ آپ اپنی عنایت سے سیری التماس کو قبول فرمائیں گے :

لیکن اگر کسی انگریز کا مضمون سرسید کے خیالات یا مدرسۃ العلوم کے خلاف  
کسی انگریزی اخبار میں پھینتا تھا تو اس کا جواب دیئے بغیر کبھی نہ رہتے تھے اور اگر ایسے  
مضامین کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ چھپوا دیتے تھے۔ جس زمانہ میں انہوں  
نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اکثر یورپین افسران کے مخالف ہو گئے  
تھے اور جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے، کمپنی نے مدرسہ کے لیے جس قطعہ زمین  
کے ملنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی تھی ضلع کے حکام اس کا ملنا نہیں چاہتے تھے  
خصوصاً ڈاکٹر سر رشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب اور صاحب کلکٹر ضلع علیگڑھ سخت  
مخالف تھے یہاں تک کہ جو مضمون کسی انگریزی اخبار میں مدرسہ یا بانی مدرسہ کے خلاف  
چھپتا تھا سرسید کو انہیں دونوں صاحبوں پر اس کے کہنے کا گمان ہوتا تھا، چنانچہ انڈین  
آبزرور سپتمبر ۱۸۶۲ء میں جو ایک سخت آریکل مدرسۃ العلوم اور سرسید بلکہ تمام  
مسلمانوں کے برخلاف چھپا تھا اس پر سرسید کو یہی خیال ہوا کہ ان دونوں افسروں  
میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے، اس پر سرسید نے دو آریکل تہذیب الاخلاق میں لکھے جن  
کا انگریزی ترجمہ ساتھ ہی ساتھ چھپایا تھا اس میں سے چوتھے فقرے ہم اس مقام پر نقل  
کرتے ہیں۔

”انڈین آبزرور سپتمبر ۲۸ ستمبر ۱۸۶۲ء میں آریکل لکھنے والے نے ہم کو دینی مسلمانوں  
کو سخت تکبر اور متعصب کہا ہے اور یہی سبب ہم کو گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں  
سے کم فائدہ حاصل کرنے کا فرسودا ہے۔ اس آریکل کو پڑھ کر اول اول تو ہم کو بہت  
تردد اور خوف معلوم ہوا، تردد تو اس باعث کا ہوا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے، سٹری پی آئی۔

کا! یا مسٹر سی ایس کا! اور خوف اس بات کا جو اگر کچھ لے گا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کبھی ہمارے ملک کا لفٹنٹ گورنر ہو جائے اور مسلمانوں کی زندگی اس کے ہاتھ میں پڑ جاوے مگر چونکہ اس آرٹیکل کے مضمون اکثر وہ ہیں جو مدت ہوئی کہ ہم سن چکے تھے اس لیے وہ ہمارا تردد اور خوف و دواں جاتے رہے۔

”مگر ہم کہتے ہیں کہ ہاں ہم (یعنی مسلمان) تکبر بھی ہیں اور متعصب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقہ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آوے اور ہم تعلیم بھی پاویں۔“

”انڈین آئیر وے کا آرٹیکل لکھنے والا ہم کو طعنہ دیتا ہے کہ ”خاص مسلمانوں کے کالج قائم کرنے کے لیے کافروں (یعنی انگریزوں) سے کیوں مدد لی جاتی ہے! اور یہ بھی لکھتا ہے کہ ”اگر ایسا مدرسہ خود مسلمانوں ہی کی کوشش سے قائم ہو گا تو یہ ترقی و بہتری کی دلی خواہش کا ثبوت ہو گا، لیکن اگر لارڈ ہارٹھ بروک صاحب جیسے لوگوں کی سخاوت سے قائم ہو گا تو کچھ دلی خواہش کا نشان نہ ہو گا۔“ اگرچہ ایسا لکھنا ایک عیسائی کو خصوصاً اس قوم والے کو جس سے ہم نے مدد مانگی اور جو اپنے نہیں انسان کی خیر خواہ اور سچی دوست سمجھتی ہے، یہی نہ تھا مگر ہم دل سے قبول کرنے ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے بالکل صحیح اور بالکل سچ ہے اور اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ نہایت لائق ہے شرم ہے جیسا اور تمام دنیا کی قوموں میں ذلیل ہوگی جو اب بھی ایسے طعنے مٹا کر اس مدرسہ کے قائم ہو جانے میں دل و جان سے روپیہ سے اور کوشش سے مدد نہ کرے گی۔“

”انڈین آئیر وے میں آرٹیکل لکھنے والا ہماری ناقص انگریزی کی ہنسی اڑاتا ہے

مگر ہم کو اس سے کچھ رنج نہیں کیونکہ یہ جو کچھ بے اندین ایجوکیشنل سسٹم کی مددگی کا ثبوت ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں اور ہمارے ملک کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی ایس ہی تسلیم ہے اور صرف ہماری ہی ایسی تعلیم نہیں بلکہ ہزاروں دہزاروں کی ایسی تسلیم ہے اسی لیے اس سے بھاگتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔

پھر دوسرے آرٹیکل میں اسی اندین آبزورڈ رائے آرٹیکل کی نسبت ایک جگہ لکھتے ہیں "سلیکٹ کیٹیگری خاصہ ترقی تعلیم مسلمان ہیں یہ سوال بحث میں آیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اثر ایسا کیوں نہیں ہوتا جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے؛ سو اس کا جواب اندین آبزورڈ کا آرٹیکل لکھنے والا یہ دیتا ہے کہ "ان کو یعنی مسلمانوں کو، گورنمنٹ کی ذات سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سورد سے بالوں سے ریشم کی ٹھیلی بنا دے" پس اب ہم اپنی قوم سے پوچھتے ہیں کہ علم کے دیوتانے ہم کو سورد کا خطاب دیا ہے، آیا ہم کو اس خطاب میں خوش رہنا چاہیے یا کوشش کر کے اور اپنی حالت کو درست کر کے دنیا کو تبدیلنا چاہیے کہ اس خطاب کا مستحق کون تھا؟

دوسرا جواب اسی سوال کا اس آرٹیکل لکھنے والے نے یہ دیا ہے کہ "جس شے پر اس کا (یعنی تعلیم کا) اثر ہوتا ہے وہ دونوں ملکوں (یعنی ہندوستان اور انگلستان) میں مختلف ہے گو آلہ دونوں کا ایک ہی ہو مگر زیرہ یا نگر سے ایک روٹن میرا پائل نہیں بن سکتا" پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ہماری قوم کو سنگریزوں میں اور کنکروں میں پڑا رہنا اور ہر ایک کی ٹھوکریں کھانا اور دشنام سننا ہی پسند ہے یا اپنی حالت میں کچھ ترقی کرنے کا ارادہ ہے؛ یہ سچ ہے کہ جو شخص بد زبان کسی کی نسبت استعمال میں لاتا ہے وہ خود اولاً اپنے آپ کو ان سولائیڈ ثابت کرتا ہے۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ اُس آرٹیکل کا لکھنے والا ہم کو شکبر اور سخت متعصب بتاتا ہے حالانکہ وہ ہم سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، مگر ہم کو اس پر خیال کرتا نہیں چاہیے۔ بلکہ جو لفظ ہمارے دشمن نے بھی ہمارے حق میں کہے ہوں ان سے بھی ہم کو نصیحت پکڑنی چاہیے۔“

”ایک مقام پر اُس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے ”کیٹیج کو مناسب ہے کہ... اس امر کی تفتیش کرے کہ آیا اُس قوم یعنی مسلمانوں میں کبھی کوئی بڑا فلسفی یا شاعر پیدا بھی ہوا ہے جو ایمان داری کے ساتھ اپنی نسبت خود یہ باتیں بیان کرے جو کمیٹی نے بیان کی ہیں“ اگر اس عبارت کا یہ مطلب ہو کہ ہمارے ملک کے ڈائریکٹر پبلک انٹرکشن کے وقت میں یعنی ان کے طریقہ تعلیم کے اثر سے (کوئی شخص ہماری قوم کا ایسا بنو ہے یا نہیں؟ تو اس کا تو جواب صاف ہے کہ نہیں اور اگر کبھی کے لفظ سے غیر مفید زمانہ مراد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آرٹیکل کے لکھنے والے کو دوبارہ کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر ہسٹری آف فلاسفی اور ہسٹری آف انٹیل لٹریچر پڑھنی چاہیے۔“

انڈین آئیزور کے مذکورہ بالا آرٹیکل میں جو سخت الفاظ مسلمانوں کی نسبت استعمال کیے گئے ہیں اور جن کا جواب سرسید کو بھی کسی قدر سختی کے ساتھ دینا پڑا ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اینگلو ایڈنیٹر کے خیالات مسلمانوں کی نسبت کیسے تھے اور وہ مسلمانوں کی قوم کو کس قدر ناقابل اور ان کی تعلیم کے لیے کوشش کرنے کو کس قدر بے سود اور لاعامل سمجھتے تھے اور مدرسۃ العلوم کی نسبت کیسے مخالفانہ خیالات رکھتے تھے۔ یا اب یہ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ آج اسی قوم کے تمام اعلیٰ افسر اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکام اور اہل کلن سلطنت اس مدرسہ کے صرف مداح و شاخواریں ہی نہیں بلکہ دل سے اس کے مددگار ہیں۔



اور اُس کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی نسبت اُن کے وہ خیالات نہیں رہے جو اب سے ستائیس برس پہلے تھے تو ایک عجیب انقلاب معلوم ہوتا ہے اور عجیب ہوتا ہے کہ سرسید کی کوشش، حین تدبیر صبر اور استقلال نے اس قلیل عرصہ میں مدرسۃ العلوم اور مسلمانوں کی حالت کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔

# سرسید کی کامیابی اور اُس کے اسباب

سرسید کو اپنے مقاصد میں جو غیر متوقع کامیابی گذشتہ تیس برس کے اندر  
 اندر ہوئی وہ اس حد سے گذر گئی ہے کہ لوگوں کو باور کرانے کے لیے اس کا ثبوت  
 دینے کی ضرورت ہو، پس بجائے اس کے کہ اُس کا ثبوت پیش کیا جائے اُس کے  
 اسباب کا سراغ لگانا بہتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جو امر تیس برس پہلے محال معلوم  
 ہوتا تھا اس قدر جلد وقوع میں آجانا بلاشبہ اُس کے اسباب کی عظمت پر دلالت  
 کرتا ہے اور چونکہ قوم کو ابھی سرسید جیسے مہبت سے کامیاب شخصوں کی ضرورت  
 ہے اس لیے امید ہے اُن کی کامیابی کے اسباب کا بیان کرنا فائدہ سے خالی  
 نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ سرسید کی کامیابی کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ انھوں نے جتنے  
 کام کیے وہ سب زمانہ کے مقتضا کے موافق کیے اور اس لیے زمانہ خود اُن کی تائید  
 کرنے والا تھا، پس اُن کی کامیابی اسی قدر تعریف کے لائق ہے جیسے اُس  
 تیراک کی تیرائی جو دریائے بہاؤ پر بے تکان تیرتا چلا جاتا ہے۔ مگر ہمارے  
 نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے، زمانہ کا تقاضا اور چیز ہے اور زمانہ  
 کا اقتضا اور چیز، بے شک زمانہ کا تقاضا میں تھا کہ مسلمان اپنی حالت درست  
 کریں، وقت کی ضرورتوں کو سمجھیں اور خواب غفلت سے بیدار ہوں مگر اُس  
 کا اقتضا بالکل اس کے برخلاف تھا، اس کا اقتضا وہ تھا جو ملکہ سببانے

سیلان کا پیغام سن کر اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ "اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا اَقْرَبِيَّةً  
اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اِيَّهَا اَهْلًا اَدْلَةً" حکمران قوم جب مفتوح ہوتی ہے خواہ فاتح قوم  
دانشمند اور منصب مہر اور خواہ وحشی اور ظالم، دونوں صورتوں میں اس کا میلان  
پستی اور تنزل کی طرف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس کو درحقیقت گورنمنٹ  
نہیں گراتی بلکہ وہ آپ ہی اپنے بل میں گرتی چلی جاتی ہے جس چال پر وہ قدیم سے  
چلی آتی ہے اس کے خلافت دوسری چال چلنا اس کے لیے ایسا ہی دشوار ہوتا ہے  
جیسے کسی جسم کا اپنی حینر طبیعی کے خلافت حرکت کرنا۔ مفتوح قوم کو گو کہ اس کی  
اقبال مندی کا زمانہ بالکل ختم ہو گیا ہو، مدت دہرا تک اقبال مندی کے خیراب برابر  
نظر آتے رہتے ہیں اور اس کی امیدوں کا طلسم بدستور بندھا رہتا ہے۔ ان کو  
اپنی پستی اور تنزل کا شعور مطلق نہیں ہوتا اور اپنے حالت کی اصلاح کا کبھی بھول  
کر بھی ان کے دل میں خیال نہیں گذرتا۔ اگر بالفرض اپنے تنزل پر متنبہ ہوتے ہیں  
تو اس کو زمانہ کی ناانصافی اور اپنی حق تعالیٰ پر محمول کرتے ہیں، اپنی تالافتی کی طرف  
برگز منسوب نہیں کرتے اسی بھلاوے میں وہ گرتے گرتے اس گہرے گھرے  
میں جا پڑتے ہیں جہاں سے مچھرنانا ممکن ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایسی ہی حالت تھی، وہ کچھ تو ڈیڑھ سو برس  
سے لپٹا ہونے چلے ہی آتے تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ واقعہ ۱۹۰۵ء نے ان کو  
اور بھی بچھے گرا دیا اب ان کے اٹھرنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی تھی  
اور وہ وقت کچھ دور نہ تھا کہ امریکا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح  
لک میں ان کا عدم اور وجود برابر ہو جائے۔ پس اگر دنیائی الواقع عالم اسباب ہے  
تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اب تک جو  
کچھ اپنی پوٹنکل حالت میں ترقی کی ہے وہ صرف سرسید کی چہل سالہ کوششوں

کا نتیجہ ہے۔

کنزل گریہیم سرسید کی لائف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "غدر کے زمانہ میں اور اس کے بعد بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی رہی۔ اس خوفناک زمانہ کے تمام مکروہات ان کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تعصب (یعنی انگریزوں کا) زیادہ تر بیجا تھا۔ مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات ان کو بری معلوم ہوتی تھی۔ بظاہر کسی شخص نے ان کی حمایت کی ہامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اس کی قدرت میں تھا اس نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر بنا دیا۔"

تھیوڈور مارلین اپنے اس آرٹیکل میں جو سرسید کی وفات کے بعد مئی ۱۸۷۸ء کے کالج میگزین میں چھپا تھا، لکھتے ہیں کہ "غدر سے پہلے اور اس کے بعد چند سال تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر ان کو ترقی دیتے اور ان کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رہنما مند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو فی الحال اینگلینڈ انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے یہ سرسید ہی کی تلقین کا نتیجہ ہے۔ اس نے مسلمانوں کے دل میں جہاں نفرت اور بدگمانی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا وحشت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلایا کہ مسلمان وفادار ہیں۔"

اکیڈمی نام ایک ولایت کا اخبار مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۸۵ء کنزل گریہیم کی لائف اور سید احمد خاں پر رپورٹ کرتے ہوئے لکھتا ہے "کم سے کم اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کوئی وفاقہ فرودگذاشت کرنا نہیں چاہیے۔ کروسیڈ کا زمانہ گزر گیا۔ اب اسلام دوسری جانب جوش ظاہر کر رہا ہے۔ اگرچہ اولڈ فیشن مسلمان سولیزیشن کی ترقی کے مخالف ہیں

مگر ان میں ایک آزاد خیال گروہ بھی موجود ہے۔ یہ گروہ صرف شرکی ہی میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ اس ملک (یعنی انگلستان) کے لیے جو مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا مالک ہے، نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی نسبت عمدہ واقفیت حاصل کرے۔ اس سوال کے فیصلہ پر کہ آیا اسلام اور شائستگی باہم موافقت رکھتے ہیں یا نہیں، پانچ کروڑ آدمیوں کی آئندہ زندگی کا مدار ہے۔ کیا یہ آبادی (یعنی ہندوستان کے مسلمان، روز بروز مخالف ہوتی جائے گی) اس کے سرگروہ ممبر جماعت کے ساتھ کسی جگہ ہمدردی کریں گے تاکہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں جو اور ملکوں میں ہیں پٹے جائیں؟ اگر ایسا ہے تو انگلستان جس قدر جلد مصائب کے مقابلے کے لیے تیار ہو اسی قدر بہتر ہے مگر اس مسئلے میں کرنل گریم کی کتاب ”سید احمد خاں“ نے ایک خفیہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو مغربی خیالات کی ہمدردی کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھاتی ہے جو ایک انگریزی زبان سے ناواقف شیخ العرب کے خون نے ظاہر کیا ہے۔

غرض کہ یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں کہ سرسید کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی کوششیں زمانہ کے مقصدنا کے موافق تھیں، بلکہ ان کی کامیابی صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو کوششیں استقلال، دانائی اور راست بازی کے ساتھ کی جاتی ہیں وہ زمانہ کے اقتضا پر غالب آسکتی ہیں۔

سب سے بڑا ثبوت اس بات کا کہ زمانہ کا تقاضا جب تک کوئی زبردست ہاتھ اس کی پشتی پر نہ ہو، کچھ نہیں کر سکتا، یہ ہے کہ مدت دراز سے گورنمنٹ ہندوستان میں تعلیم نسواں جاری کرنا چاہتی ہے اور بیس پچیس برس سے تمام تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اس کا جوش پھیلا ہوا ہے، اخباروں اور میگزینوں میں

سب سے زیادہ اسی مضمون کا زور شور ہے، بیسیوں ناول اور رسالے اسی باب میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، جا بجا اسی غرض سے کمیٹیاں قائم ہیں اس سے زیادہ زمانہ کا تقاضا اور کیا ہو سکتا ہے! مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اس کا کوئی زبردست حامی مثل سید احمد خاں کھڑا نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ ان کی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور اخلاق بالطبع موجود تھے جو ایک ریفاہر کی ذات میں جمع ہونے ضرور ہیں۔ ریفاہر کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز سچائی اور راستبازی ہے کہ جس بات کو وہ اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھے، اگرچہ ایک زمانہ اس کا مخالف ہو، اس کے ظاہر کرتے ہیں کچھ پس و پیش نہ کرے۔ راستبازی کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے رنجیتہ کی چٹائی جو عین برسات کے موسم میں کی جائے۔ راستبازی آدمی کو بلاشبہ بہت سی مخالفتوں کا نشانہ بنا پڑتا ہے اور اس لیے اس کی کامیابی میں بہت دیر لگتی ہے، مگر جو ردا ایک دفعہ رکھا گیا پھر اس کو جنبش نہیں ہوتی، سرسید کو اپنی راستبازی کی بدولت بعض اوقات جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا بیان ہوا ہے، سخت خطرناک پیش آنے ہیں مگر بہت جلد وہ تمام خطرے رفع ہو گئے اور راستی نے اپنا پایدار نقش دلوں پر بچھا دیا۔ استقلال جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "الصبر مفتاح الفرج" وہ بھی بغیر راستبازی کے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس کو اپنے کام پر چھروسا نہیں ہوتا وہ کبھی اپنے ارادہ پر قائم نہیں رہ سکتا چنانچہ سرسید نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، سید مہدی علی خاں کو ولایت سے لکھا تھا کہ "جوں جوں مخالفتوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے وہں دوں نیکی ٹہرتی گئی ہے، پس اگر میرا کار بار سچا اور میری نیت نیک ہے تو انشاء اللہ تمہارے اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا"

اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ میں سرسید کا رسوخ و اعتبار سب سے



بڑھ کر ان کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔ بلاشبہ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اُس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس خیال کو ایک خاص حد تک صحیح مانا جاسکتا ہے مگر جس طرح سرسید کے رسوخ سے اُس کی تائید ہوئی ہے اسی طرح مزاحمت بھی کچھ کم نہیں ہوئی، اسی رسوخ و اغتبار کی بدولت ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں۔ ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لاندہب بنانا منظور ہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لیے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو، اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اس لیے غلط تھا کہ حالت موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔

بہر حال سرسید کے رسوخ سے مدرسہ کو یقیناً بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے۔ خصوصاً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ نے سرسید کا حوصلہ ہی متنبہ نہ بڑھایا بلکہ اُن کے ارادوں میں جان ڈال سے اور جتنے نقصت گورنمنٹ کو غرضاً مندرجہ شمال مغرب میں اور جتنے دائرے کالج کے قیام کے بعد آئے سب نے کالج پر سر بیانا نہ توجہ مبذول رکھی ہے، مگر ریفرامیشن کے عظیم الشان کام میں، بجائے اس کے کہ رسوخ ممد و معاون ہوا ہو، اُس نے اور اُنہی مزاحمت کی ہے۔ ہر ایک قوم اور خاص کر مسلمانوں کی قوم مذہبی خیالات کا مصلح اگر کسی کو تسلیم کر سکتی ہے تو اُس شخص کو کر سکتی ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوں جو مذہبی تقدس کے لیے درکار ہیں نہ کہ ایسے شخص کو جس میں بظاہر اس قبیل کی کوئی حیثیت نہ پائی جانے لگے۔ سزا سزا کی زندگی ایک دنیا دار آدمی کیسی زندگی ہو خصوصاً سلطنت میں تقرب اور رسوخ پیدا کرنا عام اس سے کہ مسلمانوں کی ہویا انگریزوں

کی۔ مذہبی تقدس کے بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے باوجود اس کے سرسید نے لاکھوں مسلمانوں کے دل میں اپنی اکثر اصلاحیں بنی نشین کر دیں پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ اور اعتبار مطلقاً ان کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی اصل سبب ان کی راستبازی اور سچائی ٹھیرے گی کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیشنل کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا جب تک کہ اس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر تپایا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔

سب سے زیادہ ان کے کاموں میں مدد اور ان کے ارادوں کو تقویت ان کے دوستوں نے دی ہے اور یہ بھی ایک نتیجہ ان کی راستبازی اور خلوص کا تھا، فی الواقع سرسید کو محض اپنی صداقت اور بے ریا محبت کی بدولت ایسے سچے دوست اور اعوان و انصار ملے جو اس زمانہ میں نادر الوجود اور عجائب روزگار سے تھے، شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرسید کے اعوان و انصار ان کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھ کر ان کے کاموں میں مدد دیتے تھے، سو اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا ان کے دوستوں اور مددگاروں میں جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان کو اپنا مذہبی پیشوا جانتا ہو یا ان کے تمام اقوال اور تمام ریلوں کو تسلیم کرتا ہو، سرسید کے بہت سے دوست ایسے بھی تھے جن کو فوری معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، بعض ان کی کوششوں پر ہنستے تھے اور ان کی جدوجہد کو ریلیرگیاں سمجھتے تھے مگر ہر کام میں مدد دینے کو دل و جان سے حاضر تھے جب چندہ کی ضرورت ہوتی تھی پیسے دوستوں سے مانگا جاتا تھا پھر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پیرا جاتا تھا، اگرچہ مقام اس بات کا مقتضی تھا کہ ان تمام بزرگوں نے جس ذوق و شوق سے سرسید کے کاموں میں مدد دی ہے اور جس

اننگ اور چاؤ سے مدرستہ العلوم کے چندوں میں شریک ہوئے ہیں اور جو پیش بہا  
خدیق میں قوم کی ان سے بن آئیں ان کو مفصل بیان کیا جائے خصوصاً اس وجہ سے کہ سرسید  
کی آخری تمنا جو پوری نہ ہوئی، یہ تھی کہ ایک کتاب بطور تذکرہ احباب کے اپنے قلم  
سے لکھی جائے، مگر امید ہے کہ جو شخص مدرستہ العلوم کی ہسٹری لکھے گا وہ اس فرض کو فراموش  
نہ کرے گا کیونکہ یہ ذکر اسی موقع سے زیادہ مناسب رکھتا ہے۔

لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا صرف مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس کا مری کے  
ہانکتے میں گویا برابر کی جوت تھا، اگر اس موقع پر اس کا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک  
سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا۔ اس شخص سے  
ہماری مراد محسن الملک سید مہدی علیخان ہیں جو تمام قوم کے اتفاق سے سرسید کے  
بعد ان کے جانشین ہوئے ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سرسید کو  
سمجھا، ان کی سچائی کو پرکھا، ان کے منصوبوں کی تمناہ دریافت کی اور ان کے مقاصد کی  
عظمت کا اندازہ کیا۔ ان کا اس وقت ساتھ دیا جب کوئی ساتھی نہ تھا، اور اس وقت  
مدد دی جب کسی سے مدد کی امید نہ تھی سرسید ولایت میں عطیات احمدیہ لکھ رہے  
تھے اور سید مہدی علی بندوستان سے اس کے لیے میٹرل بھیجتے تھے وہ ولایت میں  
اس کو چھپوا رہے تھے اور یہ بندوستان سے اس کی چھپائی کے لیے چندہ وصول  
کرنے کے روانہ کرتے تھے۔ جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور کمیٹی خواستگار  
ترقی تعلیم مسلمان قائم کرنی چاہی اس وقت ان پر عجب مایوسی کا عالم تھا، جو منصوبے  
دل میں باندھ رکھے تھے ان میں سے کسی کے پورا ہونے کی امید نہ تھی۔ سید مہدی علی مرزا  
پور سے بندر گئے اور سرسید کی ڈھارس بندھوائی چنانچہ کمیٹی بڑی رھوم دھام سے  
قائم ہوئی، جب کمیٹی نے اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مسلمان سرکاری کالجوں  
اور اسکولوں میں کیوں نہیں پڑھتے، انعامی رسالے لکھانے کا اشتہار دیا، سپر

مہدی علی نے نہایت کوشش سے ایک بسرط ایسے لکھا جو سب رسالوں میں اول درجہ کا تسلیم کیا گیا اور پانسو کا انعام جس کے وہ مستحق تھے، اپنے سے نیچے درجہ کا رسالہ لکھنے والے کو دلورایا۔ جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا اور سرسید نے ریفرنس میں کام علی الاعلان شروع کیا۔ سید مہدی علی پہلے شخص تھے جنہوں نے نہایت دلیری سے سرسید کی تائید میں مضامین لکھنے پر کمر باندھی جو معزز خطاب مولوی اور واعظ سرسید کو دے رہے تھے سید مہدی علی نے بھی ان کا استحقاق پیدا کیا اور کفر کے فتووں کی بوچھاڑ جو کیلئے سید پر پڑ رہی تھی آدھی اپنے سر پر لی۔

سرسید کی تحریریں اکثر نشتر کا کام کرتی تھیں مگر سید مہدی علی کی تحریروں نے سرہم کا کام کیا، سرسید ہمیشہ مسلمانوں کو نصریں و ملامت کرتے تھے، اگلے علما کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے، جو کچھ اپنی تحقیق ہوتی تھی، اکثر بغیر اس کے کہ سلف کے اقوال سے اس پر استشہاد کریں، حوالہ قلم کر دیتے تھے، سید مہدی علی نے مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے قوم کے دل بڑھائے اور جو کچھ سرسید کی تائید میں لکھا مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے لکھا، ان کے اکثر مضامین بجائے خود بڑے بڑے رسالے ہیں جو نہایت چھان بین اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں، جہتہ سب الاخلاق کے مضامین لکھنے میں باوجود اس کے کہ ان کی صحت ہمیشہ نازک حالت میں رہی ہے وہ اس قدر نہک ہو گئے تھے کہ سرکاری کام میں حرج واقع ہونے لگا، سنا ہے کہ ان کے بالادست افسر کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے سرسید کو لکھا کہ سید مہدی علی کو سمجھاؤ وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوں ورنہ مجبوراً ان کی نسبت رپورٹ کرنی پڑے گی۔

مدرسۃ العلوم کو جو مالی مدد انہوں نے اپنی جیب سے اور اپنی کوشش سے پہنچائی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، سرسید کے کیا درجہ کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق وہ اکثر اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کبھی نہیں کی، ہمیشہ سرسید

کا دل ہاتھ میں رکھا اور مدرسہ کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ سرسید کی رائے کا ہر حال میں اتباع کیا جائے۔ اگر سرسید نے ان کی رائے کے خلاف بھی کسی تجویز پر زور دیا اس کو بھی طوعاً و کرہاً منظور کر لیا اور یہ سمجھا کہ اگر ان کی رائے فی الواقع غلط ہے تو اس کا تدارک ممکن ہے لیکن اگر مزاحمتوں کے سبب مدرسہ کے کام سے ان کا جی چھوٹ گیا تو اس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔

حیدرآباد سے آکر انھوں نے علیگڑھ ہی میں رہنا اختیار کیا اور بہت سے عملی کام مدرسہ کے متعلق انجام دیے۔ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے کی تمہیریں کیں اور اس کی طرف مسلمانوں کو خاص توجہ دلانی اور خود ہر ایک اجلاس میں نہایت مضید لکچر اور اسپچیں دیں۔ پھر بیٹی میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کو مدرسہ اور کانفرنس کی طرف متوجہ کیا یہاں تک کہ انھوں نے کانفرنس کو بھیجی ہیں بلایا مگر سرسید کے کبریا کے سبب وہاں کانفرنس کا منعقد ہونا موقوف رہا۔ سرسید کی وفات سے پہلے وہ پھر علیگڑھ میں آئے اور ان کے اخیروم تک وہیں رہے اور اس آخری رفاقت میں بھی دوستی اور محبت کا حق پورا پورا ادا کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی قومی خدمات میں ان سے ظہور میں آئی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اس مرحوم کے بعد کوئی شخص محسن الملک سے زیادہ ان کی جانشینی کے لیے مناسب نہ تھا۔ انھوں نے اپنی صحت اور طاقت سے بڑھ کر چندہ جمع کرنے میں کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

باوجود ان تمام خدمات کے اپنے ہر ایک کام کو ہمیشہ سرسید ہی کی طرف منسوب کیا اور اپنے متنبی ایک مشین سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا۔ اٹارہ کے ایڈریس میں جب لوگوں نے ان کی قومی خدمات کی تعریف کی انھوں نے اس کے جواب میں صاف صاف کہہ دیا کہ ان خدمات کو میری طرف منسوب کرنا نہایت ہے۔ اس تعریف



کاسپدا احمد خاں کے سوا کوئی مستحق نہیں۔ سرسید کے بعد ان کا جانشین بننے کی جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے ان کو مطلق خواہش نہ تھی مگر تقریباً تمام ٹرسٹی، تمام کالج اسٹا، تمام کالج سٹوڈنٹس، صوبہ کے تمام اعلیٰ حکام اور انسر جو کالج کے یہی خواہ تھے، تمام ڈیپٹیٹ، جو پچھلے سال بمقام لاہور محترم ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے تمام مسلمان اخیار اور عموماً تمام مسلمان جن کو قومی معاملات سے دلچسپی تھی، سب اس بات پر متفق تھے کہ ان کو کالج ٹریشینرز کا سکرٹری بنا جا جائے اس لیے ان کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ اس جوڑے کو اپنے کندھے پر رکھیں۔

الغرض سرسید کو ایسے دوستوں کا ملنا جن کا لوہا محض الملک کو ایک عمدہ نمونہ سمجھنا چاہیے، ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا اور یہ محض ان کی رستبازی اور قوم کی سچی ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ ایسے ایسے سرخ زریک خود بخود آگر جاں میں پھنس جاتے تھے اور اس زمانہ پر جو آزادی میں گذرا تھا انوس کرتے تھے جیسا کہ نظیری نے کہا ہے۔۔۔

”نالہ از بہر ہائی نکتہ سرخ اسیر خور و افسوس زبانی کہ گرفتار بنود“

ایک اور خدا ساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان جنہوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اس لیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے، سرسید کی منادی پر وہ اس طرح دوڑے جیسے پیاسا بانی کینٹے دوڑتا ہے انہوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ یہ بے کہ سرسید اور ان کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں انہوں نے ہر ایک صوبہ سے زیادہ رٹ کے تعلیم کے لیے بھیجے، ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی، سرسید



کی ہر قسم کی اصلاحیں انھوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انھوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی، بیہوشی کے ان کو زندہ دلان پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی طرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کو دنیا اور دین دونوں کا پیمانہ خواہ اور شیر اندیش سمجھا۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سرسید کو ملنی چاہیے تھی اس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کے ہاں کسی صوبے سے ادا نہیں ہو سکا اور جو تقویت برٹش گورنمنٹ کی امداد اور حضور نظام کی فیاضی اور بعض دیگر ریاستوں کے عطیوں سے ہوئی پنجاب کے عام مسلمانوں نے اس سے کچھ کم تقویت سرسید کو نہیں پہنچائی سرسید کی کامیابی کے اسباب میں اگر کالج اسٹاٹ کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی نا انصافی ہوگی، خصوصاً یورپین اسٹاٹ کے بعض ممبروں نے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب ہونے کے کالج کے انتظام اور اس کو ترقی اور فروغ دینے میں درحقیقت سرسید کے دست و بازو کا کام کیا ہے انھوں نے صرف اپنے منصبی فرائض پر جن کے لیے وہ بلائے گئے تھے بس نہیں کی بلکہ سرسید کے خاص مشن میں جس پر کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی، معتد بہ حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کالج کو گورنمنٹ اور مسلمانوں کا معتد علیہ بنایا اور اس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا کیا جس کی وجہ سے سرسید کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی طرف سے بالکل نچنت اور فارغ ہال ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اقوال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی دراندہ قوم کے سچے خیر خواہ اور ان کی ترقی کے دل سے آرزو مند ہیں، مگر درحقیقت یہ سب نتیجے اسی مرحوم کی بلاستنازی اور صاف دلی کے تھے اگر وہ یورپین اسٹاٹ پر پورا پورا اعتماد

نہ کرتے اور کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی باگ ان کے حوالہ نہ کر دیتے تو سرگز  
امید نہ تھی کہ یورپین پروفیسر نے معمولی فرائض سے ایک ایسے آگے بڑھنے  
کا ارادہ کرتے۔

اگر سرسید کی فطرت میں صرف راستبازی ہی کی صفت ہوتی اور اس کے  
ساتھ فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نہ ہوتی تو شاید ان کی کامیابی میں وہ زیادہ دیر لگتی  
بلکہ ممکن تھا کہ ان کو اپنی کوشش کا پھل اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر  
نوش قسمت سے ان کے ظرف میں زہر و انگبین دونوں موجود تھے گو ان کی راست  
گوئی نے بہت سے لوگوں کو بد کیا مگر فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نے ایک زمانہ  
کو ان کی طرف جھکا دیا، انھوں نے ابتدا سے اخیر تک جس کام کے لیے چندہ  
کھولا اس میں سب سے پہلے خود سبقت کی اور اپنی بساط اور حیثیت سے  
مراتب بڑھ کر دیا۔ وہ ایک بانی مددگار کی نسبت اپنے ایک دوست کو دلائی  
سے لکھتے ہیں: "انسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ نہ فرمایا کہ خود بانی نے جو  
فضل الہی سے اپنے شہر کے تمام مسلمانوں میں زیادہ ذی مقدر ہیں، کس قدر  
روپیہ دیا اس وقت البتہ آپ کی لعنت ملاحت محتاجان شہر پر، جو مان مشینہ  
کو محتاج ہیں، درست و بجا ہوتی ہیں سو سائشی کے لیے سب سے بھیگ مانگتا  
ہوں مگر وہ ہزار کئی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہے۔ پس ایسی  
حالت میں اگر میں آپ سے سو روپے دینے کو کہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

اس کے سوا عزم جزم اور دلیری جو ہر کامیابی کی جڑ ہے اور دنیا کے تمام  
کامیاب شخصوں میں ہمیشہ دیکھی گئی ہے، سرسید میں معمولی آدمیوں سے  
بہت بڑھ کر تھی، وہ مشکل سے مشکل کام کو جب ضروری سمجھ لیتے تھے بغیر  
تردد اور تذبذب کے اس کو فوراً کر بیٹھتے تھے اور جب کسی کام

کے کرنے یا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے تھے پھر کبھی اُس میں پس و پیش نہ کرتے اس کے سوا اُن میں اور اکثر خصوصیتیں ایسی تھیں جن کے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام دنیا میں انجام نہیں پاسکتا جیسے مستعدی، جفاکشی، وراثت کی پابندی، خرم و احتیاط وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور خدا داد قابلیت اُن کی فصاحتِ بیان تھی جس میں سچی ہمدردی کے جوش نے کشش مقناطیسی پیدا کر دی تھی اور چھاپے کی آزادی نے اُس کے لیے ہر ایک میدان صاف کر دیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا اور گورنمنٹ کی طرف سے زبانون پر مہر لگی ہوئی ہوتی تو سرسید کو اس طرح کھیلے بندوں اپنی باتیں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملتا مگر یہ بات فراموش کرنی نہیں چاہیے کہ جس وقت انھوں نے رسالہ اسبابِ نبوت لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا وہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ اس وقت کسی کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی چنانچہ کسی قدس اُن کو اپنی جرأت اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا، بعض جلیل القدر انگریز اُن کے سخت مخالفت ہو گئے جس سے کچھ دنوں وہ مارشل لا کی زد میں رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا تو بھی شاید چشمہ اُبلے بغیر نہ رہتا۔

## سرسید میں مختلف لیاقتوں کا جمع ہونا

ایک شریف اور لائق انگلشمن نے جب کہ سرسید زندہ تھے، ہمارے سامنے ان کا ذکر کرتے وقت یہ کہا تھا کہ "یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فرد کمال ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، وہاں بھی کیا اب بلکہ نایاب ہیں۔" اسی لیے اللہ آباد میں ایک عام جلسہ کے موقع پر ایک لائق اور فاضل پنڈت نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم مسلمانوں سے دوستی میں زیادہ ہیں۔ تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خاں نہیں ہے، بلکہ اگر ہم ہیں بھی مل کر ایک ہر جائیں تو بھی سید احمد خاں کے برابر نہیں ہو سکتے۔"

فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ جس شخص کو تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اسکول کی ہوا تک نہ لگی ہو اور جس نے چالیس برس کی عمر تک تعلیم میں کسی قسم کا شجرہ حاصل نہ کیا ہو وہ تعلیمی معاملات میں ایسا امتیاز پیدا کرنے کے علمی دنیا میں اس کو مسلمانوں کی تعلیم کا پروٹو ٹیپال کیا جائے۔ یا جس شخص نے ایک ایسی سوسائٹی میں ہوش سنبھالا ہو جہاں دو سو برس سے کسی نے پالٹکس کا خواب تک

نہ دیکھا تھا، وہ بغیر اس کے کہ کسی پولیٹیکل خدمت پر مامور رہا ہوا انگلش گورنمنٹ میں ایک رکن سلطنت خیال کیا جائے یا جو شخص مذہبی تعلیم میں متوسط سے بھی کم درجہ رکھتا ہو اور جس نے علوم جدیدہ کا ایک حرف کسی استاد سے نہ پڑھا ہو وہ مذہب اور سائنس میں مصالحت کرانے کا بیڑا اٹھائے اور اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال جائے۔ اسی طرح اور مختلف ایام میں جو اس شخص کی نوات میں جمع تھیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جو تعلیم یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔

اگرچہ سرسید کی تمام یا قوتوں کا اصل مخرج ان کی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر اس قابلیت کو قوت سے نعل میں لانے والی زمانہ کی ضرورتیں اور ان ضرورتوں کا پورا پورا احساس اور قوم میں ضرورتوں کے رفع کرنے والوں کا قحط تھا جس نے سرسید کو اس معاملہ کی طرح جو تعمیر کے لیے آپ ہی انہیں پکانے آپ ہی مصالحہ تیار کرے، آپ ہی پاڑ بانڈھے آپ ہی ٹوکری ڈھونڈے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چنے، ایک سرور ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا، دنیا میں عموماً کام کرنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں اور سوچنے والے الگ ایک مصنف مشکل سے ہماری دستگیراشی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ عمدہ کھنے والے اکثر عمدہ بولنے والے نہیں ہوتے۔ مذہبی تحقیقات میں مصروف رہنے والوں کو ملکی معاملات سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے، مگر جہاں سب چیزوں کی ضرورت ہو اور ایک سے سوا کوئی اس ضرورت کا احساس کرنے والا نہ ہو وہاں سب کام اسی ایک کو کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کبھی ایک کام پر ہاتھ ڈالتے تھے کبھی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ایک زمانہ میں انھوں نے اردو ڈاکٹرنری لکھنے کا ارادہ کیا، پھر اسی زمانہ میں اردو لٹریچر کی تاریخ لکھنے کے لیے بیٹریں جمع کیا، اس سے پہلے وہ صوبہ شمال مغرب میں ایک عظیم الشان

تیمیم خانہ کی بنیاد ڈالنے والے تھے، انگریزی زبان سے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے انھوں نے بڑے بڑے سامان کیے تھے، اگرچہ یہ سب کام ادھورے رہے مگر ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں قومی ضرورتیں ایک شخص کے سوا دوسروں کو محسوس نہیں ہوتیں وہاں ایک فرد واحد کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ سرسید کی فخرت میں مختلف بلکہ متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی جس کی نسبت مسٹر آرنلڈ نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی اسپیک میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے کہ ”دنیا میں بڑے آدمی اکثر گذرے ہیں مگر ان میں ایسے بہت کم نکلیں گے جس میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور یاقینتیں جمع ہوں۔ وہ یعنی سرسید، ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پبلیشن مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ بقدر ضرورت ان کی چند نمایاں یاقوتوں کا اس عنوان کی ذیل میں جدا جدا ذکر کریں۔“

## پائٹکس

اگرچہ یہ ظاہر سرسید کے پائٹکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیکوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر درحقیقت جیسا کہ ان کی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا یا کہا یا کیا اس کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پائٹکل حالت کی اصلاح سے علاقہ رکھتا ہے اس شخص نے نہ انگریزی تعلیم پائی تھی جس کے بغیر انگریزی طرز حکومت کا ذہن نشین ہونا فریب ناممکن کے تھا اور نہ ملک میں کوئی نظیر کسی ایسے پبلیشن کی دیکھی تھی جس کی تعلیم کچھ کام آتی اور نہ گورنمنٹ کی کسی ایسی خدمت پر مامور ہوا جہاں ملکی معاملات کا کچھ تجربہ حاصل



ہوتا۔ باوجود اس کے اُس نے اپنی مال اندیش اور سلیم طبیعت سے خود ہی اس شکل کو حل کر لیا اور ایک ایسا پوٹو شکل کو بس اختیار کیا جو بالکل صحیح اور بے خطا تھا۔ وہ سلطنت مغلیہ کے ایک قدیم متوسل گھرانے کا ممبر تھا اور خود دار الخلافہ کی خاک سے پیدا ہوا اور قطعہ مختلف کے سایہ میں نشوونما پائی، اس لیے یہ ایک نہ چرل بات تھی کہ فاتح کی حکومت وہ ایک ناگواری کی نظر سے دیکھتا، مگر اُس کی عقل اُس کی طبیعت پر غالب تھی، اس لیے قومی تعصبات اُس کو مشلوب نہیں کر سکے اُس نے دیکھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا اٹھنا کوئی اتفاقی یا غیر متوقع امر نہ تھا بلکہ فی الحقیقتہ اُن میں حکمرانی کی لیاقت باقی نہیں رہی تھی اور اُن کا دور پورا ہو چکا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ ہندوستان پر کونسی دوسری قوم حکمراں ہو، اُس نے انگریزی طرز حکومت کو نہایت غور سے دیکھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کے حق میں جہاں مختلف مذہب اور مختلف نسل کی قومیں آباد ہیں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں جو بتیں و ائمہ میں زبان کی مانند ہیں کسی قوم کی حکومت انگریزی حکومت سے بہتر نہیں ہو سکتی، پس بجائے اس کے کہ اُس نے برٹش حکومت کو ناگواری کی نظر سے دیکھا ہو، اُس کو مسلمانوں کی حکومت کا نعم البدل سمجھا اور اس کی غیر خواہی کو ٹاک اور قوم کی خیر خواہی کا ایک سب سے عمدہ ذریعہ خیال کیا۔

وہ جس قدر انگلش قوم کی دانشمندی اور شانستگی سے واقف تھا اُس سے زیادہ اُس کی ملکی اور جنگی طاقت سے باخبر تھا اس کو غدر کے ٹوک موقع پر جب کہ فی الواقع سلطنت کے ارکان متزلزل ہو گئے تھے اور بڑے بڑے سمجھدار آدمیوں کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط پھر قائم ہو گا، اگر چہ اپنی جان کے بچنے کی بہت کم امید تھی مگر انگریزی تسلط کے جلد از سر نو قائم ہو جانے

کا پورا یقین تھا۔ اُن کے ایک دوست جو اُس وقت بجنور میں تھے، اُن کا بیان ہے کہ "عین اُس بدامنی کے وقت، جب کہ تمام روہیلکھنڈ میں کوئی یورپین یا یوریشین باقی نہ تھا، سید احمد خاں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم و بیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی تسلط بدستور قائم ہو جائے گا، اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کے چہرے سے تو وہ اطمینان اور استقلال ظاہر نہیں ہوتا تھا جیسا سرسید کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جب کہ تمام ضلع بجنور میں نواب محمود خاں کی دوہائی پھر رہی تھی، نواب کے منہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ انگریزی عملدرمی جانے والی نہیں ہے، آپ ملک گیری کا خیال دل سے نکال ڈالیں اور جب کہ سرسید کا اثاثہ البیت اور کتابیں اور سب کچھ بجنور میں لٹ چکا تھا اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ تاریخ سرکشی بجنور کے لیے نہایت اطمینان کے ساتھ میسریل جمع کرتے جاتے تھے اور روزانہ تمام حالات قلمبند کرتے تھے اور تمام تحریریں جو کہ وہ نواب یا چودھریوں کو لکھتے تھے یا جو اُن کے پاس سے وصول ہوتی تھیں، یا وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے سب ہم پہنچا کر اپنی کتاب میں درج کرتے تھے۔ ایسا اطمینان، سوا اُس شخص کے جو ملکی معاملات میں پہلے نا تجربہ کار ہو یا جس کی رائے ایسے امور میں نظرۃ سلیم واقع ہوتی ہو، دوسرے کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سرسید کی پورٹریٹ قابلیت پر اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اُس نے غدر کے بعد ایٹھ گوانڈین اخباروں اور ایٹھ گوانڈین افسروں کی عام رائے کے برخلاف اپنی کتاب اسباب بغاوت میں نہایت زور شہد کے ساتھ اس بات کی ترویج کی کہ شہنہ کا غدر ایک ملکی بغاوت تھی یا اُس کی بنیاد برٹش حکومت کے خلاف کسی عام سازش پر تھی اور اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوا کہ

اس سرکشی کا اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی جس نے رفتہ رفتہ ان عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، ملکی بغاوت کی شکل اختیار کرنی تھی۔ اس نے جو اسباب ان غلط فہمیوں کے بنانے ان پر پارلیمنٹ میں مدت تک مباحثے رہے اور آخر کار ان میں سے اکثر بالاتفاق تسلیم کئے گئے، یہاں تک کہ گورنمنٹ نے ان کا فوراً تدارک کیا۔

سر سید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگریس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی مگر سر سید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگریس سے مختلف تھی۔ سر سید نے جو الزامات گورنمنٹ پر عاید کیے تھے ان کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی متنفس کو نہیں ہوئی اور کانگریس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگانے ان کی تمام ملک میں مناوی کی گئی۔ سر سید نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے میں کوشش کی اور کانگریس نے غلط فہمیاں پھیلانے میں۔ سر سید نے ان باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگریس نے زیادہ تر ان باتوں پر زور دیا جن سے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سر سید کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا وہ نوز کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگریس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح ملکی کے برخلاف تھیں اسی لیے سر سید کی اکثر شکایتوں کا جو کہ اس نے بنیاداً اپنی طرف سے پیش کیا تھا، فوراً تدارک کیا گیا اور کانگریس کو باوجودیکہ وہ تمام ملک کی قائم مقامی کا دعویٰ کرتی ہے، آج تک ایک بائٹ کے سوا جس کی بنیاد قانونی کونسل میں محض سر سید کی تحریک سے ۱۸۹۱ء میں پڑ چکی تھی کسی بات میں نمایاں کامیابی حاصل

نہیں ہوئی چنانچہ اخبار سینٹ جمیں بجٹ میں سرسید کی کتاب پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ ”ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کیساتھ ہوا ہے۔ بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوش اور اس کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔“

ایک اور ثبوت سرسید نے اپنی پولیٹیکل قابلیت کا ۱۸۶۱ء میں اُس وقت دیا جب کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ”اور اٹھ دین مسلمانز“ نے ہندوستان سے لے کر انگلستان تک تمام حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے بدگمانی کا بیج بوسہا تھا۔ وہ تیرہ برس سے برابر اس کوشش میں تھے کہ جو بے اصل شکرک و شبہات حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں ان کو رفع کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو انگریزوں اور مسلمانوں میں صفائی اور خلوص اور دوستانہ میل جول کو ترقی دیا جائے۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اُن غلط فہمیوں کو اور نقویت دینے والی اور گویا کہ سرسید کی تیرہ برس کی کوشش کو برباد کرنے والی تھی۔ اگرچہ، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سرسید کو اُس وقت کالج کی ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ رات دن اسی ادھیڑ میں مصروف رہتے تھے باوجود اس کے کتاب مذکورہ کو شایع ہونا تھا کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اس پر ریلوے لکھنا اور پالیسی میں اسکو چھپوانا شروع کیا۔ اس ریلوے نے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں اور مسلمانوں کے مذہب سے اُن کی ناواقفیت انگریزوں کے دل میں تہمتیں کر دی اور اس غلط خیال کو کہ اسلام بغاوت کی تعلیم دیتا ہے اور وہابی مسلمان گورنمنٹ کے لیے خطرہ کی چیز ہیں اُن کے دل سے حروف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اُس نے اس غلط فہمی ہی کو رفع نہیں کیا بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایسی نازک حالت میں

جیسی کہ اُس وقت ہندوستان کی حالت تھی، ایسی تخریبیں شایع کرنا جو حاکم و محکوم میں تفرقہ ڈالنے والی، حاکموں کے غصہ کو مشتعل کرنے والی اور محکوم قوم کو مایوس کرنے والی ہوں، سراسر مصالحِ ملکی کے برخلاف ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کا ریلویوں نکلنے کے بعد ڈاکٹر ہنٹر نے اس مضمون کے متعلق پھر سانس تک نہیں نکالی اور انگریزی اخباروں نے بجائے اس کے کہ سرسید کی تردید کرتے، نہایت شد و مد کے ساتھ ان کی تائید کی اور اُس بیچینی کی حالت میں جو حکمران گروہ میں عموماً پھیلی ہوئی تھی، سرسید کے ریلویوں کا نکلنا نہایت غنیمت سمجھا گیا۔

اگرچہ سرسید کی مذکورہ بالا تخریبوں سے ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوئے لیکن ان کی اعلیٰ درجہ کی پولیٹیکل قابلیت کا بھید و حقیقت اینگلو اورٹھیل کالج میں چھپا ہوا ہے۔ اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پولیٹیکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں ان کا اعتبار زیادہ کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کر وٹریا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہو سکتی ہے تو وہ یہی مٹھن کالج ہو سکتا ہے۔ اسی لیے پارلیونیر نے لکھا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دو اڈیشنز مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید بار آور اور نہایت ندر دست پولیٹیکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربلج میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا" اور اسی بنا پر لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں نے ان کی وفات کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پولیٹیکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا تھا اور اسی وجہ سے مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ



نے کالج کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ ”وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولیٹیکل جوش پھیلا نے والا ہے“ اور اسی واسطے سر اکلنڈ کالون نے اپنی اسپیچ میں ان تجزیوں کی نسبت جو سر سید نے رسالہ اسباب بغاوت میں رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بتائی تھیں، یہ الفاظ کہے تھے کہ ”انہیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انہیں خیالات کی دوسری صورت علیگڑھ کالج ہے۔“

سر سید کا سب سے اخیر کام ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے روکنا تھا جس کا مفصل حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور جس کے اعادہ کی اب ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم کو ان کی ایک لطیف تحریر و تہیاب ہوئی ہے جو انہوں نے لندن میں ایک برسے عالی مرتبہ انگریز کو کسی وقت لکھ کر بھیجی تھی اور جس سے ملکی معاملات کے متعلق ان کی اصلی رائے ظاہر ہوتی ہے اس چٹھی کے چند فقرے اس مقام پر نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں جن سے سر سید کا ایک مہبت بڑا اسٹیٹسمن ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ”میں مسلمان ہوں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں انہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں، کوئی اور ان پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اوٹھ چراتے ہیں،



تو پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونیشنوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔“

”ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے، وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ ملٹیڈ مائز کی کو ماننا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اُس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اُس کی جائیداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جائے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائیداد کیوں نہ ہو وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ پس میں دونوں طرح کیا بہ لحاظ مذہب اور کیا بہ لحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔“

”لیکن ہمارا مذہب، جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے، اُس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں، ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، ملک میں امن قائم رکھتی ہے اور ہماری جان اور مالی کو محفوظ رکھتی ہے جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے، تو اُس حالت میں ہم کو اُس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصولی جو ہم نے اپنے باپ و دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں اُن پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے جب کہ زمانہ کی حالت اُن کے عمل میں لانے کے موافق ہو نہ کہ اُس حالت میں جب کہ زمانہ کے حالات

اُن کے موافق نہ ہوں، مثلاً جب کہ اُن کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اُس کو کمزور اور ضعیف کر دے میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کمنسٹر ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل، سب اس اصول کو قبول کریں گے۔

یہی خیالات جو اس تحریر میں درج ہیں سرسید نے کانگریس کی مخالفت کرنے سے پانچ برس پہلے ممبری کونسل کے زمانہ میں لارڈ رپن کے سامنے اپنی اسپیک میں، جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے، اُس وقت ظاہر کیے تھے جبکہ کونسل میں سلف گورنمنٹ کے قانون کا مسودہ پیش تھا۔ اُس اسپیک سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ریپرنٹیشن اصول کی اسی حالت میں پسند کرتے تھے جب کہ اُس کے جاری کرنے سے ملک میں سوشل اور پولیٹیکل خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ پس جو لوگ اُن کی پھیلی تحریروں کو حال کی تحریروں کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ان کی سمجھ کی غلطی ہے۔ وہاں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلافات کا خیال زیادہ سرائے کو اُس وقت پیدا ہوا جب کہ ۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال مغرب کے بعض سربراہان اور ہندوؤں کی طرف سے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس باب میں کوشش شروع ہوئی کہ تمام سرکاری دفتروں اور کچھ لوگوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کی جگہ ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ پھر جس قدر ہندوؤں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مخالفتیں ظہور میں آتی گئیں اُسی قدر وہ خیال زیادہ پختہ ہوتا گیا اور آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں ہے کہ اُس میں ریپرنٹیشن کے اصول پر عمل درآمد ہو سکے۔

اول اول وہ گورنمنٹ کی خود مختاری کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ

۱۸۶۶ء میں جب کہ انھوں نے علیگڑھ برٹش انڈین ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی۔ اُس موقع پر ان کی اسپچ کے ابتدائی الفاظ یہ تھے ”میں تم سے اُس طوائف الملوک کے زمانہ کا ذکر نہیں کرتا جو اٹھارھویں صدی میں تھا، بلکہ میں آپ کو اُس تاریخی زمانہ کی یاد دلاتا ہوں جب کہ ہندوستان ایک سلطنتِ شخصیہ کی حکومت میں تھا، ایک بادشاہ یا راجہ کو ہر دُشہ یا مخلوق خدا پر حکمراں تھا، اُس کی حکومت یہ نسبت اس کے کہ کسی قانونِ عقلی یا نقلی کے تابع ہو، زیادہ تر اُس کی مرضی، خوشی، طبیعت اور غیظ و غضب کی تابع ہوتی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے اپنے مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں یہ کلمے مہبت سنے ہوں گے کہ ”مالکِ رقاب الامم“ حالانکہ بادشاہ یا گورنمنٹ کو ایسا کہنا درحقیقت اُس کی نسبت تمام دنیا کی بُرائیوں کا منسوب کرنا ہے..... کچھ عجیب نہیں کہ تم میں سے اکثر ایسے ہوں کہ اب تک اُس پرانے زمانے کو یاد کرتے ہوں مگر جب کبھی تمہارا دل انصاف اور اخلاق کی طرف توجہ کرے گا تو تم خود اُس زمانہ کے نقصانوں اور اس وقت کی حکومتوں کی بُرائیوں کا اقرار کرو گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس زمانہ کی حکومتیں نہ مسلمانوں کی شرع کے مطابق تھیں اور نہ ہندوؤں کے دھرم شاستر کے مطابق..... بڑا اصول اُن وقتوں کی حکومتوں کا یہی تھا کہ جو زبردست ہو وہ کمزور پر غالب رہے اور جس طرح چاہے زیادتی اور جبر اور غضب سے صرف اپنے عیش و آرام کے لیے زیر دستوں کے حقوق پر تصرف کرے۔ پس ایسی حکومتوں کو بجز اُن غاصب شخصوں کے، جن کا کام اُس وقت میں بنانا ہوا تھا، اور کون پسند کر سکتا ہے؟ سرسید کی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد انھوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظامِ ملک کا مدار قانون پر نہیں

بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان پر یہ وہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ  
 غدر کے بعد، جبکہ قسمت دہلی صوبہ شمال مغرب سے نکال کر صوبہ پنجاب  
 کے ساتھ ملحق کی گئی، انھوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کر دی اور اپنے  
 تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علیگڑھ کو قرار دیا، یہاں تک کہ ۱۸۶۶ء میں  
 جب کہ سر ڈونلڈ سکوٹ صاحب لفٹیننٹ گورنر صوبہ پنجاب نے دہلی میں  
 دربار کیا جس میں سر سید کو بھی علیگڑھ سے بلایا گیا تھا، تو سر سید سے پرائیوٹ  
 ملاقات کے وقت صاحب مدوح نے اس بات کی سخت شکایت  
 کی کہ تم نے سائٹنگ سوسائٹی علیگڑھ میں جا کر قائم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی  
 کو اس کے فوائد سے محروم رکھا۔ سر سید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو  
 جیسی کہ وہ اب ہے ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ سمجھتا ہوں اور اسی  
 لیے جب کہ قسمت دہلی پنجاب میں شامل کی گئی ہے دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔  
 اسی کے قریب قریب انھوں نے ۱۸۶۹ء میں ڈی فٹنر پیرک صاحب سے  
 جو دہلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر ہوئے۔  
 انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریر کی تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنے  
 سفر نامہ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ ایک دن پنجاب کے انتظام کی  
 بھلائی پرانی کا ذکر آگیا، میں نے کہا ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور  
 بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزارہ درجہ بہتر ہے، لیکن شاید پنجاب کے  
 لوگ اس سے خوش ہوں کیونکہ ان کو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں  
 سے نکال کر دھوپ میں بٹھایا ہے، مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کرتے.....  
 جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور سنرائیں  
 اہل دہلی اور اس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ انھیں سزائوں کے ایک

یہ بھی سزا ہے کہ وہی اور اُس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور  
بے قانونی ملک بنا دیا گیا۔

اس کے بعد وہ سفر نامہ میں لکھتے ہیں کہ "حقیقت میں اب وہ زمانہ  
نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ  
بھلائیاں ہیں جو ہزاروں یٹاٹیوں کے ساتھ اگلے زمانہ کی ڈسپاٹک گورنمنٹ  
میں ملی ہوئی تھیں اور جن سے ان یٹاٹیوں کا علاج ہوتا تھا۔

ع چورگ زن کو جنزاح و مرہم نہ ہست

اب ان کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال  
کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسیٹیویشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک  
گورنمنٹ جیسی کہ قدیم سے تھی، زیادہ تر مفید ہوگی وہ نہایت غلطی میں ہیں۔  
لیکن آخر کار ان کو یقین ہو گیا کہ جب تک مثل انگلستان کے ہندوستان

کی تمام قومیں مل کر ایک قوم نہ بن جائیں جو قریب ناممکن کے ہے، اُس وقت  
تک ایک خالص کانسیٹیویشنل گورنمنٹ ہندوستان کی حالت کے مناسب  
ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جو اسٹیج انھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ پر لارڈ پرین  
کے عہد میں کی تھی اُس میں انھوں نے نہایت مدلل طور پر اس مطلب کو  
بیان کیا تھا اور اصل مقصد اُس اسٹیج کا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ تھا  
کہ تمام ہندوستان کے لوکل بورڈوں میں روٹلٹ ممبر الکشن سے اور ایک  
ٹلٹ نو مینشن سے مقرر کیے جائیں، کیونکہ لارڈ پرین اضلاع متوسط کے سوا  
باقی صوبوں میں کل ممبر الکشن سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخر کار جیسی کہ سر سید  
کی رائے تھی وہی قاعدہ تمام صوبہ جات کے لیے مقرر کیا گیا جو اضلاع  
متوسط کے لیے قرار پایا تھا اور اسی قاعدے کی بدولت تمام بورڈوں میں



کم و بیش مسلمان ممبروں کی صورت آج تک دکھانی دیتی ہے ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر ان کی شکل نظر نہ آتی۔

اگرچہ اکثر اسسٹنٹ اور منصفی کے لیے پنجاب میں مقابلہ کا امتحان نیشنل کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے جاری ہو چکا تھا اور جس وقت سرسید نے کانگریس کے خلاف لکھنؤ میں اسپیکر وی اس وقت جو نتائج اس قاعدے سے مسلمانوں کے حق میں مترتب ہونے والے تھے وہ ظہور میں نہیں آئے تھے مگر سرسید نے اسی وقت اس نقصان کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا جو اس قاعدے سے مسلمانوں کو پہنچنے والا تھا۔ چنانچہ پنجاب میں باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد ہندو قوموں سے بہت زیادہ ہے ۲۳ سے ۲۴ تک اکثر اسسٹنٹ میں منجملہ ۲۵ کے صرف سات مسلمان کامیاب ہوئے اور منصفی میں منجملہ ۲۷ کے ایک مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور اگر دونوں عہدوں کا مدار محض مقابلہ کے امتحان پر ہوتا اور کچھ عہدے ذمہ داری کے ذریعہ سے مقرر نہ کیے جاتے تو منصفوں میں اب تک شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا اور اکثر اسسٹنٹ پر بھی غالب مسلمان باقی رہ جاتے۔ علیٰ ہذا القیاس وائسرائے کی قانونی کونسل میں اگر ذمہ داری کا اختیار گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں نہ رکھتی تو ایک مسلمان کو بھی کونسل کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اسی قسم کے خیالات تھے جن کی وجہ سے سرسید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے روکا اور اسی لیے انھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ کے مسودہ پر اپنی اسپیکر میں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حالت مثل انگلستان کے نہ ہو جائے، جہاں عیسائیوں کو میموریلوں کی نسبت دوٹا دینے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اس وقت تک انگلستان سے ریپریزنٹیشن سٹیٹوشنوں کا اصول مستعار لینے میں بڑے بڑے مشکلات کے سدھارنے کا اندیشہ ہے۔



پولٹیکل ایجوکیشن کی نسبت سرسید کی یہ رائے تھی کہ اس کے بد اثر سے کوئی گورنمنٹ خواہ وہ ریپبلک ہو یا پارلیمنٹری اور یا مانرکی، محفوظ نہیں رہ سکتی ریپبلک گورنمنٹ میں اس کا لازمی نتیجہ بشرطیکہ ایجوکیشن کو پوری قوت حاصل ہو جائے، پریزیڈنٹ کی تبدیلی ہے اور پارلیمنٹری گورنمنٹ میں وزیر کی تبدیلی اور اگر وہ گورنمنٹ مانرکی ہے تو اس کا اثر سیدھا گورنمنٹ تک پہنچتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایجوکیشن کرنے والے اس کو تبدیل نہیں کر سکتے تو کم سے کم اس کی تبدیلی کی خواہش ان کے دل میں ضرور ہوتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ ظاہر ہے کہ نہ ریپبلک ہے اور نہ پارلیمنٹری اور اس لیے اس کو بجز ایک شائستہ اور مہذب مانرکی ہونے کے جو ملک میں امن رکھنا اور رعایا کے حقوق کو انصاف اور نیک دلی سے فیصل کرنا چاہتی ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، پس ایک ایسی گورنمنٹ کی پالیسی کے برخلاف، جیسی کہ ہندوستان کی گورنمنٹ ہے، اگر کوئی ایجوکیشن پھیلا جائے اور اس میں کامیابی نہ ہو تو غور کرنا چاہیے کہ رعایا کا خیال کس طرف مائل ہوگا؟ کیا ان کا خیال اس طرف مائل ہوگا کہ کوئل تبدیل ہو جائے یا موجودہ گورنر جنرل کی جگہ کوئی دوسرا گورنر جنرل بھیجا جانے؟ ہرگز نہیں بلکہ خود گورنمنٹ سے ناراضگی کا پھیلنا اس کا نتیجہ ہوگا۔ اگرچہ ناراضگی پھیلانے والے گورنمنٹ کے تبدیل کرنے پر کچھ فالو نہ رکھتے ہوں مگر گورنمنٹ سے ناراضگی کا پھیلنا خود گورنمنٹ کے لیے ملک کے لیے اور رعایا کیلئے شدید نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ سرسید ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دونوں کا اصول اید منسٹریشن متحد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی گورنمنٹ کو جس طرح ہو سکے قائم اور مضبوط رکھنا سے مقدم اور بڑا انصاف اور اس کے بعد رعایا کے

واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ پہلے اس کے متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی وہی کرتی ہے جو ایک نامہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے، کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو جو ایک نامہذب یا شخصی سلطنت نے کیا ہو۔

اُن کا قول تھا کہ اُن بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں دو ایک کے سوا جو درحقیقت مجنون تھے، کسی بادشاہ نے ظلم کرنے کے ارادہ سے ظلم نہیں کیا، بلکہ صرف اس خیال سے کیا کہ ویسا کیے بغیر اُن کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُن کے اس خیال اور اندازے میں غلطی ہو۔

اُن کی رائے تھی کہ گورنمنٹ کا اچھا یا بُرا ہونا درحقیقت کوئی اصل چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز رعایا کا بُرا یا اچھا ہونا ہے۔ اگر رعایا اچھی اور شائستہ ہے تو گورنمنٹ کو خواہ مخواہ شائستہ بنا پڑتا ہے اور اگر رعایا شائستہ نہیں ہے تو گورنمنٹ کو بھی ویسا ہی بنا پڑتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو اُن کی بڑی نصیحت یہی تھی کہ اگر انگریزی حکومت میں عزت سے رہنا چاہتے ہیں تو تعلیم اور سولیزیشن میں ترقی کریں اور عزت حاصل کرنے سے پہلے اس کا استحقاق پیدا کریں۔

اُن کی نہایت سچے رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ”گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے میاں کی حکومت بہ زور حاصل کی، اور نہ کرو فریب سے، بلکہ درحقیقت

ہندوستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی سو اسی ضرورت سے ہندوستان کو ان کا محکوم بنا دیا۔

انہوں نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا ہے کہ ”میں ہندوستان میں انجمن گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انجمن گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔“

اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مدد ہی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہو گا جو ملکی معاملات میں ان کو قوم کا بیڑہ نہ سمجھتا ہو اور اس کا بڑا بڑوت یہ ہے کہ سرسید کی ایک آواز پر، بہ استثنائے معدودے چند، ہندوستان کے تمام مسلمان کیاستی، کیا شیعہ، کیا وہابی، کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑھے، کیا وہ لوگ جو ان کی پارٹی میں گئے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہر بات میں ان کی مخالفت کرتے تھے سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک ان کا اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھو کھو مسلمانوں نے ان کا غدوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کروائے جو پیٹریارک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔

## تعلیم

سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جو غیر معمولی کوششیں

کی ہیں ان کی تفصیل پہلے اور دوسرے حصہ میں کافی طور پر بیان ہو چکی ہے۔  
 یہاں ہم صرف ان بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے تعلیمی  
 معاملات میں ان کی عالی دماغی، حسن تدبیر اور اصول اشاعت تعلیم سے ایک  
 قدرتی مناسبت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے مسئلہ پر کبھی نظام تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے لحاظ سے اور کبھی  
 طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کی جاتی ہے مگر سب  
 سے مقدم اور متمم بائسان حیثیت جس سے تمام حیثیتیں مقرر ہوتی ہیں یہ ہے  
 کہ کسی قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کرنے کی کیا سبیل ہے؛

جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو  
 جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل جل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ  
 خود مذہب کی شکل اختیار کر لی ہو، اس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا،  
 جو مضامین تعلیم اور ذریعہ تعلیم دونوں کے لحاظ سے بالکل اور پوری اور غیر مانوس  
 ہو، بعینہ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں، جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو،  
 ایک نئے مذہب کو جاری کرنا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۳۵ء میں جب گورنمنٹ نے

ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تو مسلمانوں کے ایک جم غفیر  
 نے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بذریعہ سرحدداشت کے یہ شکایت  
 پیش کی کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف اس بات  
 پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ برخلاف  
 اس کے ہندوؤں نے اس واقعہ سے گیارہ برس پہلے، جب کہ گورنمنٹ نے  
 ان کے لیے سنسکرت کالج قائم کرنا چاہا تو اس سے ناراضی ظاہر کی اور انگریزی  
 کالج قائم کرنے کے لیے گورنمنٹ سے اصرار کیا، کیونکہ اول تو ان کے ہاں

نہ ہی تعلیم صرف برہمنوں کے خاص خاص افراد میں محدود تھی اور باقی تمام  
ہندو قومیں مسلمانوں کے عہد میں دینی ضروریات کے لیے ایک غیر قوم کی  
زبان سیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ دوسرے جیسا کہ سر جان اسٹرنجی نے اپنی کتاب  
انڈیا میں لکھا ہے، نہ ہندو مذہبی تعلیم کے خواہشمند تھے اور نہ ان کا مذہب ایسا  
تھا جس کی تعلیم ہو سکے۔

بہر حال مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا جاری کرنا ایک نہایت مشکل کام قریب  
ناممکن کے تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۷ء سے جبکہ کورٹ اون ڈائرکٹرز کے ایک  
نامور ممبر چارلس گرانت نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کی صلاح دی تھی  
اس وقت تک جبکہ ۱۸۴۰ء میں سر سید نے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان  
قائم کی، گورنمنٹ کی تمام تدبیریں اور تمام کوششیں، جو ہندوستان میں بغرض  
اشاعت تعلیم کی گئیں، مسلمانوں کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں، علاوہ طرح  
طرح کی ترغیبوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم کی اشاعت کے لیے  
وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، خاص مسلمانوں کے چند معقول اوقات گورنمنٹ  
کے ہاتھ میں تھے جن کو وقف کرنے والوں نے تعلیم کے لیے مخصوص کیا تھا،  
جیسے بنگال میں محسن فنڈ اور اصلاح شمال مغرب میں ٹواب فنڈ، مگر ان سے بھی  
زیادہ تر غیر قومیں مستفید ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ ۱۸۵۸ء میں ہانی ایجوکیشن کے  
لئے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں مگر ۱۸۴۵ء تک تمام  
ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجویٹس کے شکل سے اتنی  
ہوگی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

سر سید کو ۱۸۵۸ء میں جبکہ وہ بجنور سے مراد آباد بدل کر گئے، تعلیم کی اشاعت  
کا خیال پیدا ہوا۔ اس زمانہ سے لے کر اس وقت تک جبکہ کالج نے نمایاں



ترقی کر لی۔ اُن کے تمام کاموں میں جو تعلیم کے متعلق انھوں نے انجام دیے ایک خاص ترتیب پائی جاتی ہے جس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے ابتداء ہی میں وہ تمام مشکلات جو وقتاً فوقتاً پیش آنے والی تھیں اور ہر ایک شکل کے ساتھ اس کا حل بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اُن کو تعلیمی معاملات پر غور کرنا اور تعلیم کے متعلق کسی قدر تجربہ حاصل کرنا ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے اول اسی غرض سے دو اسکول پبلک چندوں سے قائم کیے جن سے لوگوں کو اس دلچسپی کا جو اُن کو یہ نسبت سرکاری مدرسوں کے اپنے پرائیوٹ اسکولوں کے ساتھ بالطبع زیادہ ہوتی ہے، بخوبی اندازہ ہو گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر مسلمانوں کو کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے تو خاص کر اسی کالج سے ہو سکتی ہے جو قومی چندے سے قائم کیا جائے۔ اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور یہ خیال کیا کہ شمالی ہندوستان کے باشندے کیا مہندرو اور کیا مسلمان۔ انگلش لٹریچر اور مغربی علوم کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں، پس ناواقفیکہ ویسی زبان کے ذریعہ سے اُن میں یوزر دپین سائنس اور لٹریچر کا مذاق پیدا نہ کیا جائے اس وقت تک انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق ان میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے علاوہ کتابوں کے ترجمہ کرانے کے سوسائٹی سے ایک اخبار

ملاحظہ میں جبکہ سر سید پہلی بار چندہ کے لیے لاہور گئے ہیں اس وقت انھوں نے فراتم کے سامنے یاہرنوین چندہ سے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا کہ صرف اس خیال سے کہ یہ کالج خاص مسلمانوں کے لیے انھیں کے روپے سے قائم کیا جائے ایک طرف تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف انہی میں سے ہندوؤں میں توقع سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا ہے اور پھر خان بہادر بکت پٹیل سے بوجھا گیا کیوں حضرت اگر یہ قومی کالج نہ ہوتا تو آپ ہماری عمارت اسی جوشِ محبت کے ساتھ کرتے۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہرگز نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید اپنے کام کے شروع ہی میں اس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے۔ ۱۳۔



ننگلا جس میں بے شمار علمی اور لٹریٹری مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے اور جس نے فی الواقع اردو لٹریچر کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور انگلش لٹریچر کی عظمت ہزاروں کے دل میں جو سلیم الطبع تھے، تہہ نشین کر دی، پھر دیاہہ تجربہ اور زیادہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ولایت کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی ورائس کے تمام انتظامات کو خود جاکر دیکھا اور اس کے مقابلہ میں جو نقص ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں معلوم ہوئے ان پر ایک پمفلٹ لکھ کر انگلستان ہی میں شائع کیا، کیونکہ سرسید کا اصل مقصد جو پورا نہ ہو سکا، ہندوستان میں واپس آکر ایک محکمہ یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور اس لیے ضروری تھا کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں جو نقص تھے ان کو ظاہر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ایک جدا یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت ثابت ہو۔ پھر ہندوستان میں پہنچتے ہی انھوں نے ایک طرف تو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ سرکاری کالجوں اور سکولوں سے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو جگانے کے لیے ایک ماہواری رسالہ جاری کیا جس نے چند روز میں ایک مردہ قوم میں حرکت پیدا کر دی۔

جب کالج قائم کرنے کا ارادہ ہوا اس وقت ان کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اولاً مسلمانوں سے جو قومی چندوں کے مفہوم سے ناواقف اور تعلیم سے متنفر بلکہ اس کے مخالف تھے، چندہ وصول کرنا تھا۔ پھر جو موقع کالج کے لیے تجویز کیا گیا تھا وہ چند اصلاح کے بارے میں مسلمان رئیسوں اور تعلقہ داروں سے گھرا ہوا تھا جن میں سے بعض کالج کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ایک ایسے کام کی طرف سے جس کو بہت سے ذی وجاہت مسلمان مل کر

کرنا چاہتے تھے اور جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی، گورنمنٹ کو مطمئن کرنا سب سے مقدم تھا جس قطعہ زمین پر کالج کی نیور کھنی منظور تھی وہ نزولی زمین تھی جہاں ایک زمانہ میں سرکاری چھاؤنی رہ چکی تھی اور اکثر احکام اور افسر نہیں چلتے تھے کہ وہ زمین مسلمانوں کو دیکھانے، مسلمان جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیا جاتا تھا وہ تعلیم کے خرچ سے زیادہ کسی خرچ کو فضول اور بیکار نہیں سمجھتے تھے اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ کالج کی وقعت پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں جہاں تک ہو سکے جلد پیدا کی جائے، کیونکہ جو بڑا منصوبہ سرسید نے اس کے لیے اپنے دل میں باندھ رکھا تھا وہ بظاہر ان کی زندگی میں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور مسلمانوں میں کسی سے یہ امید نہ تھی کہ سرسید کے بعد کالج کی وقعت اور اس کا اعتبار ایک ایسے آگے بڑھا سکے۔

سرسید نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آئے۔ چندہ تو جمع بلکہ وہم و گمان سے بھی زیادہ وصول کر لیا۔ گورنمنٹ کو کالج کی طرف سے مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ اس کا مربی اور سرپرست بنا دیا۔ کالج کے لیے وہی زمین، جس کا ملنا قریب ناممکن کے ہو گیا تھا، گورنمنٹ سے حاصل کی مسلمانوں کو تعلیم میں اپنے بل بوتے اور طاقت سے بڑھ کر خرچ کرنا سکھا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ولایت کی تعلیم کے مصارف بہ کثرت پیشانی برداشت کرنے لگے۔ کالج کی عالیشان عمارتوں اور عمدہ اسٹاف اور پورٹنک ہاؤس کے انتظام سے اس کی وقعت بہت جلد پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں پیدا کر دی۔ الغرض جو کچھ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق سچسپس برس کے قلیل عرصہ میں کر دکھایا وہ ایک ایسا عظیم الشان کام تھا جو سچسپس برس پہلے بالکل محال معلوم ہوتا تھا۔

ابتدائی کارروائیاں جو سرسید نے بطور بنیاد اور اساس اشاعتِ تعلیم  
انگریزی کے کہیں خواہ ان کو اتفاقی سمجھو اور خواہ یہ خیال کرو کہ وہ بہت سوج بھجھ  
کر کی گئیں تھیں، سب ایسی ضروری معلوم ہوتی ہیں کہ بغیر ان کے شاید اصل  
مقصد تک پہنچنا سخت دشوار ہوتا۔ سرسید نے جو چند موقعوں پر سائنٹفک  
سوسائٹی کے مقاصد کو اپنی رائے کی غلطی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس  
بات پر زور دیا ہے کہ یورپین علوم کی اشاعت بذریعہ ویسی زبانوں کے  
ملک کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس سے بعض لوگ سچ بچ یہ سمجھ گئے ہیں  
کہ سوسائٹی کا قائم کرنا محض بے سود تھا اور یہ کہ سرسید نے اپنی اس غلطی پر  
متنبہ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے مگر یہ ان  
کی سمجھ کی غلطی ہے، سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانہ میں  
نھا وہی خیال ان کا اس وقت تھا جب کہ مراد آباد میں انھوں نے ورنیکلر  
سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اردو میں لکھ کر شائع کی تھی اور  
وہی خیال اُس وقت تھا جبکہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے کچھ بہت  
دن نہ گزرے تھے اور انھوں نے گورنمنٹ کی اس تجویز کی سخت مخالفت  
کی تھی کہ بجائے کلکتہ یونیورسٹی کے ورنیکلر یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اسی  
طرح ترجموں کی ضرورت کو جیسا کہ وہ سوسائٹی کے قیام کے وقت ضروری  
احدلابدی سمجھتے تھے اسی طرح اخیر روم تک اس کو ضروری اور ملک کی عام  
تعلیم کو اس کے بغیر ناممکن سمجھتے رہے مگر اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کی جگہ  
ویسی زبانوں میں مغربی علوم اور لٹریچر کی تعلیم دینے کو وہ ملک کے حق میں کچھ  
بھلائی نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے جب سے ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ  
بجائے انگلش ہائی ایجوکیشن کے مشرقی علوم کی تعلیم دینا اور مغربی علوم کو  
بذریعہ ویسی زبانوں کے شائع کرنا چاہتی ہے اُس وقت سے وہ اپنی ہر ایک

تحریر میں ورنیکلز زبانوں کے ذریعہ سے علوم کی تعلیم دینے پر سخت اعتراض کرتے تھے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کو ملک کے حق میں نہایت مضر بتاتے تھے۔

جس زمانہ میں سرسید نے سوسائٹی قائم کی اس وقت اوہر تو مسلمان انگریزی کے نام سے کورسوں میں بھاگتے تھے اور اوہر انگریزی تعلیم کی ضرورت کا لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا کیونکہ تمام عدالتوں میں ویسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لیے جو اس وقت تک ہندوستان میں کومل سکتا تھا خاص کر شمالی ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ کمپنی کی عملداری کو گئے ہوئے چند روز گذرے تھے اور ہندوستان میں کو عملی طور پر اس بات کا یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ وہ اعلیٰ اعلیٰ ملکی عہدوں میں حکمران قوم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں پھر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یورپین سائنس اور لٹریچر کی عظمت جب تک کہ انگریزی سے عمدہ عمدہ علمی اور لٹریچر می مضامین ویسی زبان میں ترجمہ کر کے شایع نہ کیے جائیں، کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتی تھی جب کہ یہ حالت تھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں انگلش ہائی ایجوکیشن کی اشاعت سے پہلے سوسائٹی کا قائم کرنا اور ترجموں کا شائع کرانا ہے سو دیا غیر ضروری تھا۔

بیشک ہائی ایجوکیشن کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ میں اسی غلطی کا جس کو سرسید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا ویسی زبانوں میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے،

سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے  
 دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض  
 مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔ اگر مولانا کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس  
 سے تعرض کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے  
 بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لیے ہم کو سرسید کے خیالات  
 کا اصل منشا ظاہر کرنا ضرور ہے۔

مولانا اس بات پر کہ جس طرح عباسیوں نے یونانی سے عربی میں ترجمے کرائے تھے اُس طرح ہم مغربی  
 علوم انگریزی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرا سکتے، پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ لاکھوں روپے جو خلفائے عباسیہ نے  
 ترجمہ پر خرچ کیا وہ اب غیر ممکن ہے، مگر یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے  
 ہیں۔ گذشتہ تیس چالیس برس میں بغیر اس کے کہ سلطنت نے ترجمہ کا اہتمام اپنے ذمہ لیا ہو جس قدر  
 علمی اور شریعی مضامین اور کتابیں انگریزی سے دسی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں، اگر جملہ قیاس غلط نہ ہو تو  
 وہ کسی طرح خلفائے امویہ و عباسیہ کے عہد کے ترجموں سے کم نہ ہونگے دوسری دلیل الٰہی کی یہ ہے کہ  
 اُس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی و ترقی چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئیں گویا یونانیوں کے علوم  
 پر اعادہ کر لیا گیا گو اس زمانہ میں علمی ترقی کا اہتمام ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے عین کی تصنیف  
 کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہی دلیل غالباً سرسید نے بھی کسی موقع پر بیان کی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں  
 ہے کیونکہ جس طرح اب علوم اور کتابیں غیر محدود ہیں اسی طرح ہندوستان میں ترجمہ کے وسائل بھی غیر  
 محدود ہیں، مباحیوں نے صرف چند سیدھی عیسائی اور عجمی نوکر رکھ کر ترجمے کرائے تھے کیونکہ یونانی  
 زبان کی تعلیم کا کبھی مسلمانوں میں عام سراج نہیں ہوا بخلاف ہندوستان کے جہاں انگریزی کی تعلیم عام  
 طور پر جاری ہے اور کاپی رائٹ کے قانون نے ہر تعلیم یافتہ کے دل میں ترجمہ کرنے کی انگ پھیل کر دی  
 ہے۔ پھر ہر ایک علم کی تمام کتابیں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر علم کے چند نامور مصنفوں

شاید اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ریفاہی مرکز  
شان اور اس کی حالت عام آدمیوں کی شان اور ان کی حالت سے بالکل مختلف  
ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو قوم کے لیے ضروری سمجھتا ہے اس کی تائید کرتے  
وقت اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں پہلے کیسا کہہ چکا ہوں یا کیا کر چکا ہوں۔  
وہ اس بات کو کہ اس کی پہلی کارروائی غلط ثابت ہو یا اس کے افعال و اقوال

بقیہ کی کتابوں کا ابتدا میں ترجمہ کر لینا کافی ہے۔ پھر تین صدیاں یورپ کی علمی ترقیات میں صرف ہوتی  
ہیں اور تین صدیوں میں انگریزی زبان نے ترقی کی ہے اور جس قدر عرصہ میں مغربی علوم مدون ہوئے ہیں کم سے  
کم اس نصف مدت کی بہت ہندوستان میں ان کے ترجموں کے لیے ملنی پاتا ہے۔ نہ یہ کہ جتنے دنوں  
تک سائنسک سوسائٹی علیگڑھ ترجمہ کا کام کرتی رہی ہے اتنی مدت میں تمام مغربی علوم و فنون کے ایسی  
زبانوں میں منتقل ہونے کی توقع کیجئے۔ تیسری دلیل انہوں نے یہ لکھی ہے کہ جب یونانی سے عربی میں  
ترجمے ہوئے اس زمانے میں عربی تمام ممالک میں حکومت کرنے والی زبان تھی اور کسی قوم نے اس زبان  
میں علوم کو ترقی نہیں دی جو ان پر حکومت کرتی تھی۔ یہ دلیل بھی تقریباً اسی تقریر کا اعادہ ہے  
جو سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں لکھی۔ بلاشبہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں  
ہے کہ کسی محکمہ قوم نے علوم کو اپنی زبان میں ترقی دی ہو۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آئندہ بھی  
ایسا وقوع میں نہیں آسکتا۔ حکومت کے اصول بدلنے سے دنیا کے تمام حالات بدل گئے ہیں۔ شائستہ  
سلطنتوں کی رعایا اب وہ کام کر سکتی ہے جو خود سلطنتیں نہیں کر سکتیں۔ پہلے تمام رعایا عام کے کام  
خود سلطنتوں کو کرنے پڑتے تھے اور رعایا کو خواہ وہ رعایا بادشاہ کی ہم قوم ہو اور خواہ غیر قوم ان کاموں  
سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ کام خود رعایا کرتی ہے۔ وہ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اور ہسپتال  
قائم کرتی ہے۔ ملکوں میں مذہب کی اشاعت کرتی ہے، علمی تحقیقات کے لیے علما کے قافلے اطراف  
عالم میں بھیجتا ہے۔ ترجموں کے ذریعہ سے غیر قوموں کے علوم اپنے ملک میں پھیلاتی ہے۔ زمینیں جاری



کو لوگ متناقض سمجھیں نہایت بہتر جانتا ہے بہ نسبت اس کے کہ جو امر اس کے نزدیک سروسٹ قوم کے حق میں ضروری ہے اس میں کسی طرح کی فروگزاشت ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اپنے اصلی اور قدیم خیالات کو جو کہ وہ ہندوستان کے پالنگس کی نسبت رکھتے تھے، اخیر زمانہ میں صرف اس بنا پر بالکل بدل دیا کہ وہ خیالات مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کے موافق نہ تھے، یہاں تک کہ نیشنل کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم جو سرسید کے قدیم دوست تھے ان سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں انھوں نے ہندوستان کے ایک شریف مسلمان سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ ”مجھ کو نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب ”اسباب بغاوت“ کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ اب اس کو کیا ہو گیا۔“

سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا اس وقت مسلمانوں کی حالت پر یہ پٹل صادق آتی تھی کہ ”اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی“ ان میں صد ہا باتیں اصلاح طلب اور ان کے متعلق صد ہا مشکلات حل طلب تھیں۔ اگر سرسید جزئیات کی اصلاح یا حل کر نیکا ارادہ کرتے تو عمر بھر میں ایک کام

رہتا،

کرتی ہے، دنیا کی خبریں بہم پہنچا کر ملکوں میں شائع کرتی ہے عرضیہ ملک کے اندرونی انتظام اور بیرونی عملوں کی مذاقت کے سوا سب ملک کی بھلائی کے کام رعایا کر سکتی ہے۔ بیشک ہندوستان کی رعایا حالت موجودہ میں بہت سے بڑے بڑے رفاہ کے کام مثل انگلستان کی رعایا کے نہیں کر سکتی مگر طرز حکومت ان کو آہستہ آہستہ سب باتیں سکھاتی باقی ہے۔ چنانچہ جس قدر قومی رفاہ کے کام ہندوستان کی رعایا نے اس صدی کے اخیر نصف میں کیے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں سرگزشت کی مثال نہیں مل سکتی پس اس زمانہ کے حالات کو مانڈ گزشتہ سے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ ۱۲۔

کے پورا کرنے سے بھی عہدہ برآ نہ ہوتے۔ انھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور تمام مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے مگر قومی تعلیم و تربیت خود دریک عظیم الشان کام تھا جس کے لیے صدیاں درکار تھیں اس لیے انھوں نے خیال کیا کہ سب سے مقدم مسلمانوں کو پرنسپل پے ترقی سے نکان اور ملک کی حکومت میں جس قدر حصہ لینے کا گورنمنٹ نے ان کو بحیثیت ہندوستان کی رعایا ہونے کے حق دیا ہے اس کا ان میں استحقاق پیدا کرنا ہے جو بغیر اس کے، کہ قوم میں ایک مناسب تعداد ہندوستان اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹس کی پیدا ہو جائے، کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے سوا تمام ترقیات کی جڑ خیالات کی ترقی اور دائمی تربیت ہے جس کے لیے انگلش لٹریچر کی اعلیٰ وجہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ پس جس بات کو انھوں نے باقی ایجوکیشن یا لٹریچر میں تعلیم میں غفلت کی ہمیشہ مدافعت کرتے رہے۔ اسی بنا پر وہ جس طرح اوٹیل تعلیم اور وٹیکر تعلیم کے مخالف تھے اسی طرح جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کے بھی اُس صورت میں سخت مخالف تھے کہ اُس سے لٹریچر کی تعلیم کو صدمہ پہنچے گا اندیشہ ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ درحقیقت ہندوستانیوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ بھی وہی ہائی ایجوکیشن یا لٹریچر کی تعلیم کی حمایت تھی جس کی نسبت ان کو خیال ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ اُس کو تبدیل و ترمیم سے سزا دے گی۔

اسی اصول پر کہ جو سب سے اہم اور ضروری چیز ہے صرف اسی پر سروسٹ اکتفا کرنا چاہیے سرسید نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا بہا تک کہ لوگوں نے ان کو تعلیم نسواں کا مخالف تصور کیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اصل سبب تعلیم

نسوان کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اول توجیب سے اُن کو مسلمانوں کی سوشل  
 رفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے انجیر دم تک وہ فیمل سوسائٹی سے  
 بالکل علیحدہ رہے۔ غدر سے چند روز بعد اُن کی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا  
 اور وہ بی بی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی۔ اگرچہ زمانہ سوسائٹی کی حالت سے  
 وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے  
 اُن کی حالت دیکھ کر ایک زکی النحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف  
 سنی سنائی یا کبھی کبھی سبوتی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی دوسرے  
 اُن کے خاندان کی فیمل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے  
 بہت عمدہ تھی۔ اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو  
 ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُن کے اخلاق و عادات اور بیاقت اور سنجیدگی کی حد  
 سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ خود سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں اور اپنی متعدد  
 اسپچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے کچھ پڑھے ہوئے کا حال بیان کر کے  
 اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں یہی وجہ تھی کہ جب  
 سراً العروس پہلی ہی بار چھپ کر شایع ہوتی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی  
 حالت کا کھینچا گیا تھا اس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اس کو  
 مسلمان شرفا کی زمانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑا مانع تعلیم نسوان پر متوجہ ہونے کا یہ تھا کہ انھوں نے  
 اُس کی دشواریوں کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور اُن کے نزدیک ابھی وہ وقت بہت  
 دور تھا کہ مسلمان شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم کا ایک یقاعده اور قابل اطمینان انتظام  
 کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے جب مس کارنپٹر سے اُن کی  
 ملاقات ہوئی اور انھوں نے ایک کتاب جس میں ہندوستانیوں کی رائیں اور  
 (حاشیہ آگے)

چٹھیاں مس صاحبہ کی کوششوں کی نسبت درج تھیں، سرسید کے سامنے اس غرض سے کہ وہ بھی اپنی رائے تعلیم نسواں کے متعلق اس میں لکھ دیں، پیش کی تو سرسید نے اس میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی تھی حیران کے سفرنامہ میں درج ہے:

”مجھ کو بڑا وہ دہانی جہاز میں جبکہ میں لندن کو جاتا تھا، مس کارنپٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوتی۔ جب سے میں نے ان کا نام اور ان کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عملہ کے سنا تھا میں بہت مشتاق ان کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان کی ملاقات ہو گئی۔“

و ان کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب اخلاق اور نیک نیتی کا مثبت خود وہی مضمون ہے، جو انہوں نے اختیار کیا ہے یعنی اس گروہ کی تعلیم میں جس کو خدا تعالیٰ نے مرد کے لیے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لیے مرد کا مددگار کیا ہے، کوشش کرنا، درحقیقت یہ مضمون اور اس پر ان کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے۔ یہ سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہونی گودہ کسی طرح پر ہو، نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی اور اگر اس میں غلطی ہے تو اس سے اسید ہے کہ اوروں کو اس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی اور ٹھیک ٹھیک نیک نتیجہ تک پہنچے گی یہ

نہ یہ ایک شریف بیٹی ریتل کی رہنے والی ڈاکٹر کارنپٹر کی بیٹی تھیں جنہوں نے ہندوستان کی عورتوں کی جہالت کا حال سنکر ہندوستان کا ارادہ اس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور اب واپس انگلستان کو جاتی تھیں ۱۲۔

” نیک کام پر کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لیے کہ وہ ان لوگوں کی عادات و رسم و رواج کے مخالف طریقے پر جن کی مصلحتی کے لیے کوشش کی جاتی ہے، قائم کی گئی ہیں، سرباد ہو گئی ہیں، حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے اور خود اس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بنتا ہے۔ خدا نے یوشع کے لیے سورج کا تھم جانا کہا، حالانکہ شاید وہ غلط تھا کیونکہ اگر وہ واقع بھی نہتا تو شاید زمین کا تھم جانا پسح ہوتا، مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جہاں زمانہ میں تھی، رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت توڑیں گے اور خود اپنے لیے نقصان کا سبب ہوں گے۔“

” مہر حال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارنٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے، جو دونوں اصل میں ایک ہیں روشن ضمیری حاصل کریں۔“

مسیح کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے مگر ہندوستانیوں کے اور خاص کر ہندوستان کے شریف مسلمانوں کے رسم و رواج، آئین و عادت اور مذہبی اور اہم و خیالات سے اس کو اس قدر بعید جانتے تھے کہ سر دست اس میں کوشش کرنے کو بے سود اور باریگاں سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے بار بار اپنی اسپچوں میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے لوگوں کو اس بات کا شبہ ہو گیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے بالکل مخالف ہیں، یہاں ہم ان کی خاص کر اس اسپچ کا جو انھوں نے ۱۸۸۳ء میں بمقام گرو اسپوز خاندان پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں لکھ کر دی تھی اور جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی اسپچ تھی جس میں شریف ہندو مسلمان

اور عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا، خلاصہ نقل کرتے ہیں، ایڈریس میں سرسید کی ان کوششوں کی شکرگزاری کے بعد، جو کہ وہ رکوں کی تعلیم کے لیے کر رہے تھے، اشارۃً اس بات کا بھی ذکر تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر بھی اسی طرح توجہ کریں۔ سرسید نے اُس کے جواب میں کہا:

”وہ اے میری بہنو! آج کی رات میرے لیے شب قدر سے کم قدر کی نہیں ہے، جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے وہ میرے لیے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوتی میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔“

”اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ و دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔“

”تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اُس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔“

لے۔ ایڈریس دراصل مسلمان عورتوں کی طرف سے جس کی بانی مانی سرور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی

تھیں، دی گئی تھی مگر اُس کے بچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے ۱۲



”اے میری مہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تسلیم سے بے پروا نہیں ہوں  
میں دل سے ان کی ترقی تسلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے  
اس طریقہ تسلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش  
مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش  
کرو۔ وہی طریقہ تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں  
میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔“

اس کے بعد سرسید نے پرانا طریقہ تسلیم نسواں بہت تفصیل کے ساتھ  
بیان کیا اور پھر یہ کہا: ”اے میری مہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی  
نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں  
درستی ہو گئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست  
ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ ان سبے واقعات نے میرے  
دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی  
ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین  
ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تسلیم کی حیثیت سے پس جو خدمت تمہارا  
لڑکوں کے لیے کر رہا ہوں وہ حقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔“  
”میرا یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری  
دادیاں ناشیاں پڑھتی آتی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار  
کرو جو اس زمانہ میں پھلتی جاتی ہیں، مردوں کو جو تمہارے لیے روٹی کا کر لائے  
والے ہیں، زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور  
کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت  
تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔“

”تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو، اخلاق میں نیکی اور نیکدلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو برتاؤ میں لاؤ، گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو، اپنے گھر کی مالک رہو، اس پر مشل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیرِ ندادی کے مشنظم رہو، اپنی اولاد کی پرورش کرو، اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا ما بناؤ، خدا پرستی خدا ترسی، ہمساہلوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو، یہ تمام سچی تسلیم نہایت عمدگی سے ان کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دواہیاں تانیاں پڑھتی تھیں جیسی وہ اس زمانہ میں مقید تھیں ویسی ہی اس زمانہ مفید ہیں۔ پس اس زمانہ کی نامفید اور نامبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت ہے؟ ہاں یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانوں کے سرووں کی نالافتی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسابیت کی رو سے تمہارا حق ہے، برباد ہو گئے ہیں۔ وہ حق تم کو پھر واپس دلانے کی میں تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جاوے، جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو جاوے گے وہ معصوبہ حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے۔“

آخر میں سرسید نے ہندو اور عیسائی خاتونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ”وہ میری ہندو اور عیسائی بہنوئی تم نے جو اپنی محبت اور وطن پیکانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس انداز میں جو عدوتہ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور پیکانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین“

اس اسپچ سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اُس وقت تک جب تک کہ لڑکوں میں تعلیم عام نہ ہو جائے، لڑکیوں کے لیے مندرجہ مسائل مذہبی کا تسلیم کافی سمجھتے تھے۔ مگر اُن کی اسپچ میں یہ بات قابل غور ہے کہ انہوں نے جو صورت لڑکوں کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اُس سے عورتوں کے مضروبہ حقوق بن مانگے از خود واپس ملجائیں گے۔ اُن کی یہ امید یورپی ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوان عورتوں کے حقوق پہچانیں، اُن میں تعلیم کی کمی سے جس قدر عقل یا سمجھ یا اخلاق کی کمی ہے اُس کو اسی طرح برداشت کریں جس طرح اُس کے اسلاف برداشت کرتے آئے ہیں، اُن سے جب تک کہ قوم میں تعلیم نہایت محدود ہے، ان باتوں کی توقع نہ رکھیں جو یورپ کی ایک تعلیم یافتہ لیڈی سے رکھنی چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تربیت سے، بجائے تحمل و برداشت اور سلوک و درگزر اور قومی حثیت اور رقت جنسیت کے یہ سبق سیکھتے ہیں کہ تمدن اور معاشرت کے جس درجہ پر اہل یورپ کو صدیوں اور قرون کے بعد پہنچنا نصیب ہوا ہے اُن کو یونیورسٹی کی سند پاتے ہی اُس کے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہر تعلیم یافتہ نوجوان کی یہ تمنا معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو لندن یا پیرس کی کسی لیڈی سے شادی کریں اور اگر یہ امر اُن کی قدرت سے باہر ہو تو غالباً وہ ایک مشن اسکول کی تعلیم پائی ہوئی ٹیچر کرچمن عورت کو قوم کی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے جو باقاعدہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہ ہو، بہتر اور افضل سمجھیں گے۔ پس جب کہ یہ حالت ہے تو اُن سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی عورتوں کے مضروبہ حقوق واپس دیں گے، اُن کا بڑا سلوک اپنی قوم کی ہم کفو لڑکیوں کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ سر سے اُن کے

حقوق کا بوجھ ہی اپنے ذمہ نہ لیں بلکہ ان کو بدستور جاہل اور ناترتیب یافتہ لڑکوں کے لیے چھوڑ دیں۔ اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے ڈاؤن نے بہت کچھ ان کے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخر کار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقیناً بڑے نتائج پیدا کرے گی۔

## مذہبی تحقیقات

مذہب کے متعلق جو کچھ سرسید کی مذہبی خدمات اور رفارمیشن کے بیان میں لکھا گیا اُس سے یا ان کو ششوں کا دکھانا مقصود تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی غیر خواہی اور حمایت میں ان سے ظہور میں آئیں یا اُس دلیری اور جرأت کا بیان کرنا تھا جو انہوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کے اعلان کرنے میں ظاہر کی میاں ہم ان کی مذہبی تحقیقات کے متعلق ایک دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ اس شخص میں مذہبی عقیدوں کے حل کرنے اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور مذہب کو حقائق محققہ پر منطبق کرنے کی کس قدر قابلیت تھی! نہ وہ واعظ تھا نہ مفسر، نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان

کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی، باوجود اس کے زبانیہ حال کے بہتات جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے، اُن کا حل کرنے والا تمام ہندوستان میں صرف یہی ایک شخص تھا جس کی تحریریں مجروح دلوں پر مرہم کا کام کرتی تھیں۔ اُس کے پاس اطراف ہندوستان سے اسلام کی نسبت بیسیوں حل طلب سوالات صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ موجودہ علمائے اسلام اُن کا شافی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے خطوط جو سرسید نے اس قسم کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں، بعض احیاء کے بھیجے ہوئے اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ بعض خطوط کے جواب تہذیب الاخلاق یا انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے ذریعے شائع ہوئے ہیں اور بعض اُس مرحوم نے ہمارے سامنے لکھ کر لوگوں کو بھیجے ہیں۔ اکثر لوگ دور دور سے قصد کر کے اسی غرض سے سرسید کے پاس آتے تھے اور اپنے بہتات بیان کرنے تھے اور مصلحتیں ہو کر واپس جاتے تھے۔ اسی طرح اس مرحوم کے پاس بہت سے لوگ شکر یہ کے خط بھیجتے تھے کہ آپ کی تصنیفات سے ہم کریہ اور یہ فائدے پہنچے ہیں۔

۱۷ ایک صاحب نے جن کا نام احمد بابا مؤدومی تھا۔ غالباً لاہور سے ۱۸۹۰ء میں سرسید کے پاس یہ سوال بھیجا تھا کہ قرآن مجید میں سبکی کی نسبت "بڑا بوالہ" اور عیسیٰ کی نسبت "بڑا بوالدنی" آیا ہے، اگر فی الواقع عیسیٰ کا کوئی باپ بڑا تو ان کا قول بوالدنی کی جگہ بوالدنی نقل کیا جاتا۔ اگرچہ سرسید نے تغیر میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے مگر خاص کر اس شبہ کے کچھ تعرض نہیں کیا۔ انھوں نے جواب میں یہ چند سطریں لکھی ہیں، جناب مؤدومی! حضرت عیسیٰ تمام لوگوں میں ابن مریم کے مشہور تھے، اس شہرت کے سبب قرآن مجید میں یحییٰ کو ابن مریم سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی ماں کے نام سے مشہور ہوئے پس قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا

ہم پہلے مکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جس قدر اختلافات مذہبی مسائل میں علمائے  
 ملت سے کیے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں اور لوگ بھی ان کے ساتھ  
 شریک ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے محض اگلے محققین کی تقلید  
 سے ان اختلافات پر مبادرت کی ہے۔ اول تو جس مقصد سے اگلے محققین نے جمہور  
 سے اختلاف کیا ہے وہ مقصد سرسید کے مقصد کے ساتھ متحد نہ تھا۔ سرسید کے تمام

بقیہ

گیانے برابر الدلی بھی کہا ہے، اس لفظ سے تو سمجھنا کہ ان کا کوئی باپ نہ تھا صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو حرمی  
 ناطق کر کے مشہور میں آپ بن باپ کا پیدا ہونا خیال کرتے ہیں! و السلام ۱۲۔

مے مولوی سید تھان علی بی اے کے دل میں یہ ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے، اسلام کی نسبت  
 طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے تھے انہوں نے سرسید کو جو اس وقت بتقریب میری کونسل کلکتہ میں تھے،  
 اپنے شبہات لکھ بھیجے۔ اس وقت سرسید ان کو نہیں جانتے تھے مگر انہوں نے فوراً ان کو خط کتابت سے کچھ  
 فائدہ نہ ہو گا تم چند روز کے لیے کلکتہ چلے آؤ اور وہاں کے کرایہ کی صورت ہو تو میں بھیجا دوں۔ وہ فوراً کلکتہ چلے  
 گئے اور چند مہینوں میں ان کے تمام شبہات زائل ہو گئے ۱۳۔

مے انہیں خطوں میں سے ایک خط ہمارے سامنے سرسید کے تمام سیموگہ علاقہ داروں کے اہل اسلام کی عبادت  
 کی طرف جس پر سید احمد قاسمی سیموگہ اور شیخ بابین محمدی مشنری سیموگہ اور سپار اور معزز مسلمانوں کے دستخط تھے  
 پہنچا تھا جس کو ہم نے سید صاحب سے انگ لیا تھا۔ اس میں سے چند فقرے ہم انہیں کی مبادرت میں یہاں  
 نقل کرتے ہیں "جناب کی تفسیر ہر ایک مسلمان کے دل پر ایسی روشنی افشاہ الہی ہے جیسی اندھیری رات  
 پر آفتاب کی۔ اس تفسیر سے ہم کو بہت بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ ایک تحصیل شدہ مولوی اور ایک اردو  
 عوام ہردو کو بلا بر سمجھاتی ہے جس کو نقل سے کچھ بھی تعلق ہے وہ بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس تفسیر کے  
 پڑھنے و سننے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے اور دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام نہرت کے مطابق  
 ہے۔ ہم آج تک مذہبی باتوں میں عقل کو دخل نہیں دیتے ..... اور کہیں یہ نہیں خیال میں آیا کہ



اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے مغرضین کے اعتراضات یا مشکلیں کے  
 شبہات کا رفع کرنا تھا، بخلاف اگلے محققین کے جن کے اختلافات کا ہرگز یہ منشا  
 نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو اعتراضات آج کل مذاہب پر وارد کیے جاتے ہیں ان سے  
 ان ہزرگوں کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جن لوگوں نے سرسید کی  
 طرز تصنیف کو بہ نظر غور دیکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب  
 تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیتے تھے اس وقت تک  
 کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے۔ پھر اگر کسی مصنف کا قول ان کے  
 موافق نکلی آتا تھا تو اس کو بھی اپنی رائے کی تائید کے لیے لکھ دیتے تھے ورنہ  
 صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب ان کی  
 تخریر چھپ کر شائع ہو چکی اس وقت حسن اتفاق سے کسی محقق کا قول سرسید کی رائے  
 کا موافق ان کے کسی دوست کو معلوم ہوا تو اس نے یا تو سرسید کو اس سے مطلع  
 کر دیا اور یا بذریعہ تخریر کے کسی بیگزین یا اخبار میں چھپوا دیا۔ اصل یہ ہے کہ

بقیہ  
 ان ہر بات کی تکرار ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ تو مزور مجھے تھے نصاروں کے دینی نصارے کے تین فریالوں  
 کو ایک ہوا غیر ممکن ہے۔ یہ تلور ہورد کے ایک شخص کو تین محل اور دو سے زیادہ کئی ہتھ اور آدمی کو ہاتھی کا  
 سرگانے جانا یہ سب قسطا یعنی بیسیائیوں اور ہندوں کے ہاں جو ناممکن باتیں مافی جاتی ہیں ان کو تو ہم غلط جانتے  
 تھے، اگر وہی غیر ممکن بلکہ اس سے زیادہ تعجب انگیز باتیں ہمارے علماء و اعلیٰین کی گھڑت ہم کو  
 دکھائی نہ دی۔ الحمد للہ اس حق کو تفسیر کی بدولت اس روحانی مہلک بیماریوں کو آج مل صحت ملا۔۔۔  
 مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جی ہرئی نہیں جیسے کعبہ میں بتاں۔ اب ان کا ایک  
 بینک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے آپ ہم اس احسان کے بد سے اپنی کھال  
 کی جڑیاں بناویں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرہ کا معاوضہ ہو گا۔“

سرسید کو مذہبی تحریرات میں جس قدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اس قدر دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے مدد ملنے کی ان کو توقع نہ تھی اور اس لیے وہ خود کتابوں کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے یہی سبب ہے کہ ان کی تصنیفات میں کتابوں کے حوالے جتنے کہ ہونے چاہیں تھے ان سے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو ان کے لیے اور لوگوں نے تلاش کر کے بہم پہنچائے ہیں، اس کے سوا بہت سے مقامات ان کی تصنیفات میں ایسے موجود ہیں جن میں اگرچہ انھوں نے سلف کے اقوال سے اپنی رائے پر استنباد کیا ہے مگر جب ان کے اقوال کے مجمل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلل اور شافی بیان کے مقابلے میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں اس قدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے ان اقوال کو سرسید کی رائے کا ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے باوجود ان سب باتوں کے بہم پیشمارہ تحقیقاتیں سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھرتی پاتے ہیں جن کو بظاہر اس چودھویں صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے ایسے ارجل خیالات اور ارجل بائیں دیکھتے ہیں جن کو اس کی ادبیات کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا معیار بعیم میں کوئی بات فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعوئے کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اترتا۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ نبی کی عظمت اور بزرگی اس میں نہیں ہے کہ اس سے معجزات اور شین گویاں صادر ہوں بلکہ اسکی تمام عظمت اور بزرگی اس میں ہے کہ جب منکرین اس سے معجزہ طلب کریں تو ان کو یہ جواب

دے کر ” اَعْمَالُ الْاَيَاتِ عِنْدَ اللّٰهِ “ اور ” سِحْرٌ فِيْ هَلْ كُنْتَ الرَّسُوْلُ صَوْلًا “ اسی کا ذہن سب سے پہلے اس نکتہ تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا جس کو منافقین آپ کی نبوت کے عدم ثبوت کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں یہی سب سے بڑی دلیل آپ کی سچائی اور نبی برحق ہونے کا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے بتایا کہ قرآن میں سب سے بڑی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کی تعلیم فطرت انسانی کے مطابق اور جاہل و عالم اور وحشی و شائستہ سب کی سمجھ کے موافق اور ہر زمانہ کی حالت کے مناسب ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ اپنے دعوے کا ثبوت اس حد تک پہنچا دیا جس سے زیادہ مذہبی مسائل کا ثبوت ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو دریافت کیا کہ اسلام جو مدت دراز سے غیر قوموں میں مطعون و متہم چلا آتا ہے اس کے مختلف اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسلمان فاتحوں اور کشور کشاؤں کی بے اعتدالیوں کو ایک نتیجہ اسلام کی تعلیم کا قرار دیا ہے اور اس کو مسلمانوں کے کردار کا جوابدہ تصور کیا ہے حالانکہ اسلام ہر ایک طعنہ اور ہر ایک اعتراض سے اس وقت تک بالکل بری ہے جب تک کہ خود اس کی تعلیم میں کوئی بات قابل گرفت کے نہ پائی جائے۔

اسی نے سب سے پہلے اسلام پر سے عیسائی قوموں کا یہ الزام رفع کیا کہ وہ شائستگی اور سولیزیشن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں دنیوی ترقیات میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی غزوہ اور

کوئی سرتیہ اس ارادہ پر مبنی نہ تھا کہ کفار کو تلوار کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ جس قدر چھوٹی یا بڑی لڑائیاں آپ کے عہد میں کفار کے ساتھ ہوئیں ان کا اصل مقصد امن کا قائم کرنا اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے مواقع کو دور کرنا تھا اور اسی نے نہایت روشن دلیلوں سے اس امر کا ثبوت دیا کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کا حکم ہو بلکہ بے شمار آیتیں اس کے برخلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں کہ دین میں کسی قسم کا جبر واکرا نہیں ہے۔

اسی نے سب سے پہلے اس نکتہ کو ظاہر کیا کہ اپنی مذہبی آزادی کے برقرار رکھنے کے لیے دین کے دشمنوں سے لڑنا اور ان کے ظلم و تعدی کا انتقام لینا یہی فطرت انسانی کا مقتضا ہے جس پر انسان عمل درآمد کر سکتا ہے نہ یہ کہ ایک گال پر پٹمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کہ دینا، کیونکہ نہ اس پر کبھی پہلے عمل ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے ثابت کیا کہ ان کفار و مشرکین کے سوا جو مسلمانوں سے محض دین کی بابت لڑیں، ان کو جلا وطن کریں اور ان کے برخلاف لوگوں کی مدد کریں، کسی مشرک یا کسی کافر کتابی یا غیر کتابی کے ساتھ دوستی کرنا، ان سے میل جول رکھنا اور صفائی و خلوص سے ملنا دین اسلام کی رو سے منع نہیں ہے۔

اسی نے سب سے پہلے فقہا کی اس غلطی کو پکڑا کہ ہر ایک مسلمانوں کے لیے دارالاسلام ہے یا دارالحرب اور ہر کافر عربی ہے یا ذمی، کیونکہ ہجرت اولیٰ میں حبیب مسلمان بنجاشی کی پناہ میں جا کر رہے تو اس وقت ابی سنیاء پر نہ دارالاسلام کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ دارالحرب کا اور ابی سنیاء کے عیسائیوں

پر نہ اہل حرب کا اطلاق صحیح تھا نہ اہل ذمہ کا۔ اور اسی طرح جن ملکوں میں آج مسلمان عیسائی سلطنتوں کے محکوم ہیں اور مذہبی امور میں اسلامی سلطنتوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں ان ملکوں کو بھی نہ دارالحرب کہہ سکتے ہیں نہ دارالاسلام اور عیسائی حکمرانوں کو نہ اہل حرب کہہ سکتے ہیں نہ اہل ذمہ۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے استدلال کیا کہ اسلام نے برخلات شرائع سابقہ کے اسیران جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قرآن سے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ اگر مسلمانوں کو اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازدواج میں عدالت نہ کر سکے گا تو اس کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ جو رو کر فی جانز نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا ثبوت دیا کہ طلاق کے مسئلہ میں یہودیوں کے ہاں افراط ہے اور عیسائیوں کے ہاں تفریط اور اعتدال صرف اسلام میں ہے اور بس۔

اُسی نے سب سے پہلے رسول خدا صلعم کا نسب نامہ عدنان سے لیکر اسمعیل علیہ السلام تک زمانہ حال کے اصول مسلمہ کے موافق صحیح کر کے دکھایا اور مخالفین کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی اسمعیل میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کی اس غلط فہمی کو رفع کیا کہ مکہ کے قریب اسمعیل کا آباد ہونا محض بناوٹ اور افسانہ ہے اور بوسہ حجرا سود، طوائت کعبہ، اشہر حرم کی تعظیم اور مکہ و منا و عرفات میں جو مناسک ادا کیے جلتے ہیں ان میں سے کسی بات کو حضرت ابراہیمؑ کے اصول سے تعلق نہیں ہے

بلکہ بیت پرستی کے اصول جو جنوبی عرب میں جاری تھے اُن سے تعلق ہے، اُس نے نہایت روشن دلیلوں اور تاریخی شہادتوں اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی تفسیر بنی اسحق یا بنی اسرائیل میں موجود نہ ہو۔

اسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ قوم عاد کا قوم نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔

اسی نے سب سے پہلے قدیم جغرافیوں کی شہادتوں اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ فاران کا لفظ جو حضرت موسیٰ اور حقوق نبی کی بشارت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آئندہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں اُس سے وادی حجاز مراد ہے نہ وہ مقامات جن کو بعض عیسائی مصنفوں نے مسلمانوں کے برخلاف فاران کا مصداق قرار دیا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے اُن عظیم الشان فائدوں کو بیان کیا جو دیگر مذاہب کو اور خاص کر دین عیسوی کو اسلام کی اشاعت سے پہنچے۔

اسی نے سب سے پہلے دین اسلام اور مغربی علوم میں مصالحت کی بنیاد ڈالی اور اسی غرض سے کم و بیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی اور ایسے اصول مقرر کیے جن کے بموجب آئینہ نسلیں اُس کے اس دشوار کام کو پورا کر سکیں اور اگر اس سے تفسیر قرآن میں کوئی تعزیر ہوئی ہو تو انہیں اصول کے موافق اس کی اصلاح کر سکیں۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ اسلام کے لیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قرآن کی جن آیتوں کے معنی علمائے سلف نے جو پاس ادب، یا



بخوب خرقِ اجماع، یا بسبب عدم ضرورت، یا اس وجہ سے کہ ممالک اسلامیہ میں علمائے اسلام کو پوری پوری مذہبی آزادی نہ تھی، صاف صاف بیان نہیں کیے اور خاص خاص صورتوں کے سوا تمام الفاظ قرآنی کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے، اب بھی ان کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ ضرور ہے کہ جو الفاظ درحقیقت بطور مجاز و استعارہ و تمثیل کے استعمال کیے گئے ہیں ان کے اصلی معنی بیان کیے جائیں اور جو شبہات ان کے حقیقی مراد لینے سے پیدا ہوتے ہیں ان کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خدا داد ملکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تھا اس کا ثبوت ان کی ہر ایک تحریر میں، جو عہد کے بعد ان کے قلم سے نکلی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، مگر تفسیر القرآن جس میں گویا نئے علم کلام کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے سب سے عمدہ نمونہ ان کی تصنیفات کا ہے اور اس کا اندازہ اس سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اس تفسیر میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں کچھ بکا آمد نہیں رہا یہاں تک کہ جو مضامین اس زمانہ میں اس طریقہ پر کاربند ہوتے ہیں ان کی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت ان کے دل میں خلط کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔

آج کل ممالک عثمانیہ میں رسالہ حمیدیہ کی بہت شہرت ہے جو طرابلس کے مشہور عالم شیخ حسین آفندی نے ۱۳۰۴ھ میں وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور جس پر شام کے بارہ جلیل القدر

عالموں نے اور روم و شام و مصر کے بہت سے نامور اخباروں نے لمبی لمبی  
تقریریں اور ریویو لکھے ہیں، چونکہ ممالک مذکور میں کسی مسلمان عالم کی یہ مجال  
نہیں کہ سلف کی تقلید کے دائرے سے قدم باہر رکھ سکے اس لیے مصنف  
موصوف کا طریقہ استدلال زیادہ تر انہیں اصول پر مبنی ہے جو قدیم مسلمانوں نے  
یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔

مثلاً اس زمانہ کے نئے اکتشافات میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورج اور  
تمام ثوابت و سیارات جو قدیم خیالات کے موافق آسمانوں میں جڑے ہوئے  
تسلیم کیے جاتے تھے و حقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ سب ایک فضلے مند  
میں جس کی وسعت غیر قننا ہی ہے، جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور بذریعہ کشش  
کے جو منجملہ قوانین قدرت کے ایک زبردست قانون ہے، اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں  
اور کبھی اس حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کوئی ایسا کرہ جو تمام عالم پر محیط ہو مثل  
آسمان یا عرش و کرسی وغیرہ کے اس فضا میں موجود نہیں ہے، یہ مسئلہ اب  
تعبیری کی حد سے نکل کر سائنس کے درجہ کو پہنچ گیا ہے جس پر تمام یورپ اور امریکا  
کے بیات دانوں کا اتفاق ہے، اگرچہ حکمائے اسلام میں سے ابو کبیر بن العریبی کی بھی  
یہی رائے تھی مگر چونکہ اس وقت تک کشش کا قانون معلوم نہیں ہوا تھا اس لیے  
وہ رائے سائنس کے درجہ کو نہیں پہنچی تھی، چونکہ قرآن مجید میں بلع سموات  
اور عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر  
اس نئی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور جن سے بڑے بڑے کُور کا  
اور ایسے اجسام عظیمہ کا جو زمین اور آسمان سب پر محیط ہیں اس فضا میں موجود ہونا  
سمجھا جاتا ہے اس لیے مصنف رسالہ حمیدین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ  
خدا تعالیٰ کا ہمارے اوپر سات آسمانوں کا پیدا کرنا اور ان کے اوپر کرسی

اور کرسی کے اور پر عرش کا پیدا کرنا اور جو کچھ ہوا یا آئینہ ہو گا اس کے ثبت کرنے اور لکھنے کے لیے لوح و قلم کا پیدا کرنا اور انسان کے اعمال کی جزا و سزا کے لیے بہشت و دوزخ کا پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ نصوص شرعیہ میں وارد ہوا ہے ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تحت قدرت کا طہ باری تعالیٰ داخل نہ ہو پس جب تک کسی دلیل قاطع عقلی سے یہ ثابت نہ ہو کہ ان میں سے کوئی چیز بالفعل موجود نہیں ہے یا ان کا موجود ہونا محالات سے ہے اُس وقت تک کوئی وجہ نہیں کہ ان کے وجود کا انکار کیا جائے۔

ہم یہاں اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان چیزوں کے عدم وجود یا عدم امکان پر کوئی قاطع عقلی موجود ہے یا نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کی غرض سے مصنف موصوف نے یہ کتاب لکھی ہے ان کے دل کا انسا ایسے بیانات سے نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ممالک اسلامیہ میں علانیہ ایسی تصنیفات پر چون و چرا نہ کی جائے لیکن جن لوگوں نے علوم جدیدہ کی تعلیم پائی ہے اور تعلیم نے ان پر اپنا پورا پورا اثر بھی کیا ہے ایسے جو ابوں سے ان کے دل کی خلش کاٹنا دشوار ہے کیونکہ جن باتوں کو وہ مثل بدہیات اولیہ کے تقینی سمجھے ہوتے ہیں ان کا یقین محض احتمالات سے زائل نہیں ہو سکتا۔

مگر جو طریقہ سرسید نے ایسے شبہات کے رفع کرنے کا اختیار کیا ہے وہ بالکل شارح کے اس اصول کے موافق ہے کہ ”کلموا الناس علی قدر عقولہم“ کیونکہ اس سے جہاں تک کہ دیکھا گیا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خاطر خواہ تشفی ہو جاتی ہے اور قرآن کے بیان میں شک و شبہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی برسید کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کا یہ نغظہ کلام آئی ہونا مسلم ہے اسی طرح یہ بھی مسلم

ہے کہ وہ انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس جس طرح انسان کے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں اس طرح خدا کے کلام معنی لگانے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ انسان کبھی الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہے اور کبھی مجازی معنوں میں، پس قرآن کے الفاظ سے بھی کبھی حقیقی معنی مراد لیے جائیں گے اور کبھی مجازی معنی۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالموں اور محققوں نے اس بات کی تشریح کی ہے کہ قرآن میں انسان کی عقل اور سمجھ کے موافق جو علمی ترقی سے پہلے اس کی اصل خلقت میں ودیعت تھی خطاب کیا گیا ہے۔ پس جو کچھ مبداء و معاد کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے ممکن نہیں کہ ان الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے کیونکہ جس طرح انسان کی سمجھ خدا کی ذات و صفات و اسماء و افعال کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح واقعات بعد الموت اس کے فہم کی رسائی سے وراء الوراہ ہیں اور کوئی لفظ یا الفاظ انسان کی زبان میں ایسے موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے ان حقائق و معارف کو کہا ہی ہی تعبیر کیا جاسکے۔ پس عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبداء و معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہوئے وہ بطور مجاز و استعارہ کے اطلاق کیے گئے ہیں نہ بطور حقیقت کے۔ اسی طرح جو خیال عام انسانوں کا آسمان اور زمین اور ستاروں کی نسبت تھا اسی کے موافق قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آسمان کو مثل ایک چھت یا سائبان کے زمین پر چھایا ہوا تصور کرتے تھے سو انھیں کی سمجھ کے موافق فرمایا ”وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا“ وہ زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا جانتے تھے سو انھیں کے خیال کے مطابق کہا ”وَالْأَرْضُ فَوْشًا هَا“ وہ ستاروں کو آسمان میں جڑا ہوا تصور کرتے تھے سو انھیں کے تصور کے موافق فرمایا ”إِنَّا بَيْنَنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بَرِيَّةَ الْكَوَاكِبِ“ کیونکہ اصل مقصود آسمان اور زمین اور

ستاروں کی حقیقت بیان کرنا نہ تھا بلکہ مصنوعات کی عظمت سے جس طرح پر کم وہ اُس کو تسلیم کیے ہوئے تھے۔ صنایع کی عظمت و جلال کا تصور دلانا اور اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا۔

یہ ایک نہایت مختصر اور ناکافی خلاصہ ہے اُن تحریروں کا جو سرسید نے اس قسم کے شبہات رفع کرنے کی غرض سے تفسیر کے مختلف مقالات میں بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہیں اگر کسی کو زیادہ تفصیل و کمینہ منظور ہو تو وہ تفسیر کی جلدوں کو اور اُن کے رسالہ اصول التفسیر کو مطالعہ کرے۔

یامثلًا مصنف رسالہ حمیدیتہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر خواتق عادات یعنی معجزات سے استدلال کیا ہے اور جو کچھ معجزہ کے متعلق علم کلام کی کتابوں میں لکھا ہے اسی کو زیادہ صفائی کے ساتھ اپنی عبارت میں ادا کیا ہے۔ اگرچہ خرق عادت کو دلیل نبوت گروانتے پر قدیم سے رد و قدح ہوتی چلی آئی ہے یہاں تک کہ خود اہل اسلام میں سے بعض محققین نے نہایت زبردست دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ معجزہ کسی طرح دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جمہور متکلمین قدیم سے خرق عادت کو دلیل نبوت کہتے چلے آئے ہیں لیکن اس زمانہ میں وہ تمام دلیلیں جو خرق عادت کے ممکن ہونے یا اُن سے نبوت کے ثابت ہونے پر قائم کی جاتی تھیں سب بے کار ہو گئی ہیں۔ ہر شخص جس نے زماثرہ حال کے علوم طبیعیہ کی تعلیم پائی ہے اور اُن کو اچھی طرح سمجھا ہے، وہ دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے اور اسباب و مسببات میں کبھی تغلف واقع نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا شبہ متکلمین کے استدلال پر یہ وارد ہوتا ہے کہ سلاخبر معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اُن میں سے کسی معجزہ کی

کی نسبت یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے دعوت اسلام کرتے وقت یا اس وقت جبکہ آپ سے معجزے طلب کیے گئے منکرین کو کوئی معجزہ دکھایا ہو بلکہ برخلاف اس کے قرآن سے بخوبی ثابت ہے کہ جب کبھی کفار کی طرف سے معجزے طلب کرنے میں اصرار ہوا تو آپ نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ ”انما الآيات عند الله“ یا ”سبحان ربی هل كنت الا بشرًا رسولاً“ یا ”لوان عندی ما تستجلون به لقضی الامر بینی و بینکم“ یا ”ولو كنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء“ ان انا الا نذیر ونبیر لقوم یومنون“ حالانکہ نبوت کا ثبوت اگر معجزہ پر منحصر ہوتا تو کفار کو عند الطلب معجزہ دکھانا ضرور تھا، بعینہ ایسا ہی انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر معجزات حضرت عیسیٰ کی طرف سے طلب کیے جاتے ہیں ان میں سے کوئی معجزہ عند الطلب نہیں دکھایا گیا بلکہ برخلاف اس کے متی باب ۲۴ و ۲۶ و ۲۷ اور مرقس باب ۸ و ۱۴ و ۱۵ اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سے بارہا معجزے طلب کیے گئے مگر آپ نے ان کے دکھانے سے انکار کیا۔

بیزمنصف موصوف نے قدیم متکلمین کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی نسبت یہ بھی لکھا ہے کہ آپ سے خوارق عادات کا وقوع میں آتا تو اثر معنوی کی حد کو پہنچ گیا ہے اور جو بات تو اتر سے ثابت ہو اس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانہ میں تو اتر کو اسی حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جب کہ روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانون قدرت کے خلاف مندرج نہ ہو۔

بہر حال کسی نبی کی نبوت کے ثبوت میں اس کے خوارق عادات کو پیش کرنا، جیسا کہ قدیم متکلمین کا دستور تھا، اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا بلکہ کسی نبی



کی نسبت یہ ثابت ہونا کہ اُس نے خوارق عادات دکھانے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، یہی ثبوتی دلیل اس کی سچائی کی سمجھی جاتی ہے۔

سرسید نے برخلات جمہور تمسکین کے خرق عادت کے واقع ہونے سے انکار کیا ہے اور اس دعوے کی تائید میں کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔ قاضی ابن ارشد اندلسی کی ایک لمبی تقریر ان کی کتاب "الکشف عن مناجج الاولیاء فی عقائد الملئ" سے نقل کی ہے جس کا ماہر حاصل یہ ہے کہ بعد تسلیم کرنے اس بات کے کہ خدا موجود، سرید، تکلم، قادر اور مالک عباد ہے اور وہ رسول بھیجا کرتا ہے۔ اور ان سے معجزات بھی صادر ہوا کرتے ہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن سے معجزے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے رسول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر بحث کی ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفسیحات سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "شق قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ علامات قیامت میں سے ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "اقترت الساعة والنشق القمر" اور خدا تعالیٰ نے ان معجزات میں سے (یعنی آنحضرت صلعم کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا اور نہ کہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

اس کے بعد خود سرسید نے ایک نہایت مفصل اور شافی بحث فطرت انسانی پر اور اس بات پر کی ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رو سے ہلاکت کرنے والوں کا محتاج ہے اور اسی فطرت کا مقتضایہ ہے کہ جو گروہ کسی شخص کو دین یا شریعت کا ہادی سمجھتا ہے اُس کو جب تک انسانیت کے درجہ سے وراہ الوسا نہیں ٹھیرا تیا اس کے دل کو صبر نہیں آتا یہاں تک کہ اس کو خدا اور خدا کا بیٹا تک کہنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور کم سے کم یہ کہ اُس میں

ایسے اوصاف اور معجزات اور کرامتیں ثابت کرتا ہے جن سے وہ باوجود انسان ہونے کے نوع انسان سے بالاتر سمجھا جائے۔ معمولی واقعات جز عادت الہی کے مطابق ہوتے رہتے ہیں جب اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو وہی اس کی کرامتیں اور معجزے قرار پا جاتے ہیں۔ اگر ایک عام آدمی کسی کو بد نما رہے کہ تجھ پر بجلی گرے اور اتفاق سے وہ بجلی ہی سے مارا جائے تو کسی کو کچھ خیال نہیں ہوتا لیکن اگر وہ بد دعا کسی ایسے شخص نے دی ہو جس کے تقدس کا خیال لوگوں کے دلوں میں ہر تھامس کی کراست یا معجزہ سمجھا جاتا ہے..... انسان میں بعض ایسی قوتیں ہیں جو خاص طریقہ مجاہدہ سے قوی ہو جاتی ہیں اور کسی میں بمقتضائے خلقت قوی ہوتی ہیں اور ان سے ایسے ایسے امور ظہور میں آتے ہیں جو ان لوگوں سے ظہور میں نہیں آسکتے جن کی قوتیں مجاہدہ سے یا بمقتضائے خلقت دلیں قوی نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ سب امور ساسی طرح واقع ہوتے ہیں جیسے تمام کام بمقتضائے فطرت انسانی وقوع میں آتے ہیں مگر وہ امور بھی ان مقدس شخصوں کے معجزے یا کلمات سمجھے جاتے ہیں۔ پھر بہت سی عجیب باتیں ان بزرگوں کی..... نسبت ایسی مشہور ہو جاتی ہیں جن کی درحقیقت کچھ اصل نہیں ہوتی مگر جن کی طرف وہ منسوب کی جاتی ہیں ان کی معنیت کے سبب سے بلا تحقیق ان پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کے اکثر کاموں کو بطور خوارق عادات کے بیان کیا گیا ہے اور بہت سی باتیں ان کی طرف ایسی منسوب کی گئی ہیں جن کا کچھ ثبوت نہیں۔ اتنے ملخصاً۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ انھیں غلط خیالات کے سبب لوگوں نے انبیاء سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود نے انبیاء کے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی کہ ”ان انتم الالبشر مثلنا“ اور انھیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے

طلبگار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں ان کے پاس قرشتے آتے؟ کیوں نہیں ان کے پاس خزانہ اُتار گیا! کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھانے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں، یعنی انسانوں سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے۔ کبھی آسمان سے پتھر برسوانے چاہتے تھے، کبھی آسمان کا ٹکڑا اڑٹ کر گرنے کی خواہش کرتے تھے۔

اس کے بعد سرسید نے سورہ کہف، سورہ اعراف، سورہ بنی اسرائیل اور سورہ عنکبوت کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ معجزہ یا علم غیب کے نتیجے سے متوقع ہیں ان سے کہہ دے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک بشر ہوں مثل تمہارے جس کو وحی سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے اور بس اور کہہ دے کہ میں بغیر خدا کی مشیت کے نہ اپنے تئیں نفع پہنچا سکتا ہوں نہ نقصان اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو کثرت سے عجائبا حاصل کر لیتا اور بُرائی مجھ کو چھوٹی بھی نہیں۔ میں کچھ نہیں ہوں سوا اس کے کہ مومنوں کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور بس اور کہہ دے کہ پاک ہے میرا رب میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک انسان خدا کا بھیجا ہوا اور کہہ دے کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں کچھ نہیں ہوں مگر ایک علانیہ ڈرانے والا۔

ان آیتوں کے نقل کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "آنحضرت صلعم کے پاس جو کہ افضل الانبیاء والرسل ہیں معجزہ نہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین (علیہم السلام) کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے وہ نہ حقیقت معجزات نہ تھے بلکہ ایسے واقعات تھے جو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوئے تھے۔

خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو اس بات کو کھول دیا اور چھپاؤ کا نہیں

رکھا اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ بڑا جزو اسلام کا..... جس کی وجہ سے آپ  
 خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیل تلقین توحید ذات باری تھی جو توحید ذات  
 لٹاٹہ میں منحصر ہے۔ یعنی توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید  
 فی العبادۃ۔ انبیاء میں معجزات کا اعلیٰ المعنی المتعارف آیا اولیاء اللہ میں کرامات کا  
 یقین کرنا اگو کہ اعتقاد کیا جاوے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت اُن میں  
 دی ہے، توحید فی الصفات کو نامکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت، کوئی بزرگی، کوئی  
 تقدس اور کوئی صداقت اسلام اور بانی اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ  
 اُس نے بغیر کسی لاؤ پیٹ کے اور بغیر کسی دھوکا دینے کے اور بغیر کسی کوشش  
 و کڑوت کا دعویٰ کرنے کے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ معجزے تو  
 خدا کے پاس ہیں، میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں، میرے دل میں جو وحی  
 والی ہے اُس کی تم کو تلقین کرتا ہوں۔ صلی اللہ علیٰ محمد خاتم النبیین وحبیب رب العالمین“  
 اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ خوارق عادات جو عموماً انبیاء کی طرف منسوب  
 کیے گئے ہیں سرسید اس کی وجہ یہ نہیں سمجھتے کہ اُن کی نبوت کا یقین لوگوں کو  
 فی الواقع اُن کے خوارق عادات دیکھنے سے ہوا تھا بلکہ اُن کے نزدیک انسان کی  
 فطرت کا مقتضا یہی ہے کہ انبیاء اور اولیاء اور تمام مقدس لوگ جن سے اُن کو عقیدت  
 ہوتی ہے، اُن کی معمولی باتیں بھی اُس کو معجزہ اور کرامت معلوم ہونے لگتی ہیں۔  
 اسی مطلب کو وہ آگے چل کر دوسری طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”لوگوں  
 کا خیال ہے کہ انبیاء پر ایمان لانا بسبب ظہور معجزات باہرہ کے ہوتا ہے مگر خیال  
 محض غلط ہے۔ انبیاء پر اِکسی ہادئ باطل پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل  
 اور قانون قدرت کے تابع ہے۔ بعض انسان از روئے فطرت کے ایسے سلیم  
 الطبع پیدا ہوتے ہیں کہ سیدھی اور سچھی بات اُن کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔

وہ اس پر یقین کرنے کے لیے وہیں کے محتاج نہیں ہوتے باوجود کہ وہ اس سے ماتوس نہیں ہوتے مگر اُن کا وجدان صحیح اُس کے سچے ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ اُن کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اُس بات کے سچ ہونے پر اُن کو یقین دلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو انبیائے صادقین پر صرف اُن کا وعظ و نصیحت سن کر ایمان لاتے ہیں، نہ معجزوں اور کرامتوں پر۔ اسی فطرت انسانی کا نام شریعت نے ہدایت رکھا ہے۔ مگر جو لوگ معجزوں کے طلبگار ہوتے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لاتے اور نہ معجزوں کو دکھانے سے کوئی ایمان لاسکتا ہے۔ خود خدا نے اپنے رسول سے فرمایا کہ اگر تو زمین میں ایک سُرنگ ڈھونڈ لے نکالے یا آسمان میں ایک سیرٹھی لگائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ایک جگہ فرمایا کہ ”اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی بھیجیں اور اُس کو وہ اپنے ہاتھوں سے بھی چھو لیں تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو علانیہ جادو ہے۔“ پس ایمان لاتا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے، جیسے کہ خدا نے فرمایا ”اللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم“ ہادی باطل پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں (یا ہادی برحق کی بات قبول نہیں کرتے) اُن کے دل میں بھی غالباً اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُس کا سبب کبھی اُن کی فطرت ہوتی ہے جو کبھی کی طرف مائل ہے اور یہی طرف مائل ہی نہیں ہوتی اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے ”من یشاء اللہ یضللہ و من یشاء یجملہ علی صراط مستقیم“ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ دین آجانی کا اور سوسائٹی کا ایسا بوجھ اُن کی طبیعتوں پر ہوتا ہے کہ سیدھی بات کے دل میں آنے کی جگہ ہی نہیں رہتی اور کبھی یہ ہونا ہے کہ غفلت یا طبع بہو کر اس بات پر غور نہیں کرتے اور اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ”و من



يُرَادُ اللهُ أَنْ يَهْدِيَهُ فَيُفْضِحَ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُزِدْهُ يَضْلِهِ يَجْعَلْ صَدْرَهُ  
ضَيْقًا حَرَجًا كَمَا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللهُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ“

پھر اسی معجزہ کی بحث میں سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر معجزہ سے جیسا  
کہ شاہ ولی اللہ اور بعض دیگر محققین نے لکھا ہے، یہ مراد ہے کہ وہ بغیر موجود  
ہونے اسباب کے ظہور میں نہیں آتا تو ہم ایسے امر کے واقع ہونے سے  
انکار نہیں کرتے مگر نبی کے ساتھ اس کے مخصوص ہونے اور غیر نبی سے  
اس کے ظہور میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی اور اگر اس سے جیسا کہ  
جبہور قلمکین قائل ہیں کوئی امر خارق عادت جہ قوانین قدرت کے برخلاف ظہور  
میں آئے مراد ہے تو ہم اس کے انکار پر مجبور ہیں، نہ اس لیے کہ حکما و فلاسفہ  
اس کو کسی وجہ سے ناممکن سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ قرآن ہم کو صاف  
صاف ہدایت کرتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے، جیسا کہ خدا تعالیٰ  
نے سورہ قمر میں فرمایا کہ ”اِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ“ اور رعد میں فرمایا ”وَكُلُّ  
شَيْءٍ عِنْدَنَا بِمِقْدَادٍ“ اور فرقان میں فرمایا ”خُلِقَ كُلُّ شَيْءٍ قَدْرًا مَعْدُورًا“ اور روم میں فرمایا ”لَا تَبْدِيلَ  
لِخَلْقِ اللهِ“ اور ملائکہ میں فرمایا ”فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَحْوِيلًا“ اور  
سورہ فتح میں فرمایا ”سَمِعَ اللهُ الَّتِي قَدْ خَلَّتْ مِنْ قَبْلِ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا“ اور عبی اسرئیل  
میں فرمایا ”قُلْ كُلٌّ يَجْعَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ“ (ای طریقہ الٹی جیل علیہا) یہ تمام آیتیں اس  
بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی شے اپنے اندازہ سے جو خدا تعالیٰ نے اس  
کے لیے مقرر کیا ہے نہ بڑھ سکتی ہے نہ مٹ سکتی ہے اور خدا کی  
بنانی ہوتی خلقت میں تبدیلی ممکن نہیں اور خدا کی سنت (یعنی عادت) بدل سکتی  
ہے اور نہ دیگر گوں ہو سکتی ہے اور ہر کوئی اسی طریقہ پر چلتا ہے جو اس کی



جہلت میں رکھا گیا ہے۔ انتہے ملخصاً۔

بہر حال معجزہ بن معنوں میں کہ وہ عموماً بولا جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک نہ اُس کا وقوع میں آنا ممکن ہے اور نہ نبی کی تصدیق اُس پر موقوف ہے۔ اُن کے نزدیک بھی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کی تسلیم تمام طبقات اناس کی سمجھ کے موافق اور جاہل اور حکیم اور خدا پرست اور نفس پرست سب کو ایک نتیجہ پر پہنچانے والی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ”حکمائے الہی اور انبیاء نے ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حکما صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کر سکتے ہیں جن کا دل و دماغ تربیت پا چکا ہے، برخلاف اس کے انبیاء تمام کافہ و انام کو تربیت کرتے ہیں جن کا بہت بڑا حصہ محض نا تربیت یافتہ، جاہل، وحشی جنگلی، بدوی، بے عقل اور بد دماغ ہوتا ہے اور اسی لیے انبیاء کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اُن حقائق و معارف کو جن کو تربیت یافتہ عقل بھی مناسب طور پر فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے، ایسے الفاظ میں بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑ مغز دونوں برابر فائدہ اٹھائیں، قرآن مجید میں جو بے مثل چیز ہے وہ یہی ہے کہ اس کا طرز بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہے اور باوجود اس قدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انھیں آیات کی نسبت یعنی جن آیتوں میں جنت اور حور تصور وغیرہ کا بیان ہے، وہ مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ بہشت وغیرہ کا جن الفاظ سے بیان ہوا ہے اُن سے بعینہ وہی اشیا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لاتا ہے۔ اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عذگی نعیم جنت کی اور ایک ترسبیب اور امر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک کوڑ مغز

مٹلا یا شہوت پرست زاہد سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت  
ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پیئیں گے، میوے کھاویں گے، دودھ اور شہد  
کی ندیوں میں نہاویں گے اور جردل چاہے گامزے اڑائیں گے، وہ بھی اس لغو  
وہیودہ خیال سے دن رات اواسر کے بجالانے اور لوہی سے بچنے میں کوشش  
کرتا ہے اور جس نتیجہ پر پہلہ پہنچا تھا اسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافہ انام کی  
نزیبت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے۔ پس جس شخص نے قرآن مجید کی ان حقائق  
پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کیا اُس نے درحقیقت قرآن کو مطلق  
نہیں سمجھا اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا۔

اس طریقہ استدلال میں، جو کہ سرسید نے اسلام کی سچائی ثابت کرنے  
کے لیے اختیار کیا ہے، اور شیخ حسین آفندی کے طریقہ میں جو رسالہ حمیدیہ  
میں اختیار کیا گیا ہے، یہ فرق ہے کہ شیخ کے استدلال سے زیادہ تر وہ لوگ  
متاثر ہوتے ہیں جن پر نئی تعلیم نے کچھ اثر نہیں کیا اور جن کے دل ہر قسم کے  
مشکرک و شبہات سے خالی ہیں، مگر جس جماعت کی تشفی کے لیے وہ کتاب لکھی  
گئی ہے اس پر اس کا منتر کچھ کارگر نہیں ہوتا، برخلاف اس کے جو طریقہ  
سرسید نے اپنی تفسیر میں اسلام کی حقیقت ثابت کرنے کا اختیار کیا ہے اگرچہ  
پُرانے خیالات کے مسلمان جن کے لیے درحقیقت یہ تفسیر نہیں لکھی گئی،  
اُس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن نئے خیالات کے لوگ، جو اس تفسیر  
کے مخاطب صحیح ہیں، وہ اُس سے خاطر خواہ تشفی پاتے ہیں۔

آج کل ہندوستان میں مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ ہر شخص جس مذہب  
پر اور جس مذہبی تصنیف پر چاہے اعتراض کر سکتا ہے، باوجود اس کے  
سرسید کی مذہبی تصنیفات پر جس قدر اعتراضات آج تک سنے گئے ہیں

وہ سب قدیم خیالات کے مسلمانوں کی طرف سے سُنے گئے ہیں۔ کسی نئے تعلیم یافتہ مسلمان نے اُن پر نکتہ چینی نہیں کی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اکثر مذہب کی طرف سے ایسے بے پرواہ ہیں کہ وہ کسی مذہبی تصنیف کے مخالف یا موافق لکھنے کو ایک فضول بات سمجھتے ہیں اور بہت بڑا حصہ اس گروہ کا وہ لوگ ہیں جو اس بات کے سمجھنے کی یاقوت ہی نہیں رکھتے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسلام کے خالص اصول کے موافق صحیح ہے یا نہیں مگر با اینہم نئے خیالات کے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دین اسلام کے دلدادہ ہیں۔ قرآن اور حدیث کو سنجو بی سمجھتے ہیں اور نہ کچھ مذہب کے متعلق آج کل لکھا جاتا ہے۔ اس پر نکتہ چینی کرنے اور رائے دینے کی کافی یاقوت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بھی کسی نے، سوا اس کے کہ بعض جزئیات میں سرسید سے اختلاف کیا ہو، ان اصول کے تسلیم کرنے سے جن پر تفسیر مذکور کی بنیاد رکھی گئی ہے، انکار نہیں کیا۔

سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کیے ہیں ان میں ظاہراً کوئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جس پر کچھ گرفت ہو سکے، مگر اس میں شک نہیں کہ بہت سی آیتوں کے معنی بیان کرنے میں جن اصول کی ان کو پابندی کرنی چاہیے تھی ان کی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے بعض ہم خیال آدمی ان کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

مثلاً سرسید جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے اسی طرح ان کے نزدیک انبیائے سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اس لیے انہوں نے انبیائے سابقین کے ہر ایک ایسے واقعہ کو جو ظاہراً کسی امر عاقلیہ پر دلالت

کرتا ہے۔ قانون قدرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کی ہے، مگر ان کے بعض ہم خیال، باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانون قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا، مگر ان کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیائے سابقین کے اکثر واقعات، اگرچہ لفظی طور پر موافق قانون قدرت کے واقع ہوئے ہوں، مگر قرآن مجید میں بطور خوارق عادات کے، جیسا کہ عرب کے اہل کتاب اعتقاد رکھتے تھے، بیان کیے گئے ہیں اور ان کے نزدیک قرآن کی یہ طرز بیان ہرگز اس کی سچائی کے برخلاف نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اور دلائل کے خود سرسید نے متعدد آیتوں کی تفسیر اس اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں، محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور ان کے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ اصول و حقیقت انہوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب حجتہ بالغہ سے اخذ کیا ہے۔ جہاں وہ لکھتے ہیں کہ ”شائع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے ان کی اصل خلقت میں ودیعت تھی، ان سے خطاب کیا ہے“ اور دوسری جگہ اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ”انبیاء کی شان اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ ان کی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھ کر جس پر کہ وہ مجبور ہوئے ہیں، کلام نہ کریں“ اسی اصول کے موافق سرسید نے اس آیت کی تفسیر کی ہے جس میں زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اور جس پر سائنس کا یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا چھ دن سے زیادہ عرصہ میں پیدا ہوئی ہے۔ ان کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے کسی حقیقت یا کسی خبر کا بیان کرنا

مقصود نہیں ہے بلکہ تورات میں بھی چونکہ اس موقع پر چھ دن کا لفظ واقع ہوا تھا اور عرب کے تمام اہل کتاب اور دیگر قومیں جو اہل کتاب سے میل جول رکھتی تھیں سب کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا چھ دن میں بنی ہے اس لیے شارع نے اسلام کا اصل مقصد یعنی خدا کی الوہیت اور توحید کا یقین دلانا، مخاطبین کی سمجھ کے موافق ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ ”ان دیکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام“

چونکہ سرسید کے قول کے موافق بزرگوں اور مقدس لوگوں کی طرف خوارق عادت کا منسوب کرنا انسان کی فطرت کا مقتضا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثر معمولی باتیں بھی معجزات یا کرامات تصور کی جاتی ہیں اور خاص کر انبیائے نبی اسرائیل کے قصے جو عرب کے اہل کتاب میں مشہور تھے ان میں بہت سی باتیں بطور خوارق عادت کے مشہور چلی آتی تھیں اور قرآن میں ان تصویروں کا بیان کرنا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ ان میں جو باتیں مخاطبین کی ہدایت اور تہذیب نفس میں دخل رکھتی تھیں صرف ان کا بھلا ذکر کرنا منظور تھا اس لیے یہ ایک لازمی بات تھی کہ انبیائے نبی اسرائیل کے تصویروں میں جس قدر کہ قرآن مجید میں بغرض روحانی تعلیم کے اخذ کیا جائے وہ انھیں پیرایوں میں بسیان کیا جائے جو اہل کتاب کے دلوں پر مثل علوم متعارفہ کے نقش ہو رہے تھے۔ کیونکہ قرآن کا اصل مقصد ان نصیحتیں کا بیان کرنا تھا جو ان تصویروں سے استنباط ہوتی تھیں نہ کہ ان فصول کی نسبت انیسویں صدی عیسوی کی سائنٹفک تحقیقات کا بیان کرنا۔ ہاں بلاشبہ قرآن کا جو خاص کر توحید کی تکمیل کے لیے نازل ہوا تھا، یہ کام تھا کہ خرق عادت کا غلط خیال جو توحید فی الصفا کا منافی تھا، اس کی غلطی ظاہر کر دے۔ سوائس نے نہایت تصریح کے



ساتھ مستقل طور پر یہ کہ انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات کے ضمن میں، اُس کی غلطی کو ظاہر کر دیا اور خود خاتم النبیین کی زبان حق ترجمان سے بکرات و مرآت علی زوس الا شہاد کہلوا دیا کہ ” اَمَّا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَآمَنَّا بِهَا مَا مَلَازِمًا “

الغرض باوجود ان جزوی اختلافات کے جو سرسید کے اسکول کے بعض اشخاص یعنی آیتوں کی تفسیر میں ان کے ساتھ رکھتے ہیں، ظاہراً ان اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں جن پر اس تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور غالباً متشنع مقالات کے سوا جن کو ہم کسی دوسری تحریر میں بیان کریں گے جو کچھ کہ سرسید نے زمانہ حال کے مسائل کلامیہ کی نسبت لکھا ہے، اس کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ کی اسلوی فتومات میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً وحی اور اُس کے نودل کی تحقیق، نبوت کی حقیقت، قرآن کے معجز ہونے کا بیان جنت و دوزخ اور اُس کے نعیم و آلام کی حقیقت، آدم کے بہشت سے نکلنے جانے کی تحقیق، معجزہ کی بحث، ملائکہ اور شیطان کی بحث، خیر و بدیہ کی حقیقت، ناسخ و منسوخ کی بحث، سمت قبلہ کی تحقیق، حضرت عیسیٰ سے بن باپ پیدا ہونے کی تحقیق، شہد اکو زندہ بچنے کی تحقیق، قطع یدِ سارق کے مسئلہ کی تحقیق، نفع صوم اور وزن اعمال کی تحقیق، روح اہل اُس کے باقی رہنے کی بحث، آفریت اور قیامت کا بیان خدا کے ساتھ موسیٰ کے کلام کرنے اور کوہ طور پر سنبھل ہونے کی بحث، اویدار الہی کی بحث، بدر و حنین کی لٹائی میں فرشتوں کے آنے کی تحقیق، طوفان لوح کی بحث، حضرت یعقوب کے نابینا ہونے کے بعد بینا ہونے کی تحقیق، معراج اور شوق صدر کے مسئلہ کی تحقیق اور اسی قسم کی اور بہت سی تحقیقاتیں اور بحثیں خاص کر توحید کے ناائق ہیں۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے وہ



سر ممبر اسرار ظاہر کیے ہیں جن کے اعلان کرنے کی ممانعت قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے مگر اس اب میں انہوں نے جو غدر کیے ہیں وہ بھی لحاظ کے قابل ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر کی تیسری جلد میں علامہ ابن رشد کی ایک باہمی تقریر کا خلاصہ نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مسائل خامضہ جو جہور کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں ان کو ایسے لوگوں کے سامنے جو ان کے اہل نہیں ہیں بیان کرنے والا کافر ہے اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی نص کی تاویل کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد ظاہری معنوں کو باطل کرنے اور تاویلی معنوں کے ثبوت کرنے کا ہوتا ہے۔ پس جب کہ عام آدمیوں کے نزدیک ظاہری معنی باطل ہو گئے اور تاویلی معنی ان کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ نص اصول دین سے علاقہ رکھتی تو ظاہر ہے کہ کفر تک توبت پہنچ جائے گی۔ انتہی ملخصاً۔

اس تقریر پر سرسید لکھتے ہیں کہ ”نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ کوئی بات بھی شریعت کی جو بیان حقیقت یا تاویلات کی قسم سے ہو، سوائے راسخین فی العلم کے کسی کے سامنے بیان نہ کی جائے۔ جس قسم کے لوگوں کو ابن رشد نے راسخین فی العلم میں قرار دیا ہے اس زمانہ میں تو ایسا شخص کرنی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانہ میں بھی دو ایک کے سوا کوئی نہ تھا، پس ضرورتاً لازم آتا ہے کہ تمام مقدم باتیں شریعت کی بطور ایک معاد و چیتاں یا مثل ما زفر مین کے غیر معلوم رہنی چاہیں۔“

”اگر ہمارا مذہب اسلام ایسا ہو کہ اس کے اصول لوگوں کو نہ سمجھا سکیں جو ان کو سمجھنا چاہتے ہیں، یا ان لوگوں کی تفسیر نہ کر سکیں جن کے دل میں شہادت پیدا ہوئے ہیں بلکہ ان سب کو اس پر مجبور کریں کہ ان باتوں کو ایسی

طرح مان لو تو ہم اپنے مذہب کی صداقت نی نفسہ اور متقابلہ دیگر مذاہب غیر حق کے کیونکر ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک عیسائی کہتا ہے کہ "تسلیمت کا مسئلہ کہ تین تین بھی ہیں اور ایک بھی ہیں، ایک الہی مسئلہ ہے۔ اس پر بے سمجھے یقین کرنا چاہیے"۔ پس اگر ہم مذہب اسلام کے بہت مسئلوں کی نسبت ایسا ہی کہنا قرار دیں تو کیا وجہ ہے کہ اس کی تکذیب اور اس کی تصدیق کریں؟

اس کے بعد ان کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں عالم اور جاہل سب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو اپنے مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں، دوسرے وہ جو ہر ایک بات کی دلیل طلب کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ جاہل ہوں یا عالم کسی بات کا بغیر دلیل یقین نہیں کرتے۔ اس دوسری قسم کے لوگوں سے (جو اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہیں) یہ کہنا کہ تم راغبین فی العلم میں سے نہیں ہو لہذا مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کر لو اور اسی پر یقین رکھو، کس طرح ان کے دل کو تسخیر دے سکتا ہے؟ کیونکہ یقین کوئی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ اضطراری شے ہے کہ جب تک وہ شبہ رفع نہ ہو جس سے یقین میں خلل ڈالا ہے، ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضرور ہے کہ ہر ایک امر قابل بیان کی حقیقت اور قابل تاویل کی تاویل ان کے سامنے بیان کی جائے اور اس صورت میں جو لوگ ان باتوں کے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بیان نہیں کرتے، وہ اسی دلیل سے کافر قرار پاتے ہیں جس دلیل سے کہ ابن رشد نے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کو کافر بتایا ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ "فرض کرو ان مشکلیں کو اس قدر بیاقت نہیں ہے

کہ وہ اُن حقیقتوں اور تاویلوں کو سمجھیں مگر اتنی بات تو اُن پر ثابت ہوگی کہ اُس کے لیے دلیلیں اور اُس کی صداقت کے ثبوت کے لیے وجوہاتیں اور اُس کی حقیقت کے لیے بیانات ہیں مگر ہم اُن کو سمجھ نہیں سکتے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُن کے سمجھانے کا جو فرض ہم پر تھا اُس کو تو بلاشبہ ہم ادا کر دیں گے بہت لوگوں نے پیغمبروں کی نصیحتوں کو نہیں سمجھا مگر پیغمبر اس خیال سے کہ وہ اُن کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں نصیحتوں کے سمجھانے سے باز نہیں رہے بلکہ طرح طرح سے سمجھایا اور کوشش کی کہ اُن کو اُن کے سمجھنے کے لائق کریں۔

”اس خوف سے کہ اُن لوگوں کے نزدیک جب ظاہر معنی باطل ہو جائیں گے اور اصل حقیقت یا تاویل کے سمجھنے کے لائق نہ ہونے کے سبب وہ اُس کو نہ سمجھیں گے تو اصول شرع سے منکر ہو جاویں گے اور کفر تک نوبت پہنچاویں گے ہم کہ حقیقت اور صداقت کے بیان سے باز نہیں رہنا چاہیے۔ اگر یہ الزام صحیح ہو تو قرآن مجید بھی با انہما خربی اس الزام سے بری نہیں رہ سکتا۔ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ ” یصل بہ کثیرا و یجیدی بہ کثیرا“

ابن رشد نے اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان باتوں کا بیان کرنا خاص کر اس حالت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہے جب کہ اصول شریعت میں تاویلات فاسدہ ہونے لگیں جیسا کہ ہمارے ایسی ابن رشد کے زمانہ میں لوگوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے۔ اس تقریر پر یہ سرسبد یہ ریمارک کرتے ہیں کہ ”تاویلات فاسدہ بھی اگر ہوں تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں، اس لیے کہ جو چیز غلط ہے اُس کی غلطی بہت دیر پا نہیں ہو سکتی، دوسروں کو اس کی غلطی بیان کرنے کا اور غلط کو صحیح کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر وہ بیان ہی نہ کی جاویں تو سچ بات کے ظاہر ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں آسکتا۔“

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جب کہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں، علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا جس کو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور تمام لوگ اعلیٰ و ادنیٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے اور ان کے دل شبہات و تشکیکات سے پاک تھے اور یہی باعث ہوا کہ ان علما نے ایسی رائے قائم کی تھی۔ مگر وہ زمانہ گیا، علوم و حکمت اب اس قدر عام ہو گئی کہ ایک بہت بڑا حصہ دنیا کا اس سے واقف ہو گیا۔ فضل و بہتان اپنے مکتب میں ارسطو اور افلاطون کی غلطیوں کا جہاں جہاں انھوں نے کی ہیں، ذکر کرنا ہے۔ ہزاروں آدمی ہر شہر و قصبہ میں ایسے موجود ہیں جو خود کچھ نہیں جانتے مگر بہت سے مسائل علوم و حکمت کے سن سن کر کان آشنا ہو گئے ہیں اور اکثر اناس وہ ہیں جن کے دل شبہات و تشکیکات سے مملو ہیں۔ اس زمانہ میں جو اہل علم ہیں ان کا ایمان بھی حلق کے بچے تک نہیں ہے، منہ سے کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن و حدیث میں آیا ہے اس پر یقین کرنا چاہیے مگر دل میں شبہات بھرمے پڑے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یقین کرنے سے منہیں ہوتا بلکہ ہونے سے ہوتا ہے۔ پس اب زمانہ ہے کہ جو کوئی بقدر اپنی طاقت کے ان تمام حقائق اور تاویلات کو نہ کھولے اور لومہ لائم سے نڈر ہو کر اگلے علما کی ان غلطیوں کو جو اس زمانے کے نامکمل علوم اور نامکمل

ملہ سر یہ کہ اس بیان میں کسی قدر ناسمج ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مطلب ان کو اس طرح ادا کرنا چاہیے تھا کہ "قدر ہو کر ان باتوں کو جن کے بیان کا اب پہلے کبھی وقت نہیں آیا تھا اور اس لیے ہماری قدیم مفسرین ان کے بیان کرنے سے ساکت رہے تھے عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔" ۱۲

تحقیقات کے سبب خفائق کے بیان اور قرآن مجید کی تفسیر میں راہ پاگنجی ہیں  
عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے، وہ اپنے فرض کے ادا کرنے  
سے قاصر ہے۔ ومن یفعل ذلک فهو لودی حق اللہ وحق دینہ وحق اہل دینہ و  
قومہ واللہ المستعان۔

## سوشل ریفارم

اگرچہ ہندوؤں میں اس صدی کے آغاز سے وقتاً فوقتاً ایسے اولوالعزم  
آدمی اٹھتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح پر  
کمر باندھا ہے۔ جیسے راجہ رام موہن رائے، بابو کیشپ چند سین، ایشر  
چند روڈیا ساگر، سریش چندر بھٹا چارج رام تنولا بھیرمی، سوامی دیانند سرتی  
وغیرہ وغیرہ۔ مگر مسلمانوں میں ظاہراً وہ شخصوں کے سوا کہ دونوں دلی کی خاک  
سے لٹھے۔ کسی نے اس کا پرہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسماعیل اور دوسرے  
سید احمد خاں، گو کہ زمانے کے اقتضا سے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا  
ہوتے جاتے ہیں جن کو قوم کی سوشل خرابیاں محسوس ہونے لگی ہیں۔ مگر اتنی  
جرات کسی کو نہیں ہوتی کہ تمام قوم کے برخلاف کسی بڑی رسم یا ریت کو ترک  
یا کسی اچھی بات کو اختیار کیا جاسکے۔ ہر سید نے اپنی تحریر میں اس بات کی  
طرف اشارہ کیا ہے کہ اکثر لوگ ہیں جو بہت سی رسموں کو بڑا جانتے ہیں مگر  
ان کو چھوڑ نہیں سکتے اور بہت سی باتوں کو اچھا جانتے ہیں مگر ان کو اختیار  
نہیں کرتے۔ بعض تو یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ مداخلت کرے تو قرار واقعی  
اصلاح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم بدنامی سے بچیں اور گورنمنٹ بدنام ہو اور  
بعض کہتے ہیں کہ برادری کا اتفاق ہو تو کام چلے۔ اس کے بعد وہ کہتے

ہیں کہ لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں... مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح اور ترقی کرے۔ بیشک تمام قوم اس کو بُرا کہے گی اور نکو بنائے گی مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ اولاً وہ ہدف تیر ملامت ہوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائے گا۔“

بلاشبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ سرسید میں یہی چیز تھی جس نے ان کو اس منصبِ جلیل کے لائق بنایا تھا۔ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے حالتِ طعام اہل کتاب کے باب میں سرسید کی ایک تخریر دیکھ کر یہ لکھا تھا کہ ”کاش ہم سرسید صاحب کو اپنے قول کے موافق عمل کرتے ہوتے بھی دیکھیں“ سرسید نے فوراً اس کے جواب میں لکھا کہ:

”نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کتنا کچھ ہو اور کرنا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ جو کام سرسید کی ذات سے علائقہ رکھتے تھے اور جن کا کرنا نہ کرتا خود ان کے اختیار میں تھا ان میں رسم و رواج کی پابندی کو انھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور تیج نہوار میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسید



کے گھر میں کہیں ان کا نام و نشان نہ تھا، انھوں نے اس بیٹے کا نکاح جوڑانی کوڑے کا جج تھا دلی میں جا کر ایسا چپ چپاٹے کر دیا کہ چہند عزیزوں اور دوستوں کے سوا کسی کو خبر نہ تک نہیں ہوئی اور اس خوشی میں سبائے اس کے کہ تو رہ بندمی باد عورت وغیرہ میں نہ خطیر طرح کیا جاتا ایک مناسب رقم بدستہ العلوم کی نذر کر کے تقریب کو ختم کر دیا۔ پونے کی بسملہ میں علیگر ٹھہرے دلی جانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس تقریب میں وطن سے بلایا، جب کانفرنس کا جلسہ ختم ہو چکا اسی قومی مجمع میں بسملہ پڑھی گئی اور حاضرین کو معمولی شہر بنی تقسیم ہونے کے بعد پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیا گیا۔ سرسید کی کوشش سے جرنایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہوا وہ اس منازت اور نفرت کا دورہ ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مثل سمندر کے حائل ہو رہی تھی، حالانکہ دین اسلام اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، ان کا کھانا اور ذبیحہ کھانے اور ان کے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا تھا اور تمام ممالک اسلامیہ میں ان کے ساتھ یہی برتاؤ دیکھا اور سنا جاتا تھا باوجود اس کے ہندوستان کے مسلمان مثل ہندوؤں کے ان کی ہر ایک چیز سے اجتناب کرتے تھے، ان کے ہاں کی پختی ہوئی چیز کو نجس جانتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے کو عیسائی ہو جانے کے برابر خیال کرتے تھے جس کا سبب کچھ تو ہندوؤں کی تقلید تھی جن سے صد ہا برسوں اور عادات ہندوستان میں آ کر مسلمانوں نے سیکھی تھیں اور کچھ قومی تعصبات تھے جو ایک مدت تک مفتوح قوم کو نیچرل طور پر فاتح قوم کے ساتھ رہنے مزبور ہیں۔ مسلمانوں کو یہ نفرت اور کراہیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس بات میں جو کچھ شریعت کا حکم ہے اس کو علماء عوام ان اس کے سامنے

صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی عالم ایسی جرات کر بیٹھتا تھا تو اس کی بات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا اور اس کی طرف سے کھٹاک جاتا تھا ایک اور وجہ سے بھی علماء مسلمانوں کو انگریزوں کے میل جول سے مانع آنے تھے، ان کو خوف تھا کہ حاکم و محکوم قوم کا میل جول، خاص کر اس صورت میں کہ حکمراں قوم اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو، ضرور ہے کہ محکوم قوم کو حاکموں کے مذہب کی طرف مائل کرے۔

الغرض غدر سے پہلے مسلمان عموماً انگریزوں کی مخالفت سے اور ہر ایک بات میں ان کے ساتھ تشبہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی وجہ نفرت کی نہ تھی لیکن غدر کے بعد انگریز بھی مسلمانوں سے کھیننے لگے اور دونوں قوموں کا جمع کرنا مثل اجتماع نقیضین کے محال ہو گیا۔ مگر سرسید کو خوب یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی پریشکلی حالت کی اصلاح

۱۷ معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک شریف مسلمان مولوی نے درمیان دو آب کے کسی ضلع میں منصف یا صدر بن گئے ایک روز کسی یورپین حاکم کے بنگلہ پر اس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ یہ طبعاً مشہور ہو گئی، مولوی صاحب کی براہ روی نے ان کو ذات سے خارج کر دیا۔ انھوں نے ہر چند اہل بلاد ہی کے سامنے آئیں اور حدیثیں پڑھیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ مولوی کے مخالف اور کچھ موافق دہلی میں شاہ صاحب سے سن کر پوچھنے کو آئے۔ جب شاہ صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر پہنچے تو شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اندر سے نکلتے تھے ان لوگوں نے پہلے انھیں سے سن کر پوچھا۔ شاہ رفیع الدین جوابت صاف گواہ آنا، طبع آدمی تھے انھوں نے صاف صاف کہا کہ جنھوں نے مولوی کو ذات سے خارج کیا انھوں نے جھک مارا اس نے کوئی کام شریع کے خلاف نہیں کیا مگر کسی نے ان کا

کے لیے جس طرح ان میں مغربی تعلیم کا پھیلاؤ ضروری ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کے اور حکمران قوم کے سوشل تعلقات کو ترقی اور استحکام دینا ضروری ہے جب تک وہ ان قوموں میں دوستانہ معاشرت اور میل جول پیدا نہ ہوگا اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے اصلی خیالات سے آگاہی حاصل نہ ہوگی اس وقت تک آپس میں صفائی اور خلوص اور عقیدہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر مسلمانوں کی مخالفت کے انگریزوں کے طرف سے بھی بہت سی رکاوٹیں نظر آتی تھیں سب سے بڑا غدار انگریزوں کو یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جن کے ہاں عورتوں کے پردہ کا رواج ہے، کسی طرح ہمارا دوستانہ میل جول نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ سرسید اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمان جس طرح اپنی عورتوں کو غیر قوموں کے مردوں سے چھپاتے ہیں۔ اسی طرح اپنے مسلمان دوستوں اور وعدہ کے رشتہ داروں سے بھی چھپاتے ہیں مگر اس سے باہمی دوستی اور محبت میں کچھ فرق نہیں آتا، پھر کیا وجہ ہے کہ پردہ کی پابندی سے ہماری اور انگریزوں کی دوستی اور سوشل تعلقات میں فرق آئے

بقیہ  
کہنا نہیں مانا اور جب صاحب کے پاس پہنچے انہوں نے صورت حال سن کر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا حاصل یہ تھا کہ اس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کفر کے پہنچ گیا ہے جو لوگ مولوی کے مخالف تھے وہ یہ سن کر خوش ہو گئے مگر اس کے طرفداروں نے پوچھا کہ حضرت وہ اب کسی طرح مسلمان بھی ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا اس لیے وہ اسلام سے خارج نہیں ہو گا مگر افسوس اس کو پانچوں کلمے اور آمنت باللہ پڑھو اور قدم شریف کا پانی پلو اور پھر برادری میں شامل کر لو۔ اگر شاہ صاحب اس انداز پر تقریر نہ کرتے تو شاید ان کا کہنا بھی کوئی نہ مانتا

اور ان مولوی کو پلادری میں شامل نہ کیا جاتا ۱۲

مگر حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول بہرہ نافرمانی نہیں ہے جن میں سے ایک قوم میں عورتوں کا مردانہ سو اٹھی میں شریک ہونا اس کے لیے باعث عزت سمجھا جائے اور دوسری قوم میں باعث شرم۔ لیکن باوجود ایسے سخت موانع کے سرسید نے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سرسید کی کوشش نے انگریزوں میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں تک موانعت پیدا کی ہے! اور ان کی دیرینہ آرزو اس باب میں کس حد تک پوری ہوئی ہے! اور اگر سرسید کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں ایک موقع پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے سامنے صاف صاف کہا تھا کہ "ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سوشل فعاشرت اور ان کا سوشل بزنس جو عذر کے بعد تک انگریزوں کے ساتھ تھا اس میں جس قدر انقلاب گذشتہ تیس برس میں ہوا ہے اگر سرسید کا قدم در میان میں نہ ہوتا تو اس کے لیے ایک صدی بھی مشکل سے کافی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ طریق معاشرت میں انگریزوں کی تقلید کرنا کہاں تک ہماری حالت کے مناسب ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کی ایک مفید جماعت کو قومی تعصبات کی بیڑی اور ملکی رسم و رواج کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا ہے اور وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ جس بات کو اپنے من میں قرین مصلحت جانیں اس کو اختیار کریں اور جس بات کو مضر سمجھیں اس کو ترک کریں۔"

اگرچہ سرسید نے مسلمانوں کی باہمی معاشرت کی اصلاح کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں کی بلکہ ان کی سوشل حالت جو انگریزوں کے ساتھ تھی زیادہ تر اسی کی اصلاح پر توجہ کی ہے لیکن درحقیقت انہوں نے مذہبی خیالات کی

اصلاح اور مغربی تعلیم کی اشاعت سے قومی سوسائٹی کی عام اصلاح کا بیج بونیا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی سوشل خرابیاں تو بندوستان میں رہنے اور بندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوتی ہیں اور بہت سی غلط مذہبی خیالات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور بعض نے دیگر وجوہ و اسباب سے وجود پکڑا ہے اور ان تمام خرابیوں کی تعداد اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے ایک طویل طویل زمانہ اور بہت سے مصطلح درکار ہیں اس لیے بچانے اس کے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے انھوں نے جہاں تک کہ ممکن تھا مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحوں کی جڑ ہے کوشش کی۔ سب سے پہلے انھوں نے مذہبی خیالات و اوہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیونکہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھ لیتے ہیں ان کا چھوٹنا قریب ناممکن کے ہو جاتا ہے دوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح کا مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یورپین اقوام کو حسن معاشرت میں تمام دنیا پر فائق کر دیا ہے سو اس کی اشاعت میں جو کار نمایاں انھوں نے کیے وہ سب پر ظاہر ہیں۔

## تصنیف و تالیف

اگرچہ سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام اچانک کو پیش آتا تھا اس میں وہ ایسی دلچسپی ظاہر کرتے تھے کہ گریبا وہی ان کا خاص کام اور ضروری فرض تھا؛ کالج کی تعمیر، سبٹ کی تیاری، جلسوں کا اہتمام، مسلمانوں کی ملاقات چندے وصول کرنے کی تدبیریں، ہر ضلع ہر ایک کام کو وہ یکساں ذوق و شوق اور یکساں دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے تھے مگر خود ان کا یہ بیان تھا کہ جیسا

تصنیف و تالیف میں میراجی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا اور فی الواقع، جیسا کہ دیکھا گیا ہے، رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں، خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلہ سے اُن کا جی نہیں اکتا تھا۔ گرمی کی دوپہروں میں، جبکہ ایک صبح خیز آدمی ضرور آرام لینا چاہتا ہے، یہ شخص ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف پایا جاتا تھا۔ بیماری کی حالت میں اُن کو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پینگ پر جا کر کمر سیدھی کی ہو۔ بارہ ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ علات یا کسی اور وجہ سے رات کو نیند اچاٹ ہو گئی اور انہوں نے میز کرسی پر بیٹھ کر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کر دی۔ جہاں اور لوگ بیماری کی راتیں لوگوں کو جگا کر یا تھکے کہانیاں سن کر یا اٹنے والے کر کے لبرنتے ہیں، یہ شخص اس بانگاہ اور دماغ سوز فکر سے دل بہلاتا تھا۔

جس زمانہ میں سرسید نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی اُس زمانہ کا حال اُن کے قدیم دوست محمد سعید خاں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں اُن دنوں میں اکثر اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ سرسید نے اس زمانے میں رات کو پینگ پر سونا قطعاً ترک کر دیا تھا۔ چونکہ اُس وقت تک کرسی کی نشست کی عادت نہ تھی فرش ہی پر جاؤں طرف کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور کتابوں کے بیچ میں اُن کی نشست رہتی تھی۔ کبھی کبھی بات چیت کے لیے مجھے بھی پکڑ بٹھانے تھے، نہ خود سونے تھے اور نہ مجھے سونے دیتے تھے، باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تفسیر بھی لکھتے جاتے تھے اور اس غرض سے کہ نیند نہ آنے بار بار خود بھی چائے پیتے تھے اور مجھے بھی پلاتے تھے۔ جب نیند کا بہت ہی غلبہ ہوتا تھا وہیں کسی کتاب پر سر رکھ کر گھنٹا آدھ گھنٹے سو رہتے تھے اور پھر اٹھ کر کھینے لگتے تھے اسی طرح ساری رات گزر جاتی تھی۔



سر سید کے دماغ میں تصنیف و تالیف کے متعلق دو خاصیتیں عجیب و غریب تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں ان کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ ان کے دفتر کا ٹراکٹر، جہاں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے، صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مسنابین جو اکثر جمہوریہ کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علماء اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی، ان کے لیے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجمع کرنے کے لیے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیا ہو۔ یا ان کے پاس بیٹھنے سے تنگدل ہوتے ہوں یا لوگوں کے اٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کر دیا ہو۔ بے شک جب کوئی مہمان باہر سے آتا تھا، یا کسی دوست سے مدت کے بعد ملاقات ہوتی تھی یا کسی اور خاص وجہ سے ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا بند کر دیتے تھے، مگر ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ حاضرین کے ہجوم کے سبب ان کے خیالات پر آگندہ ہو گئے ہوں اور اس لیے انہوں نے مضمون لکھنے سے ہاتھ پھینچ لیا ہو۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی چیل کی باتیں کر رہے ہیں جن سے خواہی خواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے، مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی ادھیڑ میں مستغرق ہے، کبھی لکھتا ہے اور کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق غیر نہیں ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ اوروں کے

کے مجمع عام میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کرنا غیر ممکن ہے بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ مذہب کو انیسویں صدی کے سائنس پر منطبق کرنا یا کسی مذہبی مسئلہ کی نسبت جمہور کے برخلات رائے قائم کرنا ایسی غیر مطمئن حالت میں سید احمد خاں کے سوا دوسرے شخص کا کام نہ تھا۔

دوسری خاصیت شاید اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز تھی۔ جب مصنف کسی ایسے مضمون پر تلم اٹھاتا ہے جس کو اُس سے پہلے کسی نے نہ لکھا ہو اور جو ترتیب کے لباس سے اب تک عاری ہو جیسا کہ عموماً سرسید کی مذہبی تخریریں ہوتی ہیں، تو اُس کے ذہن میں خیالات کا ایک بے ترتیب اور غیر منتظم انبار ہوتا ہے جس کا مرتب اور منتظم کرنا اور ہر ایک پوائنٹ کو اس کے مناسب موقع پر رکھنا اُس مصنف کا فرض سمجھا جاتا ہے مگر یہ ایک ایسا دشوار کام ہے کہ مصنف کو اکثر اوقات کئی کئی دفعہ ترتیب بدلنی اور بار بار کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے۔ سرسید جب کسی مضمون کو خود لکھنا یا کسی پیشہ ست سے لکھوانا شروع کرتے تھے۔ اگرچہ کیسا ہی شکل اور طولانی مضمون ہو، یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے تمام پوائنٹس سلسلہ وار اپنے اپنے محل اور موقع پر اُن کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، صرف اُن کو الفاظ کا لباس پہنانا باقی ہے چنانچہ مستثنیٰ حالتوں کے سوا کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس ترتیب سے ہنحوں نے کوئی مضمون لکھنا شروع کیا ہو اُس کو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اسی پال سے آخر تک نہ پہنچا دیا ہو۔ اس مطالب کے زیادہ دلنشین ہونے کے لیے ناظرین مندرجہ ذیل مثال پر غور کریں۔

سرسید نے معراج کے مسئلہ کا بیان اپنی تفسیر کی چھٹی جلد میں ۱۲۱ صفحہ

پر لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر نہایت حال کی ضرورت کے موافق نہ پہلے کسی نے ایسا لکھا ہے اور نہ آئندہ اُس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کے لکھنے کی جو کیفیت ہم کو معلوم ہوئی اس کو سن کر اور پھر اس مضمون کی وسعت کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔ مولوی سید وحید الدین سلیم جنہوں نے تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک بلا برسر سید کو مدد دی ہے اُن کا بیان ہے کہ ”جب تفسیر کی توبت سورۃ بنی اسرائیل تک پہنچی اور سید صاحب نے معراج کے مسئلہ پر مفصل بحث کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے کہا کہ ”جس قدر روایتیں صحاح اور دیگر کتب حدیث میں معراج اور شق صدر کے متعلق اور اس باب میں صحابہ کے اختلاف کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور عقل و نقل کی تناقض کی صورت میں جو رائیں اور اقوال علما کے ہیں اُن سب کو آپ اس طرح پر کتابوں میں سے انتخاب کر کے نقل کر لیں کہ ایک ایک صفحہ پر اُن کو لکھتے جائیں اور دوسرا صفحہ کو چھوڑتے جائیں“ میں نے کتابیں دیکھیں شروع کہیں اور بے شمار روایات و اقوال علما جو کہ سورۃ بنی اسرائیل کی تفسیر میں درج ہیں، موافق ہدایت کے نقل کر کے سید صاحب کے سامنے پیش کیں، میں سمجھتا تھا کہ جب میں تمام روایتیں اور اقوال نقل کر لوں گا اُس وقت سید صاحب اُن کو دیکھ کر معراج کے مسئلہ پر لکھنا شروع کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ انہوں نے اس مضمون کو اُس ترتیب پر جو اُن کے ذہن میں تھا سبیلے خود اُسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جب کہ مجھ کو روایات وغیرہ کے نقل کرنے پر اسور کیا تھا۔ وہ مسودہ کے ہر ایک صفحہ پر کہیں کہیں کچھ عبارت لکھتے تھے اور کہیں سفید ہی چھوڑتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ میں ابھی اپنا کام پورا کرنے نہ پایا تھا کہ جو کچھ اُن کو لکھنا

تھا وہ سب مکہ چکے اور اس مضمون کو کچھ کم ڈیڑھ سو صفحوں پر ختم کر دیا۔ جب  
 میں اُن بے شمار روایتوں اور اقوال کا دفتر لے کر پہنچا تو انھوں نے وہ تمام  
 کاغذات لے کر اُن کو قنبلی سے کترنا اور اُن ٹکڑوں کو جا بجا سفیدیوں پر  
 لٹی سے چپکانا شروع کیا یہ نہ تک کہ تمام پرچے جن کا شمار بتانا مشکل ہے  
 جہاں جہاں اُن کا موقع تھا چپکا دیے اور کاتب کو صاف کرنے کے لیے دیدیا۔  
 جب تمام مسودہ صاف ہو چکا اور میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا تو  
 مضمون کی ترتیب اور انتظام اور تمام روایات و اقوال علما کو اپنے اپنے موقع  
 پر چسپاں رکھ کر میرے ہوش جاتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرسید کو مسودہ لکھتے  
 وقت ان روایات کے مضمون سے اس کے سوا کچھ علم نہ تھا کہ جب میں کتابوں  
 میں روایتیں تلاش کر رہا تھا اُس وقت جس قسم کے اختلافات ان میں پائے  
 جاتے تھے اُن کا ذکر بالا حمال سرسید کے سامنے ہوتا رہتا تھا صرف اس قدر  
 واقفیت پر انھوں نے تمام مضمون کا خاکا اپنے ذہن میں کھینچ لیا تھا اور ہر  
 ایک روایت کا موقع اور محل جہاں جہاں کہ ہونا چاہیے تھا قرار دے لیا تھا۔  
 اگرچہ یہ دونوں خاصیتیں جو ہم نے سرسید کی مصنفانہ قابلیت کے  
 متعلق بیان کیں، فی نفسہ عجیب ہیں مگر اُن سے سوا اس شخص کے جو اُن کی  
 طرز تصنیف کو بہ نظر غور دیکھنا رہا ہو دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ اب  
 ہم ایک تیسری خاصیت کا ذکر کرتے ہیں جس کو ہر سمجھدار آدمی جو اُن کی  
 تصنیفات کو دیکھے گا یقیناً تسلیم کریگا اور اس سے ہماری سرادقوت استدلال  
 بے ظاہر ہے کہ سرسید کی بعض پولیٹیکل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جن میں  
 انھوں نے ایک جماعت کثیر یا جمہور اہل اسلام سے اختلاف کیا ہے یا جو  
 اُس کے اُن کو اپنے دعوے کے اثبات میں خلاف توقع اکثر ایسی کاریاں ہونی

ہے جیسی کہ ایک مسلم البتہ رائے کی تائید کرنے والے کو ہرنی چاہیے۔  
 اسباب بغاوت میں جو کچھ انھوں نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید  
 تمام انجلس نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لیے اس کا مارشل لا کے دور  
 دورہ میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑکتے سے  
 کہ اس کا بہت بڑا حصہ منوایا گیا اور جو کام کہ اس نے اعیان سلطنت کے  
 غیظ و غضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اس پر مترتب ہوئے  
 اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلل اور سوجھ بکھا گیا تھا اور اس میں  
 کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر سنہٹر کی کتاب کا ریویو ایک  
 ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبران سلطنت کے  
 دل میں جما ہوا تھا اور جس کو ڈاکٹر سنہٹر کی کتاب نے اور بھی زیادہ پختہ کر دیا تھا۔  
 لیکن اس ریویو کے شائع ہونے سے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے، اس خیال  
 کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہو گئی۔

جس وقت کہ سرسید نے غلامی کے مسئلہ پر جمہور اہل اسلام کے برخلاف  
 رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی سید مہدی علیخان نے ان سے کہا کہ تم اس  
 باب میں ایک حرف بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسا نہیں لکھ سکتے  
 جو اصول اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب انھوں نے سرسید کا ابطال  
 غلامی کا مضمون تہذیب الاخلاق میں اول سے آخر تک پڑھا تو ان کو ماننا پڑا  
 کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لیے غلامی کا استیصال کر دیا ہے یہاں  
 تک کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک موقع پر صاف صاف لکھ دیا  
 ہے کہ جن مسائل میں ہم اور سید مہدی علی متفق ہیں انھیں میں سے ایک یہ  
 ہے کہ "اسلام میں رققت نہیں ہے۔"

مسلمانوں کا جہاد کا مسئلہ جو تمام عیسائی دنیا میں انگشت نامتناہی اور جس سے بڑھ کر کوئی بے رحمی اور ناخدا تر سہی کا کام نہ سمجھا جاتا تھا، اس کا مقابلہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، سرسید نے انجیل کے اس مشہور اخلاقی حکم سے کیا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے" اور نہایت عام فہم طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ فطرت انسانی کے سوائے اور قابل عملہ رآمد جہاد کا حکم ہے جو قرآن میں آیا ہے نہ انجیل کا وہ اخلاقی حکم جو قرآن کی تعلیم پر اعتراض کرتے وقت مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جس پر نہ آج تک کبھی عمل ہوا ہے نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔ اس طرح سرسید کی تصنیفات میں بیشمار مقامات ایسے نکلیں گے جو راہی النظر میں ممنوع الثبوت معلوم ہوتے ہیں مگر جب ان دلائل پر نظر کی جاتی ہے جو سرسید نے ان کے ثبوت میں پیش کی ہیں تو مخالفوں کو بھی بشرطیکہ تعصب سے خالی ہوں، تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک مصنفوں میں سرسید کا جو درجہ خاص کر مذاہب تصنیف و تالیف کے لحاظ سے قرار پاسکتا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا، کیونکہ اس وقت کچھ لوگ ان کے حد سے زیادہ معتقد ہیں جن کو ان کی تصنیفات میں کوئی لغزش یا خطا نہیں معلوم ہوتی اور بہت بڑا گروہ ان کے منکروں اور مخالفوں کا ہے جن کو ان کی مذہبی تحریروں میں کفر والحاد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پس جب تک یہ دونوں گروہ موجود ہیں ان کی تصانیف کے باب میں بغیر حیف و میل کے رائے دینے کی کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔

اس کے سوا اول تو مسلمانوں کے خیالات میں عموماً یہ بات بھی ہوئی ہے



کہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی تصنیفات کے لیے ضرور ہے کہ وہ عربی یا کم سے کم فارسی زبان میں ہوں۔ اردو زبان میں کیسے ہی متفقانہ مضامین لکھے جائیں اور کیسے ہی بلند خیالات ظاہر کیے جائیں ان کے نزدیک وہ اردو کی معمولی کتابوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ دوسرے جن لوگوں نے تقلید کے دائرے سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے ان کی تصنیفات ہمیشہ علمائے دین کے حلقوں میں ایک مدت تک سرد و مطرود رہی ہیں۔ لیکن چونکہ حق کبھی نہ کبھی ظاہر ہونے لگتا ہے اس لیے آخر کار لوگ ان کے حق و قبح کی چھان بین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انھوں نے صواب کو خطا سے اور گھرے کو کھوٹے سے الگ کیا ہے اور باوجود ان کی غلطیاں ظاہر ہونے کے جن سے کس معنی کا کلام محفوظ نہیں رہ سکتا جس درجہ کے وہ مستحق تھے وہ درجہ ان کو دیا گیا ہے۔

## طرزِ تحریر

سرسید کی طرزِ تحریر پر کچھ رہنما کرنا جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے کیونکہ بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کلی و جزئی حیثیات پر بحث نہ کر سکے تو کم از کم اس کی نمایاں اور مستم یا قوتوں کو دکھانے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ پس سرسید کی طرزِ تحریر میں نے تیس تیس برس کے عرصہ میں اردو لٹریچر کا رخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پوسٹیکل سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اس کے بیان سے کیونکہ خاموش رہا جا سکتا ہے اور مشکل اس لیے ہے کہ جس تحریر میں یہ تاثیر اور یہ کوشمہ تھا اس کو ہم ان متعارف خوبوں سے جو شرفی لٹریچر میں کلام کی

عقدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں، بظاہر معیار پاتے ہیں۔ پس اس بات کا دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو تحریر تشبیہات و استعارات سے، صنائعِ نغلی و معنوی سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور فاضلانہ و نیشانہ تراش خراش سے خالی نظر آتی ہے اُس میں وہ کیا چیز تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں ایسے غیر مترقبہ نتائج پیدا کر دیے۔ لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرافی لکھنے کا مشکل کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے اس لیے چار و ناچار ہم کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔

سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً سیدالانخبار میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں جس کو اُن کے بڑے بھائی سید محمود خاں نے ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں اُس وقت جاری کیا تھا جبکہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ اگرچہ اُس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک انھوں نے متعدد کتابیں اور رسالے مذہب اور تاریخ کے متعلق لکھے اور اُن میں سے بعض کتابیں (جیسے آثار الضادید) بدستِ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرزِ سخن میں اُس وقت تک کوئی ایسی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسید کو اردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصہ کا مستحق کہا جاسکے۔

البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے، وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی، جبکہ تصنیف اور تکلف انشا پر داری کا زیور سمجھا جاتا تھا، میلیر پائی جاتی ہے اور آثار الضادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبانی کا لکھا ہوا ہے۔

لے چونکہ سید احمد کا عرف اُس زمانہ میں سید تھا اور اُن کے بھائی کو اُن سے بہت محبت تھی اس لیے اخبار کا نام

اُن کے عہد کے لحاظ سے سیدالانخبار رکھا تھا۔ ۱۲۰-

معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سرسید کی طرز تحریر سیدھی سادی تھی مگر سو اسٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جائزہ کاہ کوشش سے انجام کو پہنچانی ہے، ان کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اس وقت خود ان کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی، تخریر کریں، مگر اس ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے پنچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا جس کا فریچ میں ترجمہ ہو کر فرانس میں چھپا۔

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ "اذا لا دالله شيا هيا استهابة" چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے ان کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کر دی تھیں جو ایک رفیقار میں ہونی ضرور ہیں۔ انہیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتداء سے تخریب یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گریس کی پابندی سے نظر آنا نہ دتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے جو اول اول دلی ہیں اپنے گرد شعرا کا جگھٹا دیکھ کر ان کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن نہ گزرے کہ وہ ان کلماتِ لالین سے جو شاعری کے لیے لازم ہیں اور خفاتی نگاری میں محل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ انہوں نے میرت فریدیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ ان کے نانا نے جب کہ وہ بوستان پڑھتے تھے، ان کا سبق سنا۔ سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے "طبع راسد حرف ست ہر سہ تہی" انہوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ "طبع کے تین حروف تینوں خالی" نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر

یہ وہی معنی کہے گئے۔ چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ یہی نصیح تھا اس لیے گریمر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال ان کا اس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تخریب یا تقریب کی رو میں گریمر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیودوں سے جو شاعروں اور نثیریوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے، وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے ان کی زبان دلی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ اختیار تسلیم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی، غالباً انہوں نے کسی لفظ کے استعمال کرنے وقت یہ خیال نہ کیا ہو گا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہو گا کہ قواعد کی رو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک نئے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس لیے قدر آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر مہسایوں کو بے تکیا نہ آگ بچھانے کے لیے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسانوں کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی تنگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تفسیح کو کبھی دخل نہیں دیا جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے۔

اپنے اسی سیدھے سادے اور نچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں کیا کرتا ہیں کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں، یا یہ دیکھتے رہے۔ اس میں بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک اندازہ پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ ان کی قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ صنف کو سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی، کیونکہ نچرل قوی سے جب ان کے مقصد کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو ان سے اکثر فوق العادہ کرشمے ظہور میں آتے ہیں مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غایا اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لیے کوئی الفاظ میں تلاش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی، کوئی کلام کی بنیاد و متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و طرائف پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہل زبان کے محاورے اور روز ترے بہم پہنچاتا ہے، اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہم را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

یے شک کلام کے موثر ہونے کے لیے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا

ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ موثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو، جب تک کہ مشکل کلام کا

دل آزادی اور سچائی سے بھرنا ہوا ہے، کبھی موثر نہیں ہو سکتا جس طرح تلوار کا کاٹھ درحقیقت اُس کی باڑ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے اسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ مشکل کی سچائی اور اُس کے بڑے دل اور بے لاگ زبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر و سناں کا کام کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر اُن میں کچھ بھی اثر باقی رہے سچے ناصح کے لعن و طعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ چھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت اُن کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

ماوجودیکہ مسلمان صد ہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون میں، لٹریچر میں رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طریق معاشرت میں، غرضیکہ ہر چیز میں اگلوں کی کبیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں، ہرگز سننی نہیں چاہتے تھے مگر بسج میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کر کے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے گو کہ وہ قوم کے مذاق اور الف و عادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں، اُن میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُن کے سننے کے لیے کیا سوافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ہیں، پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون و چرا قبول کرتا ہے اور دوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہو جائیں۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے اُن سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جا دو کا سا اثر پیدا کر دیا



تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسید کی تشریح جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرت متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصود ہوتی ہے تو اس کے بیان میں محاسن لفظی کی اسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضائیتا ہے اور اس لیے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظر مغور نہ دیکھا جائے۔ عام بیان ان سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تشریح میں لفظی خوبیاں ایسی آجا کر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تشبیہیں ریختہ اور تلمیحات شہادت لطیف ہیں، بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلغریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار پر محل جا بجا نظر آتے ہیں مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اس میں ایسا عیب یا خرابی نہیں پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔ مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الاتیانہ ہے۔ وہ قدرت بیان ہے جس کے ثبوت کے لیے خود ان کی مختلف تشریحوں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنف کی قدرت بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اسی پیرائے میں بیان کر سکے جو اس مضمون کی حالت کے

مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرائے بیان جدا ہوتا ہے جس ڈھنگ پر نودل لکھا جاتا ہے اس ڈھنگ پر تاریخ یا بائیوگرافی نہیں لکھی جاتی، جہاں نشت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلے یا کسی پبلک جلسہ کی روئداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدمتا نہیں ہوتی۔ اسی لیے کہا گیا ہے ”ہر سخن وقتے دہر نکلتے مکانے دار“ مگر جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہر مصنف پر اس کی طبیعت کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرائے بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کو اسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے، پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اٹھاتے جن میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون کہتے ہیں اس کو اسی سانچے میں ڈھانا چاہتے ہیں۔ کسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ بیدھے رتے سے بھی چکر کاٹے بغیر نہیں گذرتے، یعنی ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں اگرچہ نفس مضمون اس سے ابا کرتا ہو۔ عرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھیے اس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ پاتے ہیں، ان کی ہر قسم کی بیشمار تحریروں کی تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولیٹیکل، کیا اوفنسل اور کیا بیگل علی گڑھ گزٹ، تمذیب الاخلاق، تعانیف احمیہ سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں، جلسوں کی روئدادوں اور پرائیوٹ خطوں وغیرہ

میں موجود ہیں اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایہ بیان پایا جاتا ہے جو اس کے لیے موزوں اور مناسب ہے حالانکہ مصنف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لیے کونسا پیرایہ بیان موزوں ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد اور ارادہ کے قلم کو اسی راہ پر ڈالتی ہے جس پر اس کو چلنا چاہیے جس طرح مہاٹھ کی روستے کے موڑ توڑ اور پیچ و خم کے ساتھ رخ بدلتی چلی جاتی ہے اسی طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دیریا کے مہاڈ کیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سا زور ہے اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو سببے دلیل و عودوں کے مقابلہ میں ظرافت و خوش طبعی نصیحتیں زستہ سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں۔ غصہ مہربانی سے زیادہ پر لطف ہے اور نغمہ آفرین سے زیادہ خوش آئند وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک سولسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشوق جج کے ہاتھ میں اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی رویدادوں میں ایک تجربہ کار سیکرٹری کے ہاتھ میں۔ یہاں ہم ایک نہایت معمولی مثال کے ذریعہ سے ناظرین کو اس بات کا خیال دلانا چاہتے ہیں کہ اس شخص کے قلم میں ہر ایک مطلب کو اس کے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی کس قدر قابلیت تھی۔

سر سید نے تہذیب الاخلاق کے ایک آرٹیکل میں آدم کی سرگذشت ایک قصہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے، وہاں اس موقع پر جبکہ آدم نے محض تنہائی اور سائے کے عالم میں حوا کو اچانک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے پایا اور اس سے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کے شکر کے چند الفاظ فرضی طور پر آدم کی زبان سے



کے سوا کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جس کی تفسیر اسی اصول کے موافق پوری نہ  
 اتر گئی ہو۔ اگرچہ اس کی مثال قرآن کی تفسیر میں جا سجا موجود ہیں مگر ایک نہایت  
 بدیہی مثال آدم کے قصہ کا بیان ہے۔ اس قصہ کی نسبت جو کہ قرآن مجید میں  
 مذکور ہے اگرچہ علمائے سلف میں سے بھی بعض محققین نے یہی لکھا ہے کہ یہ  
 کسی واقعہ کی خیر نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا بیان بطور تمثیل کے کیا گیا ہے مگر  
 علمائے سلف اس رمز کی طرف ایک مجمل اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں کسی  
 نے قصہ کی تمام جزئیات کو تمثیل کے قالب میں ڈھال کر نہیں دکھایا۔ سرستید نے  
 اول تہذیب الاخلاق میں اسی مضمون کو ایک فرضی قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور  
 پھر تفسیر میں بحیثیت ایک مفسر کے تمام قصہ کے جزئیات کو انسان کی فطرت  
 اور اس کے قوی پر ایسی خوبی سے منطبق کیا ہے کہ ان سے پہلے کسی یہ کام بن نہیں  
 آیا۔ پس صرف اسی مضمون کو تہذیب الاخلاق یا تفسیر میں دیکھنے سے بخوبی اندازہ  
 ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو بذریعہ تحریر کے مشکل مشکل عقودوں کے سلجھانے پر  
 کس قدر قدرت تھی۔

تیسرے واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو  
 پریشیاں بسبب الف و عادت کے دلوں میں کھب گئی ہوں ان کی برائی اور جو خوبیاں  
 سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں ان کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔  
 یہ کمال بھی جو سرسید کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا اور  
 اس کی مثالیں خاص کر تہذیب الاخلاق کی قدیم اور جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔

## مثال ۱

مثلاً وہ ایک آرٹیکل میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا طریق اس طرح بیان کرتے

ہیں کہ: ”ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں اور مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابلوں اور رکابوں اور غوریوں اور تشرلیوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوائچے اور بورانی کے پیالے اور چار مٹرنے کی پیالیاں تیل کے پوجالے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اس ایک دسترخوان پر کوئی فیرنی کلمہ شہادت کی انگلی سے اور کوئی دست بخیر، چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے، کوئی پلاؤ میں اردی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے، کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے تھکڑا ہوا پنجہ مبارک پوچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ سے دگا کر سٹر پامچر اور یہ کہ کر کہ والٹھ ٹہری تیز ہے اور وہ کرنا شروع کیا ہے تمام جھوٹے بزین اور نیم خوردہ کھانا اور چھوڑی موٹی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں نکلی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں اس موقع میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور سین سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے، اور اورینے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ ان ہاتھ منہ دھونے والوں کو نیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کرب آواز سننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لہاب بکھلنے اور بلغم کے ٹوٹھڑے تھو تھو کر کے چلھی باتاش میں تھوک دینے اور بتاشے کی طرح اس کے پانی پر تیرنے پھرنے کی پروا ہے۔

نعوذ باللہ منہا!!



## مثال ۲

یامثلہ ایک آرشیکل میں بے تمہذیب آدمیوں کی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ ”جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو تیوری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا چڑا کھلتا ہے اور دانت دکھانی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باپھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ وارٹھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چپٹ جاتے ہیں، اس کا ہاتھ اٹس کے گلے میں اور اس کی تاگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹواٹس کے جبرے میں اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور نہاد دم و باکر بھاگ نکلا۔“

”نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔“

پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں، یوں ہے، وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو، دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہو جاتی

لہ یہ معنون اصل میں انگریزی سے یا گیا ہے مگر سرسید کا اس میں بہت کچھ تصرف ہے جس کے سبب

سے وہ نسبت اصل کے بہت زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے ۱۲۔

ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوڑے اڑنے لگتا ہے،  
 یا چھوں تک بھرتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ  
 ہلک بھول اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عینت عینت آوازیں  
 بھکنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی  
 وارھی اس کی مٹھی میں تپا ڈکی ہونے لگتی ہے، کس نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو  
 غراتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور دوسرا اُدھر آگے کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا  
 تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

”جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔  
 کہیں عرقش ہو کر رہ جاتی ہے کہیں تو تکرار تک نوبت آ جاتی ہے، کہیں آنکھیں  
 بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے،  
 مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم  
 ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بچھاؤ نکلا کر کرنے سے پرہیز کرے۔“

## مشال ۳

یا مثلاً ایک آرٹیکل میں جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں  
 کوشش کرنا ان کی دنیا اور دین دونوں کی خیر خواہی کا کام ہے، ایک موقع پر  
 لکھتے ہیں ”اب دوسری طرح پر غور کرو اور ایک خیالی دنیا بناؤ اور یہ تصور  
 کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب  
 نہ رہے، سب مفلس اور نان شبینہ کو محتاج ہوں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ  
 ان بد عقلیوں اور بد فہمیوں اور بد نصیبیوں کے سبب جو زمانہ حال میں ان کے  
 خطوط پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں، عنقریب ہونے والا ہے) اور وہ ہلکے

بھیک مانگتے پھرے ان کی اولاد جاہل اور نالائق چور اور بد معاش ہو، واعظین کو جو محض رباکاری اور سکاری سے دنیا کاتے پڑے پھرتے ہیں، کوئی نکا دینے والا یا لقمہ ترکھلاتے والا نہ رہے، جناب حضرت پیر حبی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کر اپنا شکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ ان پر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اُس کی تحصیل میں مصروف ہیں، ان کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدر اوتھس بازرغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں، ان کو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے اچھے مولوی ٹکے ٹکے کر مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پرچھتا، تو اس وقت دین کا کیا حال ہو گا۔

”مگر اس کے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہیے کہ پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے اس کو بھرنے چاہیے، تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو پیٹ بھرنے کی کچھ تو فکر کرنی چاہیے ہوگی۔ موٹس کا خیال بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھتیری ڈھورے ہیں، کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہوں گے، کسی کا گھوڑا مل رہے ہوں گے اور جو ایسے کچے دیندار نہیں ہیں ان کی نسبت کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کریں گے؛ معلوم نہیں کہ ان سے جیلینا نے اور جزائر نو آباد بھریں گے یا تیم خانے اور کلیسا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی؛ اور اُس وقت ہم سلام کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ و کعبہ؛ ہم جو مسلمانوں میں ذمی ترقی و تہذیب و تربیت و شائستگی میں کوشش کرتے تھے وہ سب اس معاش میں منہمک ہونا اور اس کی ترغیب دینا اور

اسرارِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا تھا! یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سراسر معاد کا تھا۔“

”خدا تبارک نے مذہبِ اسلام کو عین حکمت بنایا ہے، اس کی بھلائی چاہنے والے کو ضرور ہے کہ وہ بھی حکیم ہو، نہ سکار اور دغا باز۔ اور حکیم کا یہ کام ہے کہ جو مرض دیکھتا ہے اس کی دوا کرتا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اسور سحاش و تمدن و معاشرت اور علم کی اتبری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے جاتے ہیں اور واعظ و مولوی اور پیر جی خدا و رسول کے دشمن اُن کو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں، بس ایسی حالت میں کہ ہم سنجو بی یقین کرتے ہیں کہ مسلمان یقینی اپنے مذہب پر پختہ ہیں، خدا کو ایک جانتے ہیں، رسول کو برحق سمجھتے ہیں، نماز روزہ حج و کزۃ فرض جانتے ہیں، اونے اونے آدمی ضروری نماز روزے کے مسئلے جانتا ہے یا ہر طرح پر اس کے جانتے کا سامان یا موقع موجود ہے۔ آیا مذہبِ اسلام کے دوستدار کا یہ کام ہے کہ اپنے تئیں پیر جی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے اور دعا بازی سے دُنیا کانے کے لیے انھیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے، بیٹھا بوا و عظ کہا کرے؟ یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اس کی تدبیر و کوشش کرے؟

”اقسوس خدا ہاتھ نہیں آتا، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں، ورنہ ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لیجا تا اور کہتا او خدا! اور لے

ٹیکو و گڑھ میں کسی نے شائع کیا تھا جس میں یہ لکھا تھا کہ جو تو ہیں اس سحاش میں منہک۔ ہو گئی ہیں وہ دین کے  
! لکل فائل و دست یز و درجہ گئی ہیں، یہ صلابت نے یہ آڑ لیکل اُن کے جواب میں لکھا تھا ۱۲

جناب رسول خدا اتم مجھ میں اور ان میں محاکمہ کرو اور بتاؤ کہ کون تمہارا دوست ہے اور کون تمہارا دشمن ہے؟ اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر خدا چاہے اور قیامت آئے گی تو یہ معرکہ ہونا ہے۔ لیکن با اینہمہ اگر کوئی مباہلہ پر آمادہ ہو تو میں مباہلہ کو موجود ہوں۔

## مثال ۲

یامثلہ شرعی جیسے جو نقتہ کے قنادوں میں گناہ سے بچانے یا گناہ پر دلیر کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں ان کی مذمت پر سرسید نے ایک آٹھ لکھ نظریات سوال و جواب کے پیرائے میں تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے جس کا عنوان ہے "انشاء اللہ" ہم اس آٹھ لکھ کو بحسنہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں :-

دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹانے پر نے ہیں۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے۔

کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے؟

ہاں جو پریسزیرگار مولوی، عالم، شریع پر چلتے وائے ہیں، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔

حضرت میں تو نہیں سمجھتا۔

نقتہ پڑھی ہو، اصول نقتہ کو جانا ہو، عالموں

کافر کافرا

کیوں حضرت کافر کیوں؟

تم نے کیا کہا؟

میں نے کہا "انا موئن انشاء اللہ"

کافر کافر! یوں کہو "انا موئن حقاً" اس

جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے، ایسے

موقع پر یوں پونا کفر ہے۔

پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں :-

قسم سے پختے وعدہ پورا نہ کرنے بے گناہ

یہ گویا ایک مولوی یا نقیب ایک جاہل آدمی سے خطاب ہے اور اس نے جو یہ لفظ کہا ہے کہ انا موئن انشاء اللہ

اس پر اس کو کافر بتانا ہے (۱۰)

الٹ پھیر سے اٹل جاتا ہے !  
 جاہل ! اور کیا ! ہماری جیب میں ایک  
 گھڑی ہے ہمارے دوست کو اس  
 کی ضرورت ہے جب اس نے ہم سے  
 مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں کوئی  
 گھڑی ہی نہیں۔ اس نے کہا قسم تو کھاؤ  
 ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں  
 کوئی گھڑی نہیں۔ ہمارے گھر میں  
 ایک اشرفی رکھی ہے ہمارے دوست  
 نے ہم سے اشرفی مانگی ہم نے کہا  
 کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں  
 اس نے کہا قسم تو کھاؤ ہم نے کہا خدا  
 کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں  
 کیوں ! سچ بات ہوئی کہ نہیں ! بات  
 ہی بات میں گناہ اٹل گیا کہ نہیں ! یہ  
 تو باتیں ہی باتیں ہوئیں، روپے  
 پیسے، سود بٹے کے معاملہ میں بھی لفظوں  
 ہی کے الٹ پھیر سے گناہ اٹل جاتا  
 ہے۔ تولہ بھر سونا سولہ روپیہ کی قیمت  
 کا ہم سے قرض لے سود سے بچنے کو  
 کہہ لو کہ ہیں تولہ چاندی میں آگے،

کی صحبت اٹھائی ہو تو جانو جاہل کس قدر  
 ناتراش نہ پڑھے نہ لکھے جائز تو کیا جانو ؟  
 حضرت آپ ہی سمجھا دیجیے۔

ارے میاں ! ان کے معنی تو اگر شاذ کے  
 معنی چاہا، اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی  
 مگر وہ فاعل واقع ہوا ہے جس کے معنی  
 نے کے ہوتے ہیں اب سب کو ملاؤ تو  
 یہ معنی ہونے "اگر چاہا اللہ نے" اب  
 دو مسئلے فقہ کے اٹل سمجھ لو، اگر کوئی امر  
 کسی پر مشروط ہو اور بسبب نہ پورے  
 ہونے شرط کے اوانہ کیا جاوے تو  
 کچھ گناہ لازم نہیں آتا "اذا فاق الشرط  
 فاق المشروط" ایک مسئلہ ہوا دوسرا  
 مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعال عباد کا  
 خدا ہے، پس جب ان دونوں مسئلوں  
 کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو  
 پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ  
 نہیں رہتا۔

حضرت ! میں مسئلے تو نجوی سمجھ گیا۔ مگر  
 اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ  
 کیونکر نہیں رہتا ! کیا وہ لفظوں کے



اب سمجھے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے  
گناہ پلٹ گیا کہ نہیں کہ! اجی ابھی  
ہمارے پاس زکوٰۃ کاروبار سے لاوے  
اور ہم مستطیع ہوں، ابھی گھر میں جا کر  
بیوی سے کہہ آویں کہ ہم نے اپنا کل  
مال تم کو ہبہ کیا، اب مفلس ہو گئے  
کہ نہیں! باہر آویں اور زکوٰۃ کاروبار  
نے لیں، باتیں ہی تو ہیں، ان بارے میں  
کے سمجھنے کے لیے علم درکار ہے۔  
پھلا حضرت یہ تو ہوا، انشاء اللہ والی  
بات رہ گئی اس کو بھی کسی مثال سے  
بجھا دو۔

ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا  
دل خوش کرنے کو تم سے کہہ دیا کہ ہم  
کل تمہارے ہاں آہیجے انشاء اللہ،  
ہمارا ارادہ آنے والے کا کچھ نہ تھا  
یوں ہی کہہ دیا تھا، جب نہ گئے تو معلوم  
ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا، اسی وعدے  
کو مشروط کیا تھا، اوقات الشرط  
نات الشرط۔ بات کی بات میں  
گناہ پلٹ گیا، کبھی تم عدالت میں

سولہ تولہ چاندی میں وہی تولہ بھروسہ آ گیا  
اور چار تولہ چاندی سوو میں بچ رہی اور  
سوونہ ہوا۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا  
تانبے کا میل ہو، قرض دو اور اسی  
وزن کے برابر کھرا سونا لے لو، مال  
تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سوونہ ہوا۔  
مکان گروی رکھو۔ راہن سے کہلو لو کہ  
سکونت میں نے بجل کی کرایہ کا فائدہ  
ہوا اور سوونہ ہوا، گانو گروی تو مثلاً  
ہزار روپے کو جس میں دو سو روپیہ  
کا فائدہ ہو، راہن سے اسی روپیہ سال  
دینے کے اقرار پر پٹا کھوا لو اور گانو  
پر قبضہ کر لو، کل منافع تحصیل کرو، ایک  
سو میں روپیہ سال سوو کے، چٹے کے  
نام سے بچے کہ نہیں! اور سوونہ ہوا۔

حضرت! کیا یہ ہوتا ہے!  
خدا کی قسم سب کرتے ہیں، جتنے مقدس  
خدا پرست، وہابی، نیم وہابی، مقلد،  
حنفی، زیندار، تعلقہ دار ہیں سب کہتے  
ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے  
دیے ہیں۔

گواسی دینے بھی گئے ہو؛

ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو پچ تھا وہ کہہ دیا تھا، مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا میں کیا کرتا۔ وہاں ایک کالی مغل کی گول چٹت دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا، اس نے قسم دی کہ پچ کہنا میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا، پچ کہ دیا۔

ہاں فقہ بنانے سے عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے، اسے جب اس مولوی نے قسم دی تھی کہ پچ بولنا تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم پچ بولوں گا انشاء اللہ اگر وہ پچ نام کا مولوی تھا اور فقہ نہ جانتا تھا تو پکار ہی کر انشاء اللہ کہہ رہتا اور اگر وہ مولوی تھا اور ٹھیکرے ٹھیکرے بد لائی آہن پٹی تھی تو پکار کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم پچ بولوں گا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ گیا ہوتا انشاء اللہ۔ مگر یہ خیال رکھا ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے

پانے ورنہ انشاء اللہ کا چوڑ ٹوٹ جانا پھر چاہتے وہ کہہ دیتے، ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا۔

حضرت! باتیں تو آپ نے خوب بتائیں مگر میں حیرت میں ہو گیا، اب تو خدمت ہونا ہوں، اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا، میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا۔

تم جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتا دیجگا، کہو میں ابھی ہدایہ، شرح و تالیہ و سنن بخاری و سنن ابی داؤد اور بڑے بڑے مستشرقین اور بڑے بڑے فقہاء کی روایت نکال دوں اور تم نے وہ فتاویٰ بھی دیکھا ہے؛ جو پرانے خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس کا نام بھول گیا ہوں، یاد آ جاوے گا تو بتا دوں گا، اس میں ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں، ایک میں جائز، حلال، اور دوسری میں ناجائز، حرام لکھ رکھا ہے پھر چونسی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لے لیا، بہت

صاحب سے جا کر پوچھو۔ اسی شہر  
 میں بہت سے مولوی ہیں۔ یہاں  
 سے اس پندرہ کوں پر نامی نامی  
 قصبے ہیں، وہاں مولویوں کے ڈھیر  
 کے ڈھیر ہیں، وہاں جا کر پوچھو!  
 نہیں حضرت! میں آپ ہی سے  
 پوچھنا چاہتا ہوں آپ کا نام بھی تو  
 مشہور ہے۔

ارے میاں! شیطان کا نام تو مجھ سے  
 بھی زیادہ مشہور ہے، ابھی ویسی  
 شہرت تو مھیکو ہوئی بھی نہیں، میں  
 پتھری مشہور ہوں، خدا مولوی نہیں ہوں  
 مجھ سے مت پوچھو!

حضرت! اگر مولوی ملاؤں سے دل  
 کو تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں آتے!  
 جب دل ہی کو تسکین نہ ہو تو مولوی  
 ملاؤں کو کیا کریں! پھر آپ پتھری ہوں یا پتھری  
 سب پوچھے تو دل ماننا نہیں خدا کے

ہوا روپیہ دو روپیہ، فتوے کے  
 نام سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی  
 دیتے رہے کیوں! بات کی بات  
 میں گناہ پلٹ گیا کہ نہیں! مگر اس  
 زمانہ میں جبر کجنت مقلدین فلاسفہ  
 ملاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہب اسلام  
 کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا مشکل  
 پڑی ہے!!

تھوڑی دیر چلے تھے کہ ایک پیر مرد  
 متبرک صورت سفید ریش لے جانا  
 کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں، پکار کر کہنے  
 لگے کہ مجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔  
 انھوں نے کہا کہ بھائی! کیا کوئی مذہبی  
 مسئلہ ہے! بولے حضرت! ہاں  
 مذہب کا مسئلہ ہے، انھوں نے  
 کہا کہ بھائی! نہ میں مولوی نہ مولوی کی  
 دم مجھ سے اور مذہبی مسئلوں کے  
 پوچھنے سے کیا واسطہ! کسی مولوی

لے میاں تک مولوی اور اس کے جاہل مخاطب کی گفتگو تھی اس کے بعد گویا آریٹیکل لکھنے والا کتاب ہے کہ اس

جاہل کا مقابلہ راہ میں پتھریوں کے کسی سرگرد سے ہو گیا پتھریوں کے سوال جواب ہیں ۱۲۔

واسطے بتا ہی دو!

اچھا صاحب پوچھو کیا پوچھتے ہو، مگر میں کسی فتوے و فتاویٰ کو نہیں جانتا خدا کی کتاب اور خدا کے فتاویٰ کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے، جانتا ہوں، جو کہوں گا اسی سے کہوں گا۔

بیت اچھا آپ اسی سے فرمائیے گا، میں پوچھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ کو جاننے میں! خوب جانتا ہوں، ہماری دلی کے رہنے والے تھے بڑے شاعر تھے، ذرا مزاج میں ظرافت تھی ان کے یہ اشعار مجھے یاد ہیں، پہلے

پہلے مصرح میں شاید کچھ لفظ اول بدل ہو گئے ہیں۔

”مولوی کہتے ہیں ہم کو تو نے کیوں رسوا کیا کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر ہم نے کیا کیا واسطہ باعث، سبب ہو جب جہت کچھ بات بھی سازوہ کنجنت کیا تھا میں نے جو افشا کیا کیا کہا، کس سے کہا، کس نے سنا، کس گھڑی کس جگہ کس وقت کس دم آپ کا چرچا کیا۔“

حضرت! میں آپ سے

انشاء اللہ ظاہر شاعر کا مال نہیں پوچھتا انشاء اللہ کے لفظ کی نسبت حکم شرع کا پوچھتا ہوں کہ کس مراد اور کس

لہ خلا کے فتاویٰ سے مراد فطرت انسانی ہے جس میں حسن و قبح اشیا کا علم و ولایت کیا گیا ہے اور حسن کی طرف مجسباتی نے اس حدیث میں اشارہ کیا ہے کہ: ”اُسْتُفْتِ تَلْبِکَ وَکَلِ اُنْتَاکَ الْمَفْضُوْنَ اَمْرٌ جَرَّ لَکَ اِسْمٌ فَادْرَسَکَ سَوَاقِیْ عَلِیٌّ کَرْتَمِیْنِ وَہِ مَطِیْقُوْنَ کَ فَتَوُوْنَ سَے مستغنی ہیں۔ پانچویں ہم نے خود دیکھا ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گروی تھا بہت مدت کے بعد ہاک نے اس کو چھڑا دیا، بہرینہ کہ رین نامہ میں تمام منافع موضع مرہوبہ کا مرہون کو معلن و مباح کر دیا گیا تھا اور تاک رین کے وقت ہاک بخوشی کل زرد ہوا ادا کرنا چاہتا تھا اور مقلیوں نے بھی اجازت کا فتویٰ دیدیا تھا مگر اس مرحوم مغفور نے یہی حدیث پڑھی کہ اسنتقت تلک و لو ان تاک المفضون اور جس قدر حاصل اس موضع سے وصول ہوا تھا

سب نذرین میں سے مجرادے کر باقی روپیہ لڑین سے اے لے یا ۱۲۔

مطلب سے اور کس مقام پر اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ کہو، خدا مجھ کو خدائی فتاویٰ سے بچر دیکھ لینے دو۔ اس میں تو یہ لکھا ہے کہ تم کو کسی کام کی نسبت نہ یہ کہنا چاہیے کہ میں کل کروں گا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر خدا چاہے تو میں کل کروں گا۔ خدا لبیب علیہ العلیل ہونے کے ہر کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو بھی لازم ہے کہ ہر چیز کو خدا سے متعلق کر لے۔ پس جس بات پر انشاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے تو انشاء اللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلق ہوتی ہے اور وعدہ کو زاوہ استحکام ہوتا ہے، منٹے دانے کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے نے خدا پر اس وعدہ کی تعلق کی ہے تو ضرور اس کو پورا کرے گا۔ اگر تم نے کسی سے وعدہ کیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور اس کے ساتھ انشاء اللہ

نہیں کہا اور نہیں گئے، تو صرف وعدہ خدائی کا گناہ ہوا اور اگر اس کے ساتھ انشاء اللہ بھی کہا اور پھر نہ گئے تو تین گناہ ہوئے ایک وعدہ خدائی کا، دوسرا اس بات کا کہ جس سے وعدہ کیا تھا اس کو وعدہ پورا کرنے کا زاوہ یقین دلایا اور وعدہ پورا نہ کیا تو تیسرا اس بات کا کہ خدا کو ضامن دیا اور اس کے نام کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر کسی بات پر قسم کھا کر انشاء اللہ کہا ہو تو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے بلکہ دو گنا گناہ ہوتا ہے، قسم توڑنے کا۔ خدا کے ساتھ تعلق کر کر اس کا ادب نہ کرنے کا۔ جب قسم کھائی کہ سچ کہوں گا اور ظاہر میں یا اول میں انشاء اللہ کہہ لیا اور پھر جھوٹ بولے تو تین گناہ ہوئے، جھوٹ بولنے کا، قسم توڑنے کا، خدا پر تعلق کر کے اس کا ادب نہ کرنے کا۔ جس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے جب مصمم اور نہایت مضبوطی اور سچی نیت سے اس کے

ہے، مگر اور جگہ کہتے ہیں کہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے، نہ قسم ٹوٹنے کا گناہ ہوتا ہے۔ اور انشاء اللہ کو ایک سپر بناتے ہیں جو ہر ایک حربے سے بچا لیتی ہے، حضرت! خدا مارے یا چھوڑے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکھا ہے۔ اگر وہی اسلام ہے تو میرا اسلام، اس سے شہرت یہ ہی اچھے جو سچائی کو اسلام بتاتے ہیں۔

پورا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اسوقت اس کے ساتھ انشاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تم نے ایک مولوی سے کہا کہ میں تم کو انشاء اللہ دس روپے دوں گا تو اس کے یہ معنی ہوئے ضرور بیٹیک تم کو دس روپے دوں گا۔ حضرت! اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ نفلی نہیں رہتا، بلکہ حکم نصوص صریحہ مثل زکوٰۃ اور نذر معین کے واجب ہو جاتا

اگرچہ یہ تمام آرٹیکل عرفانیت کے سپر ایہ میں لکھا گیا ہے مگر اس میں جس قدر مسائل فقہا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو فقہ کے مادوں میں موجود نہ ہو۔ اسی قسم کے فتووں کی نسبت کہا گیا ہے کہ "استفت قبایک ولو اذناک المفتون" اور ایسے ہی جیلوں کی نسبت علی مرتضیٰ سے پوچھا گیا کہ ما الجیلۃ؟ تو آپ نے فرمایا "وَمَا الْجِلَّةُ"

## مشال ۵

یا شلادہ امام غزالی کے ایک رسالہ کے ریویو میں اہل دنیا اور مشائخ و علما کی نسبت

یہ رہ مقام ہے کہ امام غزالی نے اپنے رسالہ التفرقة بین الاسلام والزندقة میں دو قسم کے لوگوں کا بقیہ آگے



ایک مقام پر لکھتے ہیں "اس مقام پر امام صاحب نے دو قسم کے دلوں کا حال لکھا ہے ایک دن کا جو اسرارِ ملکوت اور کفر و ایمان کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہیں (یعنی اہل دین) اور دوسرے وہ جو ناقابل ہیں (یعنی اہل دنیا) اور دونوں کے اوصاف بیان کیے ہیں مگر یہ مقام کسی قدر زیادہ تشریح کے قابل ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس مقام پر امام صاحب نے جو دوسری قسم کے لوگوں کے حال سے بحث کی ہے (یعنی اہل دنیا کے مال سے) ان میں وہ لوگ جو اعلیٰ نیر اہل دنیا کہلاتے ہیں، داخل نہیں ہیں۔ اہل دنیا سے میری مراد ان دنیا داروں سے نہیں ہے جن کو اہل دنیا بھی الدائم الختام سمجھتے ہیں بلکہ ان سے مراد ہے جنہوں نے دنیا کو بغیر کسی بے ایمانی اور دوغابازی کے اختیار کیا ہے، دنیا میں بہ حیثیت و بنیاداری اپنی عزت، اپنا نام، اپنی شہرت، اپنا آرام، اپنی حشمت چاہتے ہیں زہد و تقویٰ، علم و افتاء، صبر و قناعت کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں تفرق کی خواہش انہوں نے ظاہر نہیں کی، انہوں نے ایمان میں سے "لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر دل سے یقین کیا ہے۔ وہ خلا کی نالت کو بے نقص اور رسول کو بے عیب سمجھتے ہیں، وہ کسی ایسی بات کو جس میں ان کی دانستہ ہوا خدا پر کوئی نقص آتا ہو اور رسول پر کوئی عیب لگتا ہو، نہیں مانتے۔ گو وہ کہیں

حال لکھا ہے ایک اہل دنیا جنہوں نے ہوائے نفس کو اپنا خدا، سلاطین کو اپنا سرور، درہم و دینار کو اپنا قبیلہ، جب چاہ کر اپنی شریعت اور اہل و دل کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دیا ہے اور اس لیے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی میں تمیز نہیں کر سکتے دوسرے اہل دین جن کا دل دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے، کامل ریاست سے بچکے بے خدا کی یاد سے متوجہ نہ ہو، وغیرہ اور اس لیے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو سمجھنی تیز کرتے ہیں سرسید نے امام صاحب کے برخلاف اہل دنیا کے ایک خاص گروہ کو مستثنیٰ کر کے دنیا داروں کی برکت کی ہے اور پھر اہل دین کی خبر لیتے ہیں۔

نے کہی ہو اور کسی نے مکھی ہوا اور گو کہنے والے اور کھنے والے کے نزدیک اس سے کوئی نقص نہ آتا ہوا اور عیب نہ لگتا ہو، اور گو بالفرض درحقیقت وہ بات کوئی نقص یا عیب کی نہ ہو مگر اس وجہ سے کہ وہ اس کے ناقص اور معیوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ گو کہ وہ غلطی پر ہوں، خدا اور رسول کی شان سے اس کو بعید سمجھتے ہیں اور اس لیے اس پر یقین نہیں کرتے۔ غرض کہ ان کو خدا کے تقدس اور رسول کی منزلت پر ایسا یقین ہے کہ کسی دوسرے کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتے پھر وہ کوئی کیوں نہ ہو۔

اعمال میں سے فرائض کو حق سمجھنا اور جن طرح پرہیز کے ان کو ٹوٹا پھوٹا مسلسل باگنڈے دار ادا کرنا اور اس میں کوتاہی کو اپنی شامت اعمال سمجھنا، اور اس پر تاسف کرنا، دل کو بدی اور بدنیتی، کینہ اور فساد و بغض و حسد سے پاک رکھنا، کسی کے ساتھ درغابازی نہ کرنا، کسی کا مال نہ مار رکھنا، کسی کو ایذا و تکلیف نہ پہنچانی، ہر ایک کے ساتھ محبت سچا دوستی سے پیش آنا، سب کی بھلائی چاہنا سب کے ساتھ ایمان داری سے معاملہ کرنا اور رکھنا اختیار کیا ہے۔

دنیا تو گویا ان کا مقصد ہی ہے ان باتوں کے سوا انھوں نے دنیا ہی دنیا کو پکڑا ہے۔ روپیہ کے ایمان داری سے پیدا کرتے ہیں، اپنی محنت و مشقت سے روٹی کمانے میں سب سے انتہا کوشش کرتے ہیں، روپیہ کاتے ہیں، عمدہ عمدہ مکانا بناتے ہیں، دنیا میں عزت و ترقی و حشمت حاصل کرتے ہیں، باغ بناتے ہیں اور اس کے پھولوں اور پلوں کی سیر سے خوش ہوتے ہیں، میوے کھاتے ہیں، گھوڑوں پر چڑھتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنتے ہیں اور اچھے سے اچھے کھاتے کھاتے ہیں، قالینوں کے فرش کو جوتیوں کے تلے بچھاتے ہیں، تمام عیش و آرام جو کہ انسان عمدہ اخلاق اور شانستگی کے ساتھ کر سکتا ہے، کرتے ہیں، خدا کی پیدا

کی ہوئی چیزوں کو جس لیے اُس نے پیدا کیا ہے، برتتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے ہم کو دیا ہے ہم کیوں نہ برتیں اور کیوں مصیبت بھگتیں اگر خدا کو ان سے ہمارا عیش و آرام مقصود نہ تھا تو ان کو پیدا ہی کیوں کیا تھا ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو برتیں اور عیش اڑاویں، مگر زیادتی نہ کریں کیونکہ جس طرح کے استعمال کے لیے وہ بنائے گئے ہیں اگر اُس طرح پر استعمال نہ کریں تو نیک حرام اور چور ہوں گے نہ شریف دنیا دار، وہ نہ دعویٰ دینداری کرتے ہیں، نہ کسی کے پیشوا بننا چاہتے ہیں، نہ اپنے تئیں تابع سنت کہلاتا پسند کرتے ہیں نہ پیرو پروردگار نہ ممبر پر واعظ بننا چاہتے ہیں، نہ استغنا کے معنی، میدھی طرح سے خدا کے بندے رسول کی امت ہیں، خدا کے دینے ہوئے عیش و آرام میں مست رہتے ہیں پس ایسے لوگ تو امام صاحب کی بحث سے خارج ہیں۔

ہاں جو کچھ اس مقام میں امام صاحب نے لکھا ہے، وہ ان لوگوں کی نسبت لکھا ہے جو جبید و عامہ دار ہیں، دنیا چھوڑ دین کی راہ چلتے ہیں، دن رات قال اللہ وقال الرسول میں بسر کرتے ہیں، دین ہی دین پکارتے ہیں، دین ہی کا اور خدا دین ہی کا پکھوتا بناتے ہیں، دنیا داروں نے جس قدر مختصر انچھر دین کے اختیار کیے تھے ان دینداروں نے اُنکی قدر مختصر باتیں دنیا کی اختیار کی ہیں اور جس قدر وہ دنیا کے حاصل کرنے میں مشغول تھے، اسی قدر یہ دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں، گو پہلے فرقہ کے بالکل برعکس ہیں اس مقدس فرقہ کا (خدا ان سے پناہ میں رکھے) امام غزالی صاحب نے ذکر کیا ہے، بیشک جب یہ فرقہ کر بلا اور نیم چڑھا ہو جاوے یعنی ہوا سٹے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور وہم و تانیہ کو اپنا قبلہ اور حُتب جاہ کو اپنی شریعت اور اہل دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دے تو وہ کبھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تیز نہیں کر سکتا قما قالہ الغزالی

فہرستی لاریب فیہ۔

گروہ دوسرا فرقہ بھی نہایت ہی خونخوار ہے کہ جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ "اُن کا دل دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے کامل ریاضت سے ممتلی ہے۔ خدا کی یاد سے منور ہے، فکر کی شیرینی سے شیریں ہے، شریعت کی پابندی سے مزین ہے، مشکوٰۃ نبوت سے روشنی لیتا ہے، جلاوار آئینہ کی مانند ہے، اُن کا نور ایمان شیشہ کی ہندی میں بنے آگ کے سلگتا ہے، نور کے چمکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اس فرقہ نے ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور مہم و دانا نیر کو اپنا قبلہ نہیں بنایا، مگر خود ہوائے نفس نے اُن کو اپنا خدا اور خود سلاطین نے اپنا معبود اور درہم و دانا نیر نے ان کو اپنا قبلہ بنایا ہے، پھر اُن کو بنانے کی کیا حاجت تھی۔

جس وقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گرد اُن کے معتقدین کا حلقہ ہوتا ہے اور ہراسو کی مانند اُن کے دست مبارک کے بوسہ دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو اُن کا دست مبارک بحین الرحمن سے بھی بالا دست ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب، حضرت صاحب کی آواز کا چاروں طرف سے اُن کے کان میں آنا چاؤشان کسریٰ و کیتباؤ کی آواز سے بھی قوی اثر اُن کے دل پر ڈالتا ہے۔ مسکینی اور کسار اُن کو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے، اس لیے وہ اور زیادہ مسکین اور نکسر مہرتے جاتے ہیں۔ سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں، اس لیے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت اُن کو دنیا و لاتی ہے، اس لیے وہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طعمی حاجت سے زیادہ

نہ یہ احوال امام صاحب کے رسالہ سے لے گئے ہیں جو اس جلد ختم ہوتے ہیں کہ "ترکے چکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں"۔

بغیر محنت کے درم و دنیا میں ولادتی ہے، اس لیے وہ زیادہ بے طمع ہونے جاتے ہیں ان کی ہر ایک بات پر لوگ آسنا و صدقہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے دل میں دوسرے کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو چھواتے چھواتے ہر ایک مشکل کی حل کو دعائیں منگواتے منگواتے، ہر ایک مسئلہ کا فتویٰ دیتے دیتے ایک اور بیماری ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب بُرائی بھلائی، دودخ و بہشت، کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور کسی کو مرتد، کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت، کبھی خازنِ جنت ہیں اور کبھی مالکِ جہنم، خدا کے نور کے دل میا بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے جاتے ہیں یہ تمام باتیں مل ملا کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول ٹھلا کر کپتا ہو جاتا ہے۔ نہ مکان رہنے ہیں جو کچھ سنیں نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں، نہ منہ رہتا ہے جو حق بات کہیں، جو سرور اور دلی آسائش اور دل کے پھولنے سے جو سزا اس فرقہ کو آتا ہے نہ کسی دنیا دار کو میسر ہوتا ہے نہ کسی دولت مند کو اور نہ کسی صاحبِ تخت و سلطنت کو۔ پس اس فرقہ سے بھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز کرنے کی توقع نہیں ہے، الاما شاء اللہ۔ کوئی آفت انسان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ہے جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نیک ہوں۔ کوئی گمراہی انسان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جب وہ جانتا ہے کہ میں پابندِ شریعت ہوں، وہ زبان سے اپنے تئیں گنہگار کہتا ہے مگر اس کا دل اس کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ اس کہنے کو بھی وہ ایک نیکی اور تعلق سمجھتا ہے اپنی چال و ڈھال شریعت کے موافق بنانا ہے مگر اس کا دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ اناس کے دماغ گل پنچے ہونے، ڈارھی کے لمبی یا یک مشن و دوا کٹت ہونے، کپڑے کو نجاست سے پاک

کرنے، پانی کے پاک دباک ہونے پر دن رات بجٹ کرتا ہے۔ لمبے لمبے فتوے لکھتا ہے۔ مگر دل کو شجاعتوں سے پاک کرنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ اکل حلال اور صدق مقال پر لمبے لمبے وعظ کہتا ہے مگر جب کوئی لقمہ تر آجاوے تو جھٹ نکل جاتا ہے۔ اور اگر کبھی اُگل دیتا ہے تو اس اُمید پر کہ اس سے بھی زیادہ لقمہ تر ستر آوے گا۔ یہی باتیں تھیں جن کے سبب حضرت عیسیٰ نے فروسیوں اور صدوقیوں کو یعنی شریعت پر چلنے والے مہر دیوں کو ملامت کی۔ یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ "یلعنہم اللہ ویلعنہم اللہ لعنون" عمدہ زندگی وہی ہے جو سیدھی سادی ایک دنیا دار عیسیٰ ہو۔ پھر خواہ وہ دُرخ میں جائے، یا بہشت میں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ما بُدِیَ مَا یُفَعَلُ بِنِیْ وَ لَا بِکُمْ"۔

اگرچہ سرسید نے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اردو زبان اور اردو لٹریچر کو طرح طرح سے مدد پہنچانی ہے مگر جو بے بہا مدد خاص کر اُن کے شریعی ور کسنگ اردو لٹریچر کو پہنچی ہے اُس کے لحاظ سے اُن کو فادر اوٹا اردو کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ اگرچہ سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لائق لائق مصنف، مترجم اور مضمون نگار ملک میں موجود ہیں جو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسلوبوں سے اردو زبان کو سراپا دار کر رہے ہیں، لیکن ہر شخص طرز تحریر میں گو کہ وہ فی نفسہ کسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہو، یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریروں کو اپنی سطح پر لے آئے۔ بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شارب عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ اور لوگ اُن کا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے، اور بعضے ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ اُن کی طرف کسی کی توجہ مائل نہیں ہوتی اور اس لیے دونوں قسم کے اسٹائلوں کا عام



لٹریچر پر کوئی معتبر اثر نہیں ہوتا، سرسید کی طرزِ تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اُس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے اور اُس کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ بیان کی قدرت اور اس کا زور اور تاثر جو اس شخص کی خاص تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ تو اسی کے دل و دماغ کا حصہ تھا، دوسرے کی تحریر میں اُس کا ڈھونڈنا حاصل ہے مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گلاڈت آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے، اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہانگاہِ اہل قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہوا ہے اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اسی ایک قلم کی آوازِ بازگشت ہے اور اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے لکے ہیں جاری تھے اُن کا مقابلہ اُن اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اُس کے بعد جاری ہوئے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شائع ہوئے تھے ان کا موازنہ اُن اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے جو اس کے بعد شائع ہوئے، اس مقابلہ سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اُردو اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اُردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق نے خاص کر اُس میں ترقی کی روح پھونکی ہے کیونکہ اُن کے مضامین جلد شائع ہوتے تھے اور جینے میں کنسی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گزرتے تھے اور یہ سلسلہ بتیس برس تک برابر جاری رہا۔

بیشک یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں پرچوں میں سرسید کے سوا اور

بھی بہت سے لکھنے والے تھے خصوصاً گید مہدی علیخان قدیم تہذیب الاخلاق میں گویا سرسید کے برابر کے شریک تھے اور اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جو ٹریری فوائد ان پر چوں سے مترتب ہوئے ان کو صرف سرسید کی تحریرات سے منسوب کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والے اور انھیں کے اسٹائل کی پیروی کرنے والے تھے ان لیے اگر ان تمام فوائد کو صرف سرسید کی تحریروں سے منسوب کیا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

چونکہ اس مقام کو ہم تہذیب الاخلاق کے نتائج کے ذکر میں مفصل بیان کر چکے ہیں اس لیے یہاں اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ان کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا بھی شوق رہا ہے۔ اگرچہ فارسی زبان میں جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے، انھوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں کوئی اعلیٰ درجہ کی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر جن مجلسوں اور صحبتوں میں ان کا ابتدائی زمانہ گزرنا تھا ان میں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ مولانا صہبانی سے ان کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو غالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مفتی صد الدین خاں کے ہاں بھی ان کا ایک پھیرا ہر روز ہوتا تھا جہاں صہبانی اور شیفتہ اور مومین وغیرہم کا مجمع رہتا تھا۔ مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تھے اور مرزا ان پر بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں ان کے نہایت گارڈھے دوست تھے اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکھتے تھے اسی لیے ضرور تھا کہ فارسی لٹریچر پر ان کی توجہ مائل ہو مگر باوجودیکہ یہ سب لوگ بیدل یا ابوالفضل یا جلالاٹے طباطبایا اور مشہور نازک خیال نثاروں کی

پیر وہی کرنے والے تھے لیکن ظاہراً سرسید نے فارسی نثر میں بھی مثل اردو کی سادگی سے کبھی شجاذہ نہیں کیا۔ اگرچہ ان کی ابتدائی تحریریں، ایک رسالہ کے سوا جو سندھ تصدق شیخ کے بیان میں ہے، دستیاب نہیں ہوئیں مگر غدر کے بعد کی جو بعض تحریریں ملی ہیں ان میں ویسی ہی سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی ان کی اردو تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ از انجملہ ایک وہ فارسی لکچر ہے جو انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے وقت کلکتہ کی مجلس مذاکرہ علمیہ میں پڑھا تھا اور جو ان کے لکچروں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے۔ اس کے سوا ان کا ایک اور فارسی خط منشی سراج الدین احمد کے سوانح میں ہم کو ملا ہے جو ان کو حیدرآباد میں دستیاب ہوا تھا اور جو سرسید نے ۱۳ اگست ۱۸۸۱ء کو حاجی سید محی الدین خاں رضوی کے نام ان کے خط کے جواب اور چندہ سو روپیہ چندہ کے شکریہ میں لکھا تھا۔ چونکہ یہ خط کہیں نہیں چھپا ہے اس لیے اس کے نکتہ ہو جانے کے خیال سے ہم اس کو بحضہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

”مخدوم اولاد! نامہ یافتہ و متحیر گشتم۔ خواندم دیر خواندم، بلند پاگنی نویسنده اش را خود آن نامہ نشان میداد، تنجیر در آن بود کہ مخاطب آن کیست؛ بقلط خود را دانستم و باز گشتم کہ انچہ در آن نامہ مرقوم ست سزاوار، بچو منے دانم آلودہ؛ مکنزین مخلوتے، بیچ میرزے، گم کردہ را بے نمیتواند شد، بچیز آن کہ اوصاف حمیدہ و اخلاق پسندیدہ شما شخص خیالی خود را یا خود اوصاف خود را مخاطب ساخته باشد، سخنے دیگر قرار و ادن نمی توانم۔ و اگر از بی فرو تر آیم و خود را مخاطب آن دانم حاشا کہ بدون اختیار مذہب و حدت وجود این چنین توانم دانست، تا کہ من کہ حجاب خودم از میان برخیزم و تعاوت من و تو تو من از میان برافشند و ہمہ انچہ نوشتہ ای خود شما مصداق آن باشید دلعد و تر من قال تو خود حجاب

خودی احمد از میاں بر خینرہ

”در راست فرمودہ اند کہ ” در عنایت ذریعہ ایک گوہری ست نہ وسیلہ  
یکجہتی “ مگر الحمد للہ کہ باہم شما ایک گوہری و یکجہتی ہر دو محقق است، گویا نسبت  
ہائے من با شما باعث تنگ و عاریہ شماست و ما را بسبب عزت خدا داند کہ  
محبت پیشہ ام و بجز محبت و رکشت سینہ ام نہ کشتہ اند۔ الطاف و عنایت  
شمارا شکر گزارم و بایں محبت جان شمار مبلغ یک ہزار پانصد روپیہ سکہ انگریزی  
کہ یکجہتی تعمیر پور ڈنگ ہوس مرحمت فرمودہ اند رسید قوم را عزت افزو  
و ولم لا تعونیت داد و ساعد سعی مارا قوت بخشید۔ آں ازین قوم ناپاس  
و شوارہ مگر اجر کم علی اللہ صلوات کافی ست۔ بن مشکر یہ آں عطیہ بجای آرم،  
وروزے می آید، و آں دور نسبت، کہ تمام قوم و اخلاف شان سلا بعد تسل  
بہ نکر گزاری، چو شما بزرگان کہ در صلاح و فلاح قوم از قدم و قلم و دم دریغ نہ فرمودہ  
اند رطب اللسان و خرب البیان خواہد بود۔“

دوم نچہ بر حال زارم دل سوختہ اند و حسرت فرمودہ، مہدوما احسان شما، مگر

پسج جائے دل سوختن و حسرت نمودن نسبت

حسن شہرت عشق رسوائی تعاضا میکند

جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست

اگر قوم مارا چشم بصیرت بودے و آل کار خود فہمیدے ما و شمارا ایں گوش

دکشا کش ضرور نہ بودے ہر گاہ حال این ست پس ازاں قوم بجز بد گوئی و افترا پڑائی

و نا فہمی و از ما بجز صبر و تسلیم و رضا و بجز چہ توقع بود۔۔۔۔۔ الضامنہ ما اند

دست نمیدہم و پاکسی بظنی روانیدارم، دوستان دشمن نمائے من بد نیستند

حق بجانب شان ہم ست، چہ آہنا سخن می شنوند و را بے می بیند کہ گاہے۔

از خود شان نشنیده و ندیده بودند۔ دیر نیہ غلطی ہائے مازفترہ رفتہ استحکام آیات  
 قرآنی بہم رسانیدہ بلکہ انراں ہم مستحکم تر گشتہ۔ پس کسے کہ اسیں اغلاط او انما ید چہ گوشہ  
 غیظ و غضب شان مصرون و از سب و شتم شان مامون تو اند شدہ، آنہا از  
 معارضاتِ میانِ ملل دیگر کہ بر اسیں غلط ہائے دیر نیہ ما دارو ساختہ آں را بہ  
 اسلام نسبت میدہند۔ واقف نیستند، و از آں مشکلات کہ باعتبار علم جدیدہ  
 و تحقیقات حدیثہ بر اصول مقررہ اسلاف ما از فقہاء و محدثین و مفسرین واقع  
 میشود نہ بر اصل اسلام۔ اطلاع ندارند۔ بگوشِ شان و بگوشِ اسلاف شان بمقابلِ سخن ہا خود شان  
 بجز کلمہ آمنا و صدقنا صدائے دیگر نہ رسیدہ یک گونہ خلفشارے در عہد  
 خلفائے عباسیہ بسبب تراجم فلسفہ یونان بہم رسیدہ بود، علمائے اسلام بمذا  
 آں برخاستند۔ تعجب اسیں کہ ہم خود معتزمن بودند و ہم خود مجیب، منافقے  
 بمقابل نہ داشتند خود گفتند و خود شنیدند و دانستند کہ فتح یا فتند۔ قبول می کنم  
 کہ فتح یافتند مگر حالانہ آں مدعیان اندونہ آں دعویٰ نہ آں جام ست نہ آں  
 ساقی، نہ آں بادہ ست نہ آں مینا خود آں فلسفہ از پورا نمادہ است و آں جام و مینا شکستہ،  
 بنائے نو بر اساس نو بنا شدہ۔ پس کسے کہ دعویٰ اسلام دارو و اسلام را حق  
 میداند و غلط را در آں امکان نمی بیند، و چگونہ آں غلط را را باور کند و اسلام  
 و اسلامیان را رسوا سازد۔ پس اسیں در انکار آں و آئندہ تکفیر اسیں معذور اند، و اسیں  
 امریست کہ فطرت انسانی انسان را بر آں مجبور مے سازد۔ یہ اسیں رہبر یعنی  
 دلیل، ما را واجب و لازم ست کہ ہمہ مکفران و لاعین خود را معذور داریم و از  
 سب و شتم شان رنجیدہ نہ شویم و صدق و صفارا پیشیہ خود داریم و ہمہ را معاف  
 کنیم تا از مواخذہ عقیقی و دادرسی داور بے ہمتا ہم امین باشند۔ اما مخالفت و انقرا  
 نسبت بہ مدرسہ العلوم کہ کار صلاح و فلاح قومی ست، عفو آں بہ اختیار من  
 نیست کہ حقوق عماد برگردن شان ست۔ او شان دانند و خدائے شان

قل کفے باللہ بینی و بنکیم شہیدا یعلم ما فی السموات والارض والذین آمنوا بالباطل و  
کفرو باللہ اولئک ہم الخاسرون " والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ "

العبد المفتقر الی اللہ الصمد

سید احمد

کبھی کبھی وہ اردو تحریروں میں بھی ایک آدھ فقرہ نارسا کا لکھ دیتے تھے جو  
لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سید مہدی علیخان نے ان کو ولایت سے خط بھیجا ہے  
جس میں کسی موقع پر سرسید کی طرف خطاب کر کے یہ مصرع لکھا ہے "آئی کہ  
بدیدارت خلقیت تماشائی" اس کے جواب میں سرسید جبکہ ہندوستان میں ان پر  
لعن طعن کی بھرمار ہو رہی تھی، ان کو لکھتے ہیں "در مصرعہ اول کو خطاب بہ من فرمودہ  
اندگر بجلتہ نقطہ دیدارت احوالت بودے نہایت مناسب حال من بودے  
"آئی کہ یہ احوالت خلقیت تماشائی" اگر غم است ہمیں قدرت کہ نمی دامن خدا  
من تماشائے کدائے احوال من میکند انا ہوا الغفور الرحیم  
گناہ من از نامدے در شمار  
ترا نام کے بودے آمرزگار

اے خدائے من! اے رحیم و غفور من! اے محبوب و مطلوب من! خلق  
را بگذر سرچہ خواہ تماشائے من کند تو مرا نیک تماشاکن۔  
نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من  
بہار از یاد گل از یاد و باغ از یاد و بار از من

آہ چہ گفتم و کجا رفتم خدانے من از من جدا نیست، مرا گذاشتن نمی تواند، پس چہ را  
پریشاں شوم، چہ اندیشیا کنم، حمد و ثنای او سراپیم کہ عین حمد و ثنای خود ست  
منصورا الحق گفتم پایہ بلند داشت من صرف الحق گویم او خدا از من بشنوو



”مستجاب کن“

فارسی میں بھی سرسبید کی مثل اسی آزادی سے چلتی تھی جیسے اردو میں وہ اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ کوئی لفظ اہل زبان کے محاورہ کے خلاف نہ لکھا جائے لیکن اصل مطلب بہت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کرتے تھے مثلاً جس طرح اردو میں اسے حرف تدا کی جگہ او کا لفظ خاص خدا کے لیے استعمال کرتے تھے اسی طرح فارسی میں بھی یہی لفظ بول جاتے تھے۔ اردو میں تو اتنی گنجائش بھی تھی کہ نہایت بے تکلف اور رنگریٹے بار کو اچھا کر پکار سکتے ہیں مگر فارسی میں کہیں بھی او کا لفظ اسے کی جگہ استعمال نہیں کرتے۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ ان کی فارسی تحریروں میں محاورہ کے خلاف نظر آتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مطلب کو وہ جس طرح اردو میں بے تکلف ادا کر سکتے تھے اسی طرح فارسی میں کر سکتے تھے۔

## پبلک سپیکنگ

پبلک سپیکنگ (یعنی مجمع عام میں اسپیچ یا لکچر دینا) یہ بھی منجملہ ان اوصاف کے ہے جو سرسبید اور ان کے معاصرین میں ماہ الاقبالیہ تھے۔ مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں، قوت نظری قوت عملی کے ساتھ ذہن حافظے کے ساتھ اور تحریروں تقریر کے ساتھ۔ یعنی سوچنے والے اکثر کام کرنے والے نہیں ہوتے، اسی طرح ذہین آدمی قوی المحافظ کم ہوتے ہیں اور اسی طرح جن کی قلم میں زور ہوتا ہے ان میں قوت گویائی نہیں ہوتی۔ مگر یہ عجیب و غریب شخص جیسا سوچنے والا تھا ویسا ہی کام کرنے والا تھا، اور جیسا ذہن والا تھا ویسا ہی حافظے والا تھا اور جیسا کہنے والا تھا ویسا ہی بولنے

والا تھا۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

سرسید کی تقریر کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ ان کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی قوت تقریر تھی۔ اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ سحریر کا اثر مدت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور صرف معدود آدمی اس سے متاثر ہوتے ہیں، سبلاوت تقریر کے کہ اس کا اثر آن واحد میں بجلی کی طرح تمام سامعین کے دلوں میں دوڑ جاتا ہے، تحریر ہر شخص پر جو اس کو پڑھتا ہے فرداً فرداً اثر کرتی ہے اور اس لیے وہ اثر ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتا، مگر تقریر کا اثر تمام مجلس پر دفعتاً واحدہ پڑتا ہے اور اس لیے تمام حاضرین ایک دوسرے کی حالت سے متاثر ہوتے ہیں، تحریر میں اثر کرنے والے صرف الفاظ اور معانی ہوتے ہیں اور تقریر میں ان کے ساتھ سپیکر کا لب و لہجہ، اس کی طرز ادا، اس کی آواز کا سوز و گداز اور اس کے اعضاء و جوارح کی حرکات بھی شامل ہوتی ہیں اور اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۴۳ء میں کیا تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہونے پورے تین برس گزر چکے تھے۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا۔ بلاشبہ جس گرمجوشی کے ساتھ اہل لاہور نے ریلوے اسٹیشن پر سرسید اور ان کے ہمراہیوں کا استقبال کیا تھا اور جس چاؤ اور انگ اور فیاضی اور قراخ جو صہلگی کے ساتھ ان معزز مہانوں کی مدارات کی گئی اور جس شوق سے بیرو سجا کے لوگ سید صاحب کی آمد آمد میں آئے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع تہذیب الاخلاق نے سرسید اور ان کے کام کی عظمت کا نقش عمراً اہل پنجاب کے دل پر پٹھا دیا ہے، مگر ۲۹ دسمبر کو جو لکچر کہ سید صاحب نے

راجہ دھیان سنگھ کے دیوانخانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا اس  
 کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا سا عالم تھا، کوئی مسلمان  
 ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چپندہ ڈیٹے پر آمادہ  
 نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین  
 برس میں اہل پنجاب پر کیا تھا اس گچھرنے دو تین گھنٹے میں اس کو دو چند کر دیا خصوصاً  
 مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگون کر دی تھی۔ انھوں نے کہا،  
 ”اے بزرگان پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بد عقیدہ ہوں، مگر میں آپ  
 سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر، مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا  
 آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ؟ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس  
 میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لیے  
 مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے  
 چارہ قلی، کافر، بت پرست، بد عقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی  
 اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر  
 آمادہ ہوتے ہیں، پس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلم کے قائم کرنے میں ایک  
 قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے  
 اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار  
 ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیٹے، کیا آپ صاحب مجھ بد بخت نامہ سیاہ کی شائستہ  
 اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلًا بعد نسل ڈوبونا اور خراب و خستہ

لے ایک صاحب جو فانی نارمل اسکول لاہور میں بیڈ ماسٹر تھے اور سر ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں پاتے

تھے انھوں نے پانسو روپیہ جیندہ کی فہرست میں لکھا تھا ۱۲۔

حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؛ اگر آپ سب صاحبِ بیری حالت کو بدتر جانتے ہو اُس سے مہرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھیلانی دہبتری کی فکر کرو۔“

یہی الفاظ جو اس وقت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس موقع پر جب سرسید کے منہ سے نکلے تھے ان میں کچھ اور یہی جا دو بھرا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں اور معنوں کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

سرسید کے اخیر زمانے میں کسی لائق یورپین نے ان کے لکچروں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ اچھا وہی جس کا انجام اچھا ہو، تو جوہر کامیابی سرسید کو بذریعہ اپنی لاشانی فصاحت کے حاصل ہوئی ہے اُس سے ان کی نیکدلی اور اسلامی محبت کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ ان کے لکچروں نے عجیب و غریب اثر کیا ہے اور اُس فصاحت کے بحرِ دُعا نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لیے تھوڑی دیر کو قوم کی اس دردناک حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ لینا کافی ہے جب کہ سید کی فصاحت و بلاغت نے ان لکچروں کی صورت میں اپنا مشن شروع کیا۔“

کونل گریم لکھتے ہیں کہ ”(یعنی سید) ایک پیدائشی اور پیر ہیں، جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھیری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اُس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے اور یہ تمام درودِ غم کی علامتیں ان کے سامعین پر سبلی کی طرح

اثر کرتی ہیں :-

قومی اور ملکی مجموعوں میں سپیج یا لکچر دینے کا طریقہ قدیم یونان روما اور عرب میں برابر جاری تھا اور زمانہ حال میں فرانس، انگلینڈ اور امریکا میں نہایت ترقی پر ہے، لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے کہیں اس کا سراغ نہیں پایا جاتا اور اس کی وجہ ظاہر ہے، جب تک سلطنت کی طرف سے رعایا کو ہر قسم کے خیالات اور رائے ظاہر کرنے کی آزادی نہیں ہوتی کسی ملک میں عمدہ اور میٹر یا سپیکر پیدا نہیں ہو سکتے، چنانچہ جب سے برٹش گورنمنٹ نے اس ملک میں آزادی کا سایہ ڈالا ہے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جن میں سے بعض بنگالی سیدروں نے پیپک سپیکنگ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، لیکن جہاں تک ہنگا ہے ان لوگوں کی تمام اور میری اور فصاحت انگریزی زبان پر منحصر ہے، گویا جو سٹرک بزرگ پٹ اور فاکس وغیرہم تیار کر گئے ہیں انہیں بند کر کے اسی سٹرک پر چڑیے ہیں، اپنی زبان میں کوئی داغ بیل نہیں ڈالی، سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے اپنی ملکی زبان میں پیپک سپیکنگ کی راہ نکالی ہے، نہ وہ انگریزی جانتا تھا جس میں بڑے بڑے اور میٹروں اور فصیحوں کے لکچروں اور اسپچوں کے نوئے موجود تھے اور نہ ان اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی جس سے اس راہ میں کچھ مدد ملتی، جس طرح اس کے تمام اوصاف فطری اور پیدائشی تھے اسی طرح سپیکنگ کی یاقوت بھی محض خدا داد تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی اسپچ یا لکچر کے کھٹے دیا پہلے سے اس کے تیار ہونے کا بالکل محتاج نہ تھا، ہم پہلے حصر میں یہاں انگلستان کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے، لکھ چکے ہیں کہ سمٹونین سوسائٹی اڈنٹ

سول انجینئرس کے سالانہ جلسہ میں جہاں انگلستان کے متحدہ ڈپلومک اور لارڈ اور پٹر  
 بڑے نامور انجینئر موجود تھے اور جس کا موضوع انجینئرنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا  
 وہاں جب انجینئروں کی تقریریں ہو چکیں تو سر سید نے ایک ایسے فن سے متعلق  
 جس سے وہ محض نا آشنا تھے، ایسی برجستہ تقریر کہ تمام اہل جلسہ اُس کی داد دینے  
 دیتے تھک گئے اور اس تقریر کرنے کا خیال اُن کو اس وقت پیدا ہوا جب  
 جلسہ کے اختتام پر پریسڈنٹ نے اُن کے آنے کا شکریہ اور خوشی ظاہر کی  
 اور اس کا جواب دینا ضروری تھا۔

جو لکچر کہ سر سید نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا وہ سب سے بڑی  
 شہادت اُن کے پیدائشی اور پیر ہونے کی ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں  
 نے سر سید کی منظوری بغیر پروگرام میں لکچر دینے کی تاریخ چھپوادی تھی اور سر سید  
 چند وجوہ سے جن کا ذکر سفر نامہ پنجاب میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مذہب  
 پر لکچر دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر لوگوں کے اصرار سے اُن کو مجبوراً ماننا پڑا۔  
 لیکن نہ اُن کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ملی اور نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی کیونکہ  
 ملاقاتیوں کا صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک برابر تاننا بندھا رہتا تھا۔  
 باوجود اس کے جب اُس طول طویل لکچر کو دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس  
 طرح بغیر قلمبند کیے ایسی عمدگی اور حسن ترتیب کے ساتھ ایسے بیچ و بیچ اور  
 لٹک مطالب کو یوں سلجھا کر بیان کیا ہو گا؛ کیونکہ وہ کوئی معمولی وعظ نہ تھا بلکہ  
 اُن تمام شبہات کا جواب دینا تھا جو سر سید کے مذہبی خیالات کی نسبت لوگوں  
 کے دلوں میں جاگزیں تھے، یا اُن دلائل کا بیان کرنا تھا جن سے تعلیم یافتہ مسلمانوں  
 کو اسلام کی سچائی کا یقین ہو، یا اُن ضرورتوں کا ذکر کرنا تھا جنہوں نے سر سید  
 کو تفسیر قرآن لکھنے پر مجبور کیا۔ اور ان سب باتوں کے بیان کے لیے بہت



کچھ غور و فکر اور مہدلت درکار تھی۔ سفر نامہ پنجاب کے مولف سید اقبال علی لکھتے ہیں کہ "بجھکو سید صاحب سے اکثر ملنے اور بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے اس قدر موثر کلام اُن کا بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔" یہ تو اس لکچر کا حال ہے جو مذہب پر دیا گیا تھا، اس سے بھی زیادہ عجیب وہ پولیٹیکل لکچر تھا جو نیشنل کانگریس کے خلاف انھوں نے لکھنؤ میں دیا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ اُس کانپیاں اُن کو چند گھنٹے پہلے ہوا تھا باوجود اس کے وہ ایسا جامع اور مدلل اور پر زور تھا کہ اس کے بعد ہزاروں تحریریں اور تقریریں اس باب میں اُس کے موافق اور مخالف ہوئیں مگر اُس کے آگے سب ہیچ تھیں۔ افسوس ہے کہ سر سید کی بہت سی اسپیشیاں اس سبب سے کہ اُردو زبان کے لیے شارٹ ہینڈ رائٹنگ (یعنی مختصر نویسی) کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا، تلف ہو گئیں، ورنہ جس قدر اُن کی اسپیشیاں اخباروں میں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ اسی قدر بلکہ شاید ان سے کچھ زیادہ ایسی ہوں گی جو قلمبند نہیں ہوئیں۔ بار بار لوگوں نے اُن سے چاہا کہ آپ اپنی اسپیشیاں پہلے لکھوا لیا کریں اور جلسے میں اُس کو پڑھ دیا کریں مگر خاص خاص حالتوں کے سوا انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لکھی ہوئی اسپیشیاں کا جلسہ میں پڑھنا مجھے وبال معلوم ہوتا ہے، طبیعت کی آندزک جاتی ہے اور حوش اور ولولہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ سفر نامہ پنجاب میں اُن کی جس قدر اسپیشیاں اور لکچر چھپے ہوئے ہیں ان میں ایک بھی غالباً ایسا نہیں جو انھوں نے لکھ کر پڑھا ہو۔ سب پر جنتہ اور یہ محل زبانی تقریریں کی گئی تھیں جو سید اقبال علی کی حیرت انگیز زور نویسی کے سبب قلمبند ہو گئیں ورنہ یہ بھی سب تلف ہو جاتیں۔

سر سید کی سب سے زیادہ زور دار اور موثر وہ اسپیشیاں ہوتی تھیں جو کسی

پبلک جلسہ میں اپنی رائے کے خلاف بہت سی تقریریں سن کر نہایت جوش کی حالت میں بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلتی تھیں خصوصاً تعلیمی معاملات میں اُن کی رائے یا پاسی کے خلاف کسی جلسہ میں تقریریں ہوتی تھیں خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو، یا ایجوکیشن کیشن کا، یا سینٹ کی مجلس ہو، یا سنڈیکیٹ کا جلسہ ہو، اس وقت معائنہ ممبر اُن کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی اُن کی آواز سے تمام ہال گونج اٹھتا تھا اور فریق مخالف اُن کے رعب میں دب جاتا تھا۔ مگر باوجود اس قدر جوش و خروش کے اُن کی تقریر کبھی تہذیب و شانگلی کی حد سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ بے شک اپنے قومی جلسوں میں وہ اکثر مسلمانوں کو نفرس و ملامت کرتے تھے مگر اُس میں دسوزی اور مہر دی کا پہلو اس قدر غالب ہوتا تھا کہ نفرس و ملامت کسی کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔

وہ فرمائشی لکچر دینا اور فرمائشی اسپیچ کرنی بالکل نہیں جانتے تھے اور وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگنی نہ گا سکتے تھے کبھی کبھی جو بعض اشخاص اُن کو کسی ایسی تقریر کرنے پر جس کا اُن کی طبیعت میں کچھ جوش نہ ہو، مجبور کرتے تھے اور سرسید کو اُن کی خاطر بھی عزیز ہوتی تھی تو وہ بادل ناخواستہ صرف اُن کی ہٹ پوری کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے مگر جو تقریر وہ کرتے تھے اُس میں کچھ جان نہ ہوتی تھی۔

سرسید کی طبیعت کا جو شیلڈن جیسا اُن کی اسپیچوں سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کس چیز سے نہیں ہوتا۔ اسپیچ کرتے وقت جہاں کہیں ایسا موقع آجاتا تھا اُن سے طبیعت کا اُبال ضبط نہ ہو سکتا تھا۔ لاہور میں جو سب سے آخری دفعہ اُن کا جانا ہوا اور وہاں کسی موقع پر تقریر کرتے وقت اُن کو جوش آیا اُس وقت اُن کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ وہ فوراً خاموش ہو کر بیٹھ گئے

اور اس روز کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ہوتی۔ ہم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے ان کی یہ حالت دیکھ کر سخت ممانعت کر دی تھی کہ آپ پہلک جلسوں میں اب تقریر کرنی بالکل چھوڑ دیں۔ ورنہ جان کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اُس کے بعد انھوں نے چند مختصر تقریروں کے سوا کہیں کوئی لمبی اسپچ نہیں دی۔

سر سید میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک اور میں ہونے ضروری ہیں۔ ان کا حافظہ فطرۃ نہایت قوی تھا۔ گویا عمر میں بسبب کبر سن کے نسیان پیدا ہو گیا تھا مگر بچپن اور جوانی اور کھولت کے زمانے کے واقعات اور معلومات سب از بر تھے اور اس لیے ان کی جنرل انفورمیشن نہایت وسیع تھی اور چونکہ واقعات سے نتائج استخراج کرنے کا اعلیٰ درجہ کا مادہ خدانے دیا تھا اس لیے اُس معلومات میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر ایک معاملہ کی نسبت جو کہ ان کو پیش آتا تھا، خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ رسم و رواج اور معاشرت و اخلاق سے، خواہ پائٹکس سے اور خواہ تعلیم سے، وہ ایک مستقل اور غیر مذہب راسخ اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور اس لیے کسی معاملہ پر ان کو زیادہ خور کرنے کی ہمت ہی کم ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ایسی ضرورت ہوتی تھی تو ذہن بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا۔ تصور کی قوت کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے وقت تمام پوائنٹس جو ان کو اپنی اسپچ میں بیان کرنے منظور ہوتے تھے گویا سب مسلسل اور ترتیب وار ان کے ذہن میں موجود ہوتے تھے۔ اسی لیے ہم نے نہیں دیکھا کہ جس طرح عام سپیکر ایک پرچہ پر کچھ نوٹس قلمبند کر لیتے ہیں اور تقریر کے وقت ہر ایک پوائنٹ پر اسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہیں، سر سید نے کبھی ایسا کیا ہو۔ ان کو بہ نسبت ایک کاغذ کے پرچہ کے اپنی ذہنی ترتیب پر زیادہ بھروسا

ہوتا تھا۔ اس کے سوا چہرہ کی بناوٹ جو کہ وجاہت اور ہمت و وقار کی ہوتی  
تصویر تھی اور آواز کی گونج میں جوش کے وقت شیر جیسی گرج محسوس ہوتی تھی،  
یہ دو بڑے معاون اُن کے بیان کی تاثیر کے تھے۔ پھر زبان پر پوری قدرت  
اور ہر مطلب کے دلنشین کرنے کا خدا داد سلیقہ اور عین وقت پر مناسب  
الفاظ کا سوجھ بانا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔ مگر سب سے بڑی چیز جو اُن کو  
دیگر سپیکروں سے علانیہ ممتاز ٹھہراتی ہے وہ قومی ہمدردی کا سچا جوش اور ولولہ  
تھا جس کے سبب جو بات منہ سے نکلتی تھی وہ دل سے اٹھتی تھی اور دل ہی  
میں جا کر بیٹھتی تھی۔

سر سید کی سحر بیانی خاص کر اُن لکچروں اور اسپچوں سے زیادہ ثابت ہوتی ہے  
جو انھوں نے مدرسہ کے قیام کی ابتدائی کوششوں کے وقت مختلف مقامات  
میں دی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قوم اور قومیت کے اصلی مفہوم سے عموماً  
ناواقف تھے اور قومی کاموں میں مدد دیتا جب کہ اُس سے ثواب اخروی کی  
توقع نہ ہو، محض فضول جانتے تھے اور اس لیے انگریزی تعلیم میں جس کو وہ  
خلوفا مذہب سمجھتے تھے، مدد ملنے کی اُن سے ہرگز توقع نہ تھی۔ اُن کو اس  
بات کا یقین دلانا قریب ناممکن کے تھا کہ قوم کی مدد کرنا بعینہ اپنی اور اپنے  
خاندان کی مدد کرنا ہے۔ وہ اس بات سے محض بخبر تھے کہ انگریزی تعلیم  
کو قومی ترقی میں کیا دخل ہے اور سرکاری نوکری کے سوا اس سے تجارت و  
صنعت اور تمدن اور معاشرت میں کیا مدد ملتی ہے۔ اُن کو اس بات کا سمجھنا  
نہایت مشکل تھا کہ دین کا اعزاز اور دین کی ترقی بغیر دنیوی ترقی کے ناممکن  
ہے۔ دولت مند اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم  
کی کیا ضرورت ہے اور متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ سرکاری مدارس کو اُن

کی تعلیم کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت تو عام ذہنوں سے اس قدر بعید تھی کہ اب تک بھی مستثنیٰ شخصوں کے سوا لوگ اس کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑ کر خاص قوم کے لیے روپے سے کالج قائم کرنے کی ضرورت اور مصلحت سے سب بے خبر تھے۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات اُس ابتدائی حالت میں عام مسلمانوں کے ذہن سے محض اجنبی اور نا آشنا تھے جن لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاص کر اس شخص کو جس کی طرف سے قوم میں عموماً بدگمانی پھیلی ہوئی ہو حد سے زیادہ ڈھارہ تھا جن باتوں کو سمجھانے کے لیے آج کل کی اسپچوں میں صرف اجمالی اشارے کافی ہوتے ہیں اُس وقت اُن کو الف بے تے سے شروع کرنے اور اصل مقصد سے پہلے لمبی لمبی تمہیدیں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ باوجود اس کے سرسید نے جس صفائی سے ان تمام خیالات کو اپنی ابتدائی اسپچوں میں بیان کیا ہے اُس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جو باتیں لوگوں کے ذہن سے اس قدر بعید تھیں اُن کو ایسی خوبی سے سمجھایا ہے کہ کوئی بات اجنبی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھولی ہوئی باتوں کو ایک شخص یا دو دلارہا ہے اور جو نقش دھندے ہو گئے تھے اُن کو اجال رہا ہے۔ اُن اسپچوں پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا  
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پنچا ریڈنگ کے جلسہ میں اُس نے اس بات کے سمجھانے کو کہ دو لہتمندوں کی اولاد کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے ریشیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اے ریشیو اور اے دو لہتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بُری حالت ہو مگر بہار سے بچوں کے لیے سب کچھ ہے یہی اُن لوگوں کا

خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

ایک دوسری اسپینج میں اس مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے "نواب خلیل اللہ خاں شاہ بھانی کا نام آپ لوگوں نے سنا ہو گا۔ ان کے پردے کے میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پانودا بنے آتا تھا اور دو چار پیسے لجاتا تھا۔ تعلق آباد کے گاؤں میں جس قدر گھیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تعلق شاہ کی اولاد میں ہیں۔۔۔۔۔ وہاں میں گزرے ہوئے زمانے کے واقعات سے ہم کو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہیے۔۔۔۔۔ دیکھو ہوشیار ہو، یہی حال ہماری قوم کا ہونے والا ہے، کوئی آثار مہلانی اور تہری کے ان میں نہیں دکھائی دیتے بلکہ برخلات اس کے تنزل اور ادبار کی علامتیں موجود ہیں۔"

ایک اور موقع پر ریسیوں کو بورڈنگ ہاؤس میں اولاد کے رکھنے کی ضرورت اس طرح بھائی ہے "اے صاحبو! تعلیم و تربیت کی مثال کھارے کے آسے جیسی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن یہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدے وان کھارے کے ہاتھ سے نہیں پچاٹے جاتے وہ کبھی نہیں کپتے پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آدے میں رکھ کر پکا لو وہ ہرگز دستی سے نہیں پک سکتی۔ تم خیال کرو کہ جناب ملکہ معظمہ و کٹوریہ کو کس قدر دولت و حیثیت اور سلطنت اور اختیار حاصل ہے۔ ان کے بعد اسماعیل پاشا خدیو مصر کو دیکھو کہ کیا کچھ دولت و حکومت ان کو حاصل ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی اولاد کی پوری تعلیم اپنے گھر پر نہیں کر سکتے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ حضور پرنس آف ولینڈ فرزند ارجمند ملکہ معظمہ اور ولیم بندو انگلینڈ پونیورسٹی آکسفورڈ کے ایک طالب علم ہیں



اور جس زمانے میں کہ میں لندن میں تھا میں نے اپنی آنکھ سے حسن پاشا خدیو مصر کے فرزند کو دیکھا کہ یونیورسٹی آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ لباس شہی اور تاج خسروی سے یہ والا قدر شاہراوے طالب علمی کے لباس کو اور چوکونیا سلیٹ ٹوپی کو جو اس یونیورسٹی میں طالب علموں کے لیے مقرر ہے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے موقع پر تعلیم کے اخراجات کی ضرورت اس طرح جانی ہے ”آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی لسم اللہ میں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ سہارا بیٹیا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہو۔ مگر اس جگہ کے بنانے اور قائم کرنے کی کچھ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اس خوشی کو جو قبل از وقوع تم نے اس کو فرض کر لیا ہے، پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بنیر پوٹے ہم کھینٹی کے کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور جس غلطی میں پڑے ہیں اس کی دستی کی کچھ فکر نہیں کرتے۔“

ایک موقع پر قومی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ تمثیل بیان کی ہے ”انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا۔ پانوں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا بہم پہنچاؤں؟ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منہ تک پہنچادیں؟ آنکھوں نے کہا کہ ہم اس میں کے بال مکھی کیوں دکھیں! ناک نے کہا کہ غذا کا سٹرا بسا بسا ہونا میں کیوں سونگھوں! منہ نے کہا کہ میں کیوں چب کر حلق میں نگوں! سب آپ آپ کو لیکر چلے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گزر گئے۔ پھر تو پانوں کو کھرانے لگے، ہاتھ کاپنے لگے، منہ ہلا کے کھانت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا، تب تو سب گھبرائے کہ یہ کیا ہوا! اس وقت عقل کے پاس گئے اس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے، تم

نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے! حالانکہ وہ حقیقت میں تمہارا ہی کام تھا اور اس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ اسی طرح سمجھو کہ اگر ہر ایک ضلع کے مسلمان بیخیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہم کو کیا فائدہ ہے تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے۔ ایک اور جگہ گورنمنٹ مدراس نے جو تحقیقات وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی اس کا ذکر کرتے وقت انہوں نے کہا کہ "اس چٹھی میں ترجمہ اپنی کے مسلمانوں کا یہ حال مندرج ہے کہ "خاص مانع ترقی تعلیم مسلمانانِ تریچناپلی ان کا افلاس ہے جس میں بیت سے مسلمان تباہ ہیں گو وہ مفلس ہیں مگر مغرور ہیں۔ جب میں نے (یعنی صاحبِ چٹھی نے) مسلمانوں کے لڑکوں کو بلا فیس اسکول میں داخل کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کپڑے ان کے پاس نہیں ہیں اور بغیر کپڑا پہنے وہ نہیں آسکتے غریب سے غریب مسلمان ہرگز اپنے لڑکوں کو ویسے آدھے بنگلے پن کی حالت میں باہر نہ آنے دے گا جیسے کہ بڑے دولت مند ہندو اپنے لڑکوں کو مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں۔"

"اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کنسی بدبختی اور بد نصیبی ہے جس کے مسلمانوں پر آنے کی تم راہ دیکھتے ہو؟..... اگرچہ ہم ان غریب محتاج بھائیوں کی غیرت پر فخر کرتے ہیں اور وہ جو اپنی عزت اور شرم کا لحاظ کرتے ہیں حد سے زیادہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ پاک خون جو مسلمانوں کی نسل میں ابراہیم خلیل اللہ سے چلا آتا ہے ان میں بھی ہے، مگر ان کی مصیبت پر دل لرز جاتا ہے اور ہم کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوتی ہے اور تمام عیش و آرام خاک میں مٹ جاتا ہے اور کون تم میں سے ایسا ہے کہ ایسی دردناک حالت اپنی قوم کی لئے اور اس کا دل نہ بھرا آوے؟ اے بھائیو! ان تمام واقعات سے میں ان

لوگوں کو جو اپنی اولاد کی اور اپنی قوم کی تربیت کی کچھ پروا نہیں کرتے، خبردار  
کیے دیتا ہوں کہ دکھو کیا ہوا!! اور سمجھو کہ آئندہ کیا ہوگا!!

اسی طرح سرسید نے اپنی ابتدائی اسپچوں میں طرح طرح سے قومی تعلیم  
کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ کہیں یورپ کی تمام ترقیات کی جڑ تعلیم کو قرار  
دے کر اس کی ترغیب دی ہے، کہیں تمام ہندوستانیوں کو متفق ہو کر خود اپنی  
تعلیم کا بوجھ اٹھانے کی تاکید کی ہے، کہیں ہندوستان کے اسرا کی فیاضی  
کا یورپ کے دوئمندوں کی فیاضی سے مقابلہ کر کے ان کو حقیقی فیاضی کے  
مضہوم سے خبردار کیا ہے، کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اسلاف کی علمی ترقیات  
کا ذکر کر کے ان کو غیرت دلائی ہے اور جبل و بے علمی کی حالت میں سلف کے  
علم و فضل پر فخر کرنے کی مذمت کی ہے، کہیں علوم قدیمہ کا علوم جدیدہ سے مقابلہ  
کر کے علوم جدیدہ کی ضرورت ثابت کی ہے، غرض کہ جو کچھ زمانہ حال کے سپیکر  
تعلیم کے متعلق عام مجموعوں میں بیان کرتے ہیں اس میں شاید ہی کوئی بات ایسی  
ہوگی جن کی بنیاد سرسید نے اپنے مشن کے آغاز کی اسپچوں میں نہ ڈالی ہو اور  
گر کہ اب وہ عام اسپچوں میں معمری باتیں معلوم ہوتی ہوں مگر سرسید کی ابتدائی  
اسپچوں میں وہ عام ہندوستانیوں کے لیے بالکل نئی تھیں اور ایسی اہم اور ضروری  
تھیں کہ آج تک تمام سپیکر اسی بنیاد پر عمارت چھتے چلے جاتے ہیں۔

# شکل و شمائل، اوضاع و عادات، اخلاق و خصائل اور مذہب

## شکل و شمائل

سرسید کے چہرہ کی بناوٹ اور بدن کی ترکیب اور تمام ہیئت مجموعی ایسی واقع ہوئی تھی کہ صرف اُن کی صورت دیکھنے سے باطنی عظمت کا خیال پیدا ہوتا تھا جس نے کبھی اُن کو نہ دیکھا ہو وہ بھی بغیر کسی قسم کے تعارف کے جب پہلے ہی بار اُن کو دیکھتا ہوگا تو ضرور ایک گریٹ بین تصور کرتا ہوگا۔ یہ بات مشہور ہے کہ خود داری اور تکنت اور کسی چیز کو دیکھ کر تعجب ظاہر نہ کرنا اور اپنے تئیں لیے دے رہنا انگریزوں کی قومی خصالت ہے، مگر ایک دوست کا بیان ہے کہ سرسید جب بمبئی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا، جس وقت اُن کا چھپان ہوٹل میں پہنچا اکثر مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اپنے اپنے کمرے سے اُن کے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور جب تک سرسید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے اُن کو برابر دیکھتے رہے۔

کرنل گریم نے اُن کے چہرے کو شیرسیر سے مشابہ لکھا ہے۔ اس تشبیہ کو عموماً پسند اور تسلیم کیا گیا ہے۔ بمبئی گزٹ میں کرنل گریم کی کتاب پر جس کے اول میں سرسید کی تصویر چھاپی گئی ہے۔ ریلوے کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ وہ کتاب شروع کرنے سے پہلے سید احمد کی طرف ایک لطف انگیزوں کی کشش پاتے ہیں، تصویر کیا ہے؛ گویا ایک شیرجیسی پُررعب و باہمیت صورت کا بہادر اور دلیر بہارے ماننے کھڑا ہے ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ اُس

قدیم جنگجوئی کے زمانہ میں اس شخص کا کیا پیشہ ہوتا جب کہ مسلمانوں کی بہادری نے منجملہ انسانی ضروریات کے قوم کی تعلیم کی ضرورت کا خیال اُن کے دل پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ اُس کا جب بھی یہی پیشہ ہوتا حراب تھا۔ وہی بہادری اور الو العزیز جو اگلے زمانے میں ملک کو فتح کراتی تھی یا لوٹ مار سکھاتی تھی وہی اب دلوں کو فتح کراتی ہے اور حیل و تعصب کو تاخت و تاراج کرتی ہے۔

سرسید کو جو صریح فوقیت اور امتیاز باعتبارِ جسمانی اور دماغی قابلیت کے اپنے عام ہجمنوں میں تھا یہ ایک عمدہ شہادت اس بات کی ہے کہ جو پورند یا ازواجِ دو اجنبی خاندانوں میں متحقق ہوتا ہے اُس سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید کے پردادا ہرات کے سادات میں سے تھے جو شاہجہاں یا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں آئے تھے اور اُن کی تمہیال کے لوگ کشمیر سے بعنوان تجارتِ سلطنتِ مغلیہ کے اخیر زمانہ میں اس ملک میں وارد ہوئے، بس دونوں خاندانوں میں ادھر سے کوئی قرابت یا رشتہ نہ تھا، صرف دوستی اور ملاقات کے سبب جو سرسید کے دادا اور نانا میں تھی، اُن کے والدین کا ازواجِ وقوع میں آبا تھا اب خواہ اس کو حسین اتفاق سمجھو اور خواہ نواب دبیر الدولہ کی دانشمندی کا نتیجہ قرار دو کہ انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایسا برائے انتخاب کیا جس کے صلب سے ایسا عجیب و غریب شخص پیدا ہوا۔

## حلب

سرسید کا علیہ یہ تھا، رنگ سرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھوین جدا جدا آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، اک نسبت چہرے کی شان

کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، گلے میں دائیں جانب رسولی جو ہمیشہ وارٹھی ہیں چھپی رہتی تھی۔ چہرہ کی ہیئت مجموعی باوجود عبوس اور پُررعب ہونے کے دلکش جسم بہت فریب، لمبا قد مگر جسم کی فرہبی کے سبب میانہ نما ہڈی چکلی، ہاتھ پائو اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من، غضبان شباب میں رسول تھے اور بدن بھی زیادہ فریب نہ تھا، بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔

اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عبوس اور ڈراونا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گریم کے گفتگو کے وقت اُس سے مسرت اور زندہ دل اور گرمجوشی چلتی تھی جس طرح اخلاق میں مطلق تغیر نہ تھا اس طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی۔ زبان دلی کی تھی مگر لب و لہجہ دلی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ محض سید سے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ زبان قنیچی کی طرح جلدی نہیں چلتی تھی اور نہ زیادہ محاورے یا لعنت زبان پر آتے تھے۔

جب کسی نئے آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اور لوگوں کی طرح بات چیت کرنے کی تقریبیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالتے تھے۔ اگر دوسرا کوئی بات پوچھتا تو جواب دیدیتے ورنہ خاموش بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات اس برتاؤ سے ناواقف آدمی ان کو مغرور سمجھتے تھے مگر وہ کسی کی بدگمانی کے خیال سے اپنا نیچر نہیں بدلتے تھے۔

۱۰ سرسید کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی جس کی نسبت مذکورہ بیان تھا کہ حضرت شاہ غلام صاحب کی بہت اور توجہ سے بالکل اچھی ہو گئی تھی ۱۲۔



## امضاع و عادات

ولایت جانے سے پہلے ان کا لباس ہندوستانی وضع کارہا مگر جب ولایت کا ارادہ کیا تو مسٹر ٹین نے جو ان کے دوست تھے، انگلستان سے ان کو لکھا کہ یہاں آؤ تو ترکی لباس پہنکر آنا۔ اگر یہاں ہندوستانی لباس میں آنے تو یہاں کے لوگ تماشائے بنا لیں گے۔ یہ ظاہر انھوں نے اسی وجہ سے ترکی لباس اختیار کیا تھا مگر درحقیقت، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، یہ تبدیل لباس کا ایک مہمانہ تھا، وہ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک قومی لباس کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کر چکے تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ترکی لباس سے بہتر کسی لباس کو نہیں سمجھا تھا۔

یورپین طریقہ پر پودو باش رکھنا، کوٹھی بنگلوں میں آبلوی سے اگ رہنا، میز کرسی لگا کر کھانا کھانا انھوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کر لیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ انگریزوں کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا، بڑا فائدہ اُس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں ریکہ کوئی بڑا کام بہرگز انجام نہ دے سکتے تھے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں ہو جس سے بنھانا ہے اُس کی رسموں اور طریقوں سے ایسا ملے جس سے ہو جاتا ہے کہ ان میں اصلاح کی ضرورت اُس کو کبھی محسوس نہیں ہوتی اور اگر بعض کو محسوس ہوتی تو یہ جزالت نہیں ہوتی کہ ان کو چھوڑ دیں یا ان میں کچھ تبدیلی کر سکیں، مگر سرسید کی طبیعت اس قاعدے سے مستثنیٰ تھی اور ایسی طبیعت والوں کی برواقت انسان وحشی جو پاروں کی حالت سے اس درجہ تک پہنچا ہے، غدر کے بعد جب سے کہ ان کا میل جول انگریزوں

کے ساتھ زیادہ ہوا۔ وہ اپنے ہاں کے طریقِ خورد و نوش کو ناپسند کرنے لگے اور اُس کو بتدریج بدلنا شروع کیا۔ چنانچہ اول اول وہ عرب کے طریقہ کے موافق فرش پر بیٹھ کر اور ایک چوکی پر جو زمین سے چند انچ اونچی ہوتی ہے، کھانا رکھ کر کھاتے تھے مگر ولایت سے واپس آنے کے بعد وہ میز کرسی پر کھانے لگے۔

## مہانداری

دوستوں اور مہازوں سے ان کا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا۔ جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بٹاش نہیں معلوم ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے ہیں دن اُن کے گھر عید ہوتی تھی۔ اگرچہ مہانوں کی خاطر مدارات قدیم سے اُن کی جلی خصلت تھی مگر جب سے ملگڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بنا اس وقت سے اُن کا گھر مہانہ بنا گیا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ اُن کے ہاں کوئی مہمان نہ ہو۔ رات کے کھانے پر اُن کے ہاں اکثر چمپے لطف صحبت ہوتی تھی۔ مذہبی، علمی، تاریخی اور سوشل برہمن کے سائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ مہسی اور چہل کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کھانوں میں زیادہ تغذی اور تلون نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا ملجانا تھا خوشی سے بغیر تاک منہ چڑھانے سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے سنا ہے کہ پہلے خود اک دباوہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلاناغہ پی لیتے تھے پان زروہ کھانے اور حقہ پینے کی بہت عادت تھی مگر ولایت جانے وقت پان کھانا ایک قلم ترک کر دیا تھا اور بجائے حقہ کے سگریٹ پینے لگے تھے۔

## مسکرات سے پرہیز

کسی قسم کی مسکرات کا تمام عمر میں انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ سر نے سے نو سو برس پہلے ایک دفعہ وہ سخت بیمار پڑے تھے، ڈاکٹر نے کوئی ہلکی سی شراب ان کے لیے تجویز کی، ان کے ایک دوست نے ان سے ڈاکٹر کی تجویز کا ذکر کیا، انھوں نے شراب پینے سے انکار کیا اور سو من کا یہ شعر پڑھا۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں سو من

آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

کرنل گریم کہتے ہیں کہ ”جب وہ ابینی سرسید لندن میں تھے ایک دفعہ ڈاکٹر کو آف آر گائل کے ہاں ڈنر پر بلانے گئے، جب شراب سامنے آئی تو انھوں نے کہا ”میں نوح کی شراب نہیں پیتا صرف آدم کی شراب یعنی پانی پیتا ہوں۔“

## صحتِ جسمانی

اگرچہ آخر عمر میں سرسید بقا خانے سن بیمار رہنے لگے تھے لیکن اس سے پہلے ان کی صحت ہمیشہ نہایت عمدہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں صحیح المزاج ہونے کے سبب ان کو دو مٹھانی پینے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ اگر دو وا ذرا بد مزہ ہوتی تو وہ اس پیرا نہ سال میں بھی بچوں کی طرح ناک منہ چڑھائے بغیر نہیں پیتے تھے۔ صحت و پرہیزگاری اور محنت اور کھانے پینے میں مناسب احتیاط ان سب باتوں نے ان کے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر رکھا۔ بیانیٰ اخیر تک عمدہ رہی، اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہو گئی تھی مگر دن ہو بار بار ت کھینے پڑھنے کا کام بے تکلف مثل جوان آدمیوں کے کرتے تھے۔ التیہ نسبان

بڑھ گیا تھا، دانت بھی جھو جھرے ہو گئے تھے، چلنا پھرننا اٹھنا بیٹھنا سہا  
 دشواری سے ہوتا تھا کسی جلسہ میں کھڑے ہو کر اب دو چار منٹ سے زیادہ  
 تقریر نہیں کر سکتے تھے، باوجود اس کے تصنیف اور تخریر کا کام جو نذرہ رستہ  
 ضروریہ کے ہو گیا تھا، اخیر دم تک برابر جاری رہا۔

## میلے تماشوں سے نفرت

اگرچہ بچپن اور عنفوان شباب میں ان کو میلے تماشوں کا بہت شوق تھا مگر  
 جب سے بھائی کا انتقال ہوا تھا یہ شوق گویا بالکل جاٹا رہا، صرف علمی تماشوں  
 میں مثل سبرکس یا تھیر و غیرہ کے کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے، با اینہم تھیر کو  
 ہندوستان کے حق میں نہایت مفر خیال کرتے تھے۔

## ظرافت

ظرافت اور خوش طبعی ان کی جہت میں داخل تھی مگر جس طرح ان کی اور  
 باتوں میں بناوٹ نہ تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا۔ تخریر  
 میں تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی ان کو سوجھ جاتی تھی، اگرچہ کیسی  
 ہی شرم و حجاب کی بات ہو، ان سے ضبط نہ ہو سکتی تھی۔ مگر ہر ایک امر کے  
 بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے  
 متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔ زیادہ تر ان کو ظرافت اور شوخی ان لوگوں کے مقابلہ  
 میں سوجھتی تھی جو ان کی تکفیر یا تفضیل کہتے تھے وہ ان کو کافر یا مرتد کہہ کر اپنا  
 دل ٹھنڈا کرتے تھے اور یہ اس طرح پر اپنے دل کا سناہ نکالتے تھے یا دہریوں  
 سے بھی ان کا دل بہت دکھا ہوا تھا اس لیے کبھی کبھی بالمشافہ ان سے بھی نوک

بھوک مہربانی تھی۔

ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے، کسی اسٹیشن پر دو انگریزوں کی گاڑی میں آ بیٹھے ایک ان میں سے پوری تھا، اس کو کسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے، سرسید سے کہا: ” مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا، میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا، سرسید نے کہا ” میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنی چاہتے ہیں؟ اس نے کہا ” خدا کی ” سرسید نے کہا ” سجدہ کی سے کہا ” میری تو کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے میں ان کو نہیں جانتا، پوری نے متعجب ہو کر کہا ” ہیں آپ خدا کو نہیں جانتے؟ انھوں نے کہا ” مجھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اس کو کوئی بھی نہیں جانتا، پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا کہ ” آپ اس کو جانتے ہیں؟ پوری نے کہا ” نہیں میں اس سے کبھی نہیں ملا ” سرسید نے کہا ” پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اس کو اپنے ہاں کھانے پر بلا یا ہونے مجھ کو اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اس کو میں کیونکر جان سکتا ہوں، پوری یہ سن کر خاموش سو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے، پھر سرسید سے اس نے کوئی بات نہیں کی، اگر تقریر کا سلسلہ آگے چلتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ خود اس کے عقیدے کے موافق خدا ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے ساتھ ملنا چلنا کھانا پینا لین دین انسان کے مانند ہو سکے۔

ایک دفعہ دلی کے مشنری کالج اور علیگڑھ کالج کا پیچ تھا اور دلی سے کالج کے دو پروفیسر جو پوری تھے، پیچ کھیلنے کے لیے اپنے طلبہ کو ساتھ لے کر علیگڑھ آئے تھے، سرسید نے ان کو ڈنر پر بلایا جبکہ مسٹر بک بھی ان کے ہمراہ تھے، کھانے کے بعد پوری صاحب سرسید سے مخاطب ہو کر پورے کہ

”بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے، کیونکہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسانی میں نیکی پیدا کرتا ہے۔“ پادری صاحب اسلام کو تو جس کی تعلیم علیگڑھ کالج میں ہوتی ہے، سچا مذہب کہہ ہی نہیں سکتے تھے، لامحالہ اُن کی مراد عیسائی مذہب سے تھی اور عیسائی مذہب کی بدولت جس قدر دنیا میں خونریزی ہوئی ہے اُس کی مثال کسی مذہب میں نہیں مل سکتی، سرسید نے پادری صاحب کی تقریر سن کر کہا کہ، ”دنیا میں مذہب سے زیادہ کرفی بدتر چیز اور تمام برائیاں اور جرائم کا مخزن نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر ظلم اور بے رحمیاں اور قتل اور خونریزیاں دنیا میں صرف مذہب کے سبب سے ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے ہیں وہ ایک طرف رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور برائیوں کو غلبہ رہے گا۔“ پادری صاحب یہ سن کر چپ ہو گئے اور سٹرک سے مکان پر آ کر کہا کہ میں نے تو اس شخص کو بڑا تصویر لو جین سنا تھا مگر اب معلوم ہو کہ یہ بالکل غلط تھا۔

بعض اوقات سرسید کس مسئلے کی نسبت اپنے عقیدہ کا اظہار ظرافت کے پیرا میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی مگر درحقیقت وہ اُن کی اصلی رائے اُس مسئلے کی نسبت ہوتی تھی جس زلمہ میں وہ بنارس میں تھے اُن کا ایک آرمیکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب جو بنارس میں ملازم تھے، اس آرمیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُن سے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوتی تھیں، سرسید سے اُس آرمیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے، ”کہیوں جناب، جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفہ اول کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی،“ سرسید نے کہا، حضرت



نہ ہوگی تو ان کی نہ ہوگی۔ میرا کیا بگڑے گا۔ وہ یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی سرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے ”کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جب کہ کچھ لوگ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے؟ سرسید نے کہا ”حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا، مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو سو بڑے کامیاب ہوتا۔ یہ سکر ان کا جی پھوٹ گیا اور جوتیاں پہن گھر کا رستہ لیا۔

یہ ظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پر یہ میں انہوں نے اپنی اصلی رائے مسئلہ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ ان کے نزدیک جیسا کہ انہوں نے اپنی تحریرات میں جا بجا ظاہر کیا ہے، کوئی شخص فاطمہ العیوب کے بعد من حیث النبوة ان کا جانشین نہیں ہو سکتا تھا اور اس لیے وہ کسی نئی خلافت کے ماننے یا نہ ملنے کو مزوریات دین میں سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفائے اپنے اپنے عہد میں کیا اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھیراتے تھے بلکہ خود انہیں کراؤں کا جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے۔

سرسید کے لطیفے خاص کر ان آرٹیکلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں منقرضین و مخالفین کا ذکر خیر با ان کی طرف خطاب ہے اور سب سے زیادہ ان کے پراویٹ خطوں اور رقعوں میں نظر آتے ہیں جو وہ اپنے خالص اور بے تکلف دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

ایک دفعہ جب کہ راقم بھی علیگڑھ میں سرسید کے مکان پر ٹھہرا ہوا تھا، خان مہار مولوی سید فرید الدین احمد سب آرڈنٹ جج کا رقعہ دعوت سرسید

کے نام آیا۔ رقعہ کے خاتمہ پر انھوں نے اپنا نام اس طرح لکھا تھا "جانی فرید" یعنی گنہگار فرید، سرسید نے جو اس کا جواب لکھا اس کے عنوان پر وہی الفاظ جو مولوی صاحب نے اپنی نسبت لکھے تھے، لکھ دیے یعنی "جانی فرید"۔

اس قسم کے ہزاروں چٹکے سرسید کی پبلک اور پرائیویٹ تحریروں میں ملتے ہیں جن کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ لطائف و نواور کا مرتب ہو سکتا ہے۔ مگر اس شخص کی زندگی ایسے مہتمم بالشان واقعات سے معمور ہوئی ہے کہ انھیں کا سینٹا بیوگرافر کی طاقت سے باہر ہے۔ چہ جائیکہ اُس کے لطائف و نواور کو جمع کرنا اور اس شعر کا مصداق بننا۔

”سجوں آلودہ دست و تیغ فازی ماندہ بے تمہیں“

تو خلا ہی۔ زنیپ اسپاؤز نیت بر گستاواں بینی“

سرسید کی شوخی طبعی جیسی جانی اور کبریا کے زمانہ میں تھی ویسی ہی بڑھا پے میں اخیر عمر تک رہی۔ مرنے سے چار برس پہلے جبکہ انھوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اُس کے اشتہار کے ساتھ جو انھوں نے ایک چھوٹا سا آرٹیکل بطور تمہید کے لکھا تھا اُس کے آخر میں لکھتے ہیں "گو بہلا دل کیسا ہی ٹوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ اب کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہوگا تو بُرا بھی نہ ہوگا اور اگر وہ مکاتبات دلچسپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے جو ہم ہیں اور نواب محسن الملک مولوی مہدی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور حین سے قصہ آدم یاد آ جاوے گا اور کبھی سید احمد کو حکم ملے گا کہ مہدی علی کو سجدہ کر اور کبھی مہدی علی کو حکم ہوگا کہ سید احمد کو سجدہ کرو تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ہی دلچسپ ہو جاوے گا اور خدا نہ کرے کہ اُن دونوں میں سے کوئی یہ کہے۔

مِنْ نَابٍ وَ خَلْقَتْهُ مِنْ طِينٍ ۛ

## مطالعہ

مطالعہ کی عادت ابتدا سے اُن کی رفیق رہی جس زمانہ میں وہ فمچپور سیکری میں مصنف تھے اُس وقت مولانا نور الحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سرسید کی اُن سے نہایت گہری دوستی تھی، مطالعہ کے وقت کتاب کے شکل مقالات جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے سمجھنے کے لیے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فمچپور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آئے تھے کئی برس تک بلا تاغہ اُن کا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فمچپور سا پٹے نکلان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملہ اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں بلکہ اُن کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا جو بات کتاب میں اُن کے کام کی ہوتی تھی اس پر نپیل سے نشان کر دیتے تھے۔ اور اگر کوئی مضمون کس اخبار میں کام کا ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کے فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا۔ چپاں کر دیتے تھے جو مہتمم بالشان سوالات ملک میں واٹر و ساٹر ہوتے تھے اگر اُن کے متعلق کوئی عمدہ مضمون کس اخبار میں نظر پڑتا تھا اُس کو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قائم کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اُس پر چھوٹا یا بڑا آرٹیکل لکھ کر چھپنے کو بھیج دیتے تھے جو مضمون اُن کے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے اُن کو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سناتے تھے۔ اگر نیری اخباروں کو بعض

خبریں یا نوٹس یا کوئی ضروری آرٹیکل کسی انگریزی داں سے پڑھا کر سن لیتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آئی اس کا ترجمہ کرا لیتے تھے۔

کتابیں اکثر ان کے مطالعہ میں مذہبی دیکھی گئی ہیں، تصنیف کی حالت میں صرف بقدر ضرورت یا تو کتاب خود دیکھ لیتے تھے اور یا کوئی دوسرا شخص مقام مطلوب نکال کر ان کو دکھا دیتا تھا اگر کوئی لطیف بات مضمون کتاب کے خلافت یا اس کی مویدیا اس کے متعلق ذہن میں آجاتی اسی وقت اس پر کچھ لکھا اور اخبار میں چھپنے کو بھیج دیا۔

غدر کے بعد سے پریس ہمیشہ ان کے ہاتھ تلے رہا اس لیے یہ عادت ان کی طبیعت ثانی بن گئی تھی کہ مضمون لکھنے کے بعد جب تک کہ وہ شائع نہ ہو جاتا، ان کو چین نہ پڑتا تھا۔ یہی حال کتاب کی تصنیف کا تھا۔ ادھر ایک پوائنٹ ختم ہوا اور ادھر چھپنے کے لیے بھیجا گیا۔ مسودہ پر بار بار نظر ڈالنا اور زیادہ کاٹ چھانٹ کر نا ان کا دستور نہ تھا، البتہ مسودہ صاف کرتے کے لیے وہ کاتب کو دیدیتے تھے اور جب صاف ہو جاتا تو کاتب کی تصحیح کے ارادہ سے اس کو ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔

## تصنیف کی حالت

تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آ جاتا اور زیادہ غور کی ضرورت ہوتی تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں۔ بالکل اس میں مستغرق ہو جاتے تھے، چہرہ عبوس ہو جاتا تھا، ہنسی یا تبسم پاس نہ آتا تھا، لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر ان کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی کبھی ایسے موقع پر اکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اسی خیال میں منہمک رہتے۔ جب عقدہ حل ہو جاتا

فورا چہرہ پر بشارت آجاتی۔ اگر اس وقت کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا ساتھ اس کے روبرو بیان کرتے، اگر اور لوگ بھی اس کو پسند کرتے تو خوش ہوتے اگر کوئی اعتراض کرتا تو اس پر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے۔

## خطوں کا جواب دینا

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط کہ اپنی پت سے علیحدہ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اس کا جواب لکھا جانے کو تمیرے دن وہاں سے جواب آجاتا ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو، جبکہ ان کا بزنس اور ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھتا چاہیے کہ اپنے خاص دوستوں کو مذوری کی حالت کے سواہر ہمیشہ پرائمرٹ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، البتہ مدرسہ وغیرہ کے متعلق جو خط لکھنے ہوتے تھے وہ اکثر پیشہ دست لکھتا تھا اور وہ خود بتاتے جاتے تھے۔ لیکن جو فضول تحریریں لوگ ان کے پاس بھیجتے تھے ان کا کچھ جواب نہ دیتے تھے جس خط کا جواب لکھ چکے اسے اس کو فورا چاک کر ڈالتے تھے کبھی انہوں نے کسی تحریر کو اس خیال سے کہ اس کو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے، اپنے پاس دستاویز بنا کو نہیں رکھا۔ جب کسی خالص و مخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آتی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ برابر ہمارا پرتا یا خط پر خط بھیجتے رہتے، جو خط کہ وہ اپنے بے تکلف اور خالص اور مخلص دوستوں کو لکھتے تھے ان کا انداز تحریر فی الواقع ایسا دلکش اور دلشین ہوتا تھا کہ اگر اس کو جادو یا افسوس یا حب کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے ان کے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اگرچہ

امید نہیں ہے کہ ان کا دسواں حصہ بھی اب فراہم ہو سکے لیکن جس قدر دستیاب ہوں ان کا جمع کرنا نہایت ضروری ہے، وہ ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو غیروں کو اپنا بنانا اور ویشیوں کو رام کرنا سکھائے گا۔ وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہوگا، وہ آئندہ نسلوں کو یاد دلانے گا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ربا اور کیسے محبت والے ہوتے تھے؟ کس طرح دوستوں کا دل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے؟ اور کیونکر انکے دلوں کا سکار ہوتے تھے؟

جب وہ ولایت سے ہندوستان آنے کو ہیں انھوں نے مولوی مہدی علیخان کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہے اس میں لکھتے ہیں کہ ہر چہ تھی پانچویں کوالہ آباد پہنچ کر آپ کے دیوارِ فرحت آثار سے مشرف ہوں گا اور آپ کے قدموں کو شل نعلین بوسہ دوں گا۔ اگرچہ آپ کے قدم میرے ناپاک لبوں سے ناپاک ہو جاویں گے مگر امید ہے کہ آپ مرحمت سے دھولیں گے، غنیزہ پر خود ناپاک ہے مگر جس ناپاک چیز کو وہ مس کرے دھونے سے پھر ناپاک ہو سکتی ہے۔

وہ افسوس میں تے غلطی کی جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہ دی، وہ تو مجھ سے بہت اعلیٰ ہے خدا نے اس کو یاد کیا ہے، مجھے تو سوائے مہدی علی کے اور کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔

اس کے بعد مولوی مہدی علی کی تحریرات جو اخبار میں کچھ سرسید کے موافق اور کچھ مخالف چھپی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جو جو مقام مجھ کو اس میں کھٹکتے ہیں (یعنی جو میرے خلاف ہیں) اس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی سو اگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا و بے نظیر ہاتھی اس کی آؤگی میں آن پھنسنے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ بچکنے والا نہیں۔ یہ ایک معمولی مثال ہے ان محبت آمیز باتوں کی جو سرسید کی دو شانہ تحریروں میں عموماً دیکھی جاتی ہیں اور اس بات کی تصدیق سید مہدی علیخان سلیم اللہ خود کریں گے کہ وہ فی الواقع سید کی آؤگی میں پھنسنے والے نہیں اور پھنکر اس سے بچنے کا ان کو موقع ملایا نہیں؟



# محنت و جفاکشی

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے اُن کو کام کرنے کی عادت رہی اُن کے قوی ہیں میں نظر مشکلات کے برواقت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیا اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً اُن کی غیر معمولی ذہانت بھی اُن کی دائمی غور و فکر اور دائمی محنت کا نتیجہ تھا کیونکہ بچپن میں جیسا کہ خود سرسید کے بیان سے معلوم ہوا ہے، وہ باعتبار ذہانت وجودت کے اپنے ہوشوں میں کچھ امتیاز نہ رکھتے تھے، مگر چونکہ انہوں نے اپنے تمام قونے سے جو خدا نے تعائے نے اُن کے نفس میں دو بعیت کیے تھے، پورا پورا کام لیا تھا اس لیے اُن کے ذہن اور حافظہ اور عقل سب کو جلا ہو گئی تھی کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا، جب اُس سے بڑے بڑے کار نمایاں ظاہر ہوتے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اتنی نئی باتیں کیوں نہ نکالیں تو اس نے یہی جواب دیا کہ وہیں استقلال کے ساتھ برابر غور کرتا رہا ہاں محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکما کو شبہ ہو گیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفس کوئی چیز ہے یا نہیں؟

میرحال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کی جلا کرنے والی اور اُن کو ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی اُن کی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا سرسید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ ”جس زمانہ میں سید صاحب دہلی سے رہنمائی بدل کر گئے ہیں میں بھی اُن کے ساتھ گیا تھا وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نواز شعلی صاحب سے من کو دہلی سے ہمراہ لے گئے تھے سبقت

پڑھتے تھے، بیس بیس بانیس بانیس صغیے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے، میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے کے لیے گیا تھا مگر اس رفتار سے ان کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس واپس چلا آیا۔ سوتی کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قبولہ کرتے تھے، پھر کچھری جاتے اور شام تک کچھری کرتے۔ وہاں سے آکر شام کے کھانے اور غازوں سے فارغ ہو کر سو جاتے، کوئی تین ساڑھے گھنٹے سوتے تھے، اس کے بعد ہمیشہ بلا ناغہ اٹھ بیٹھے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے جب تک میں رتبہ میں برابر ان کا یہی قاعدہ دیکھا۔

یہ تو اس زمانہ کا حال ہے جب عمر سب کی عمر ۲۶ برس کی تھی، اس سے آٹھ نو برس بعد مراد آباد اور غازی پور میں بھی جبکہ وہ نمینین الکلام لکھتے تھے، ان کی محنت کا حال، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اسی کے قریب قریب تھا۔ ولایت میں خطبات احمدیہ کے لکھنے میں انھوں نے ڈیڑھ برس برابر ایسی محنت شاقہ کی جس سے آخر کار ان کے پانوں میں ایک مرض پیدا ہو گیا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا، ان کے پانوں اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلووں میں درد ہو جاتا تھا مہینے مہینے دو دو مہینے برابر تکلیف رہتی تھی، چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی باوجود ان مشکلات کے انھوں نے خطبات احمدیہ کو ولایت ہی میں پورا کیا اور وہیں چھپوایا۔

جس زمانہ میں وہ سائٹنگ سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا، شام تک لوہلی تھی، وہ کچھری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور ظہر و عصر اور مغرب کی غازیوں میں پڑھتے تھے۔ ان کے دوست محمد سعید خاں بیان کرتے تھے کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لیجاتے تھے، میرا گرمی اور لٹکے بازے بڑا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سا رادھوپ

اور لو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدوروں میں بسر کرتے تھے۔  
 اخیر زمانہ میں جو کہ شجرت کا زمانہ تھا، ان کی محنت جو انی اور کہولت کے  
 زمانہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ وہ اس پیادہ سیاح کی طرح جو سرد سیر  
 ملک میں سیاحت کے لیے داخل ہو، جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے، اسی  
 قدر ان کی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ ان کا اس عارفانہ مقولے پر پورا پورا عمل  
 تھا کہ " ضاعف فی الکبرھمتک فان وقتک قد دنا و عما قلیل مثل سحی " یعنی بڑھاپے  
 میں اپنی ہمت و وچند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آ پہنچا ہے اور عنقریب تیری بلاؤ  
 ہونے والی ہے۔

وہ تقریباً ہمیشہ صبح کے چار بجے سے شام کے آٹھ بجے تک برابر جاگتے اور  
 مختلف کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ دوپہر کو سخت بیماری کے سوا کبھی پیگ  
 پر جا کر نہ لیٹتے تھے۔ اگر کبھی رات کو نیند نہ آتی تو اور دن کو نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو  
 بھی وہ اپنی نشستگاہ سے نہیں اٹھتے تھے جو ایسا ہی نیند کا شمار ہوا تو وہیں کرسی  
 یا تکیہ کے بہار سے ذرا کر سیدھی کر لیتے تھے، اگر اس میں کبھی آنکھ لگ گئی  
 تو ذرا سی آہٹ سے فوراً کھل جاتی تھی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے چونکہ  
 بڑھاپے اور زیادہ عمر ہی کے سبب وہ اپنے میں پھرتی اور چالاک کی قابلیت نہیں  
 دیکھتے تھے اس لیے جن کاموں میں پھرتی کی ضرورت ہوتی تھی ان کے لیے بہت  
 پہلے سے تیار ہو جاتے تھے۔ ریل پر وقت سے دو دو گھنٹے پہلے جا بیٹھتے تھے  
 کسی ڈنر یا دعوت یا جلسہ یا دربار میں جانا ہوتا تو وقت معین سے بہت پہلے تیار  
 ہو بیٹھتے تھے، کسی حاکم اعلیٰ کو ایڈریس دینی ہوتی تھی تو دس دس بارہ بارہ روز پہلے  
 سب کام لیس کر رکھتے تھے، غرض کہ ہر ایک کام کی تیاری وہ اس وقت سے  
 شروع کرتے تھے جب کسی کو اس کا سامان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ جوائن کا ایک لازمی مشغلہ تھا۔ مدرسہ کے متعلق تمام اہم اور ضروری کام یا تو خود اپنی ذات سے کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں اپنے پیش دستوں سے لیتے تھے مثلاً مدرسہ کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ بنانا اور اُس کا خلاصہ گورنمنٹ میں بھیجنے کے لیے مرتب کرنا۔ سال تمام کی رپورٹ لکھنی، ہر دوسرے تیسرے مہینے اجنڈا تیار کرنا اور اُس کے تمام کاغذات چھپوا کر ٹریسٹیوں کے پاس بھیجنے اور اُن کو ووٹ بھیجنے کے لیے اکثر کئی کئی دفعہ تقاضے کے خط لکھنے پھر ہر ایک جلسہ کی رونماؤں لکھ کر اور چھپوا کر ٹریسٹیوں کے پاس بھیجنے، گورنمنٹ سے ہر رشتہ تعلیم سے، طالب علموں کے مربیوں سے، بینک سے اور ٹریسٹیوں سے وقتاً فوقتاً کتابت کرنا، روزانہ آمدنی اور خرچ کو روزنامہ میں درج کرنا عمارتوں کے نئے تجویز کرنے اور اُن کے موافق ہر ایک عمارت کو اپنی نگرانی میں تیار کرانا، اُن کے لیے ہر قسم کا سامان اور مصالح اپنی رائے اور تجویز سے منگوانا، ہر ایک عمارت کے لیے مناسب کتبہ یا تاریخ تجویز کرتی اور اُس کو اپنے اہتمام میں کندہ کرانا، تیار شدہ عمارتوں کی تابعدار خبر رکھنی اور اُن کے نقصانات کا تدارک کرنا، کالج اور تعمیر کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کرنے کی منتہی تدبیریں سوچنی اور اُن تدبیروں کے موافق عمل درآمد کرنا اور اخبار اور خطوط کے ذریعہ سے چندہ کی تحریک کرنا اگر روپیہ بہم نہ پہنچے تو قرض سے مدرسہ کا کام چلانا، کالج یا بورڈنگ ہاؤس کے انتظام کے متعلق جب کوئی شکایت گزرے تابعدار اُس کے تدارک کی فکر کرنا اور جب کوئی مناسب یا ضروری تجویز منظور ہو جائے اُس کے پورا کرنے کے لیے ہر قسم کی تدبیر عمل میں لانا اور اخبارات جو اطراف و جوانب سے آتے تھے اُن سب پر ایک نظر ڈالنا اور بعض انگریزی اخباروں کو کسی اپنے پیشدست سے پڑھا کر سنا ہمیشہ قوم کے

اہم معاملات سے جو اخباروں میں درج ہوتے تھے، نوٹس لینا اور اپنے اخبار میں ان پر بحث کرنا اور بعض ضروری کا ترجمہ انگریزی میں کرنا کبھی اپنے اخبار اور کبھی کسی معتبر انگریزی اخبار میں شائع کرانا، ہفتہ میں دو بار اخبار کے پروفوں کا خود صحیح کرنا، اپنی یا دوستوں کی کتابیں جو فروخت کی غرض سے مدرسہ کے فائدہ کے لیے ہمیشہ چھپتی رہتی تھیں یا کانفرنس کی رپورٹیں اور لکچر یا کالج کا بجٹ یا رپورٹ سال تمام یا ٹریشیوں کے اجلاس کی روائیادیں غرض کہ جو کچھ ان کے اہتمام میں چھپتا تھا سب کی کاپیوں یا پروفوں کا اصل سے خود مقابلہ کرنا اور آپ ان کی تصحیح کرنا اور اپنے سامنے ان کے پکیٹ بنوا کر مطبع میں بھیجنا، مدرسہ کی سب رتی کتابوں کے خود اشتہار چھپوا کر ان کو آپ فروخت کرنا اور ان کا حساب کتاب رکھنا، کالج کے متعلق تمام حساب کتاب کے رجسٹروں، بجٹوں، رپورٹوں اور روائیوں وغیرہ کی اور کالج لائبریری کے متعلق اونٹیل زبانوں کی کتابوں کی جلدیں بند ہوا کر الماریوں میں اپنے سامنے احتیاط سے رکھوانا، یور وپین حاکم اور انسر اور ارکان سلطنت جو اکثر کالج کے ملاحظہ کو آتے رہتے تھے ان کی مدارات اور استقبال و مشایعت کا خود انتظام کرنا، ان کے دربار کیلئے ہال کو خاص اپنے اہتمام میں آراستہ کرنا، ان کے واسطے ایڈریس تیار کرنا اور اس کو انگریزی میں ترجمہ کرنا اور چھپوانا اور پھر ایڈریس اور اس کا جواب اور تمام جلسہ کی کارروائی کو اخبار کے ذریعہ سے شائع کرنا اور ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر خواہ اس کا اجلاس علیگڑھ میں ہو اور خواہ کسی دوسرے شہر میں، سب کام چھوڑ کر آٹھ دس روز تک برابر اس کارروائی اور انتظام میں ہر وقت مسرور رہنا، یہ اور اس قسم کے بیچارے بڑے کام یہ شخص اس ضعیفی کے زمانہ میں سرانجام کرتا تھا۔ اگر ان تمام کاموں سے قطع نظر کی جائے اور صرف چندہ جمع کرنے اور اس کی تدبیریں سوچنے ہی کے کام پر غور کیا جائے



تو یہی ایک کام تھا کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کو اپنے ذمے لے لیتا تو پھر وہ اور کسی کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔ تعییرات کا کام بھی آسان کام نہ تھا جس کے لیے کم سے کم ایک لائق اور سیر رکھنے کی ضرورت تھی مگر سرسید نے یہ بوجھ بھی اپنے سر دھرایا تھا یہاں تک کہ سات آٹھ لاکھ کی عمارت صرف اپنی تجویز اور اپنے اہتمام سے نوا ڈالی۔ باوجود ان تمام بکمیٹیوں کے وہ اپنی خاص طرز کی تصنیف کا نہایت کٹھن اور شوار گزار مرحلہ بھی اعضاء مشغلوں کے ضمن میں طے کرتے تھے۔ دوستوں کے بے شمار خطوں کے جواب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، مہمانوں کی حالت کے موافق ان کی آسائش کا انتظام کرتے تھے، ان کے لانے کے لیے مختلف اوقات میں ریلوے سٹیشن پر سواری بھیجتے تھے اور جب تک ان کا قیام رہتا تھا ہر وقت ان کا خیال رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جو مستعدی اور محبت اور ہر ایک بات کی خبر داری اور ہر ایک فرض کی نگہداشت اس شخص میں بڑھا ہے میں دیکھی گئی ہے وہ کسی توانا اور تندہ دست نوجوان میں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ ایک محض ناواقف شخص بھی صرف اس کے روزمرہ کے کام دیکھ کر اس قدر ضرور سمجھ سکتا تھا کہ اس شخص کی خلقت معمولی آدمیوں کی خلقت سے جداگانہ تھی۔ بتنی نے کیا خوب کہا ہے۔

وَإِذَا كَانَتِ النَّفُوسُ كَيْدًا      تَعْبَتْ فِيهَا إِدْهَاءُ الْكَيْدِ سَامِدًا

یعنی جب نفوس انسان اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں تو اعضائے انسانی ان کے ادا سے پورے کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔

باوجود اس قدر مصروفیت اور کاموں کی کثرت کے ان کی زندہ دلی نہایت نخب خیز تھی۔ وہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا رنج اور افسردگی کو کبھی پاس نہ آنے دیتے تھے اور خانگی بکمیٹیوں اور خزانوں سے تا بمقدور ساگ تھک رہتے



تھے۔ جس طرح اُن کے باپ گھر کے تعلقات سے آزاد تھے اسی طرح سرسید اپنے پرائیویٹ معاملات سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے اور یہی اثر اُن کی اولاد میں پایا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ قومی کاموں کے متعلق کوئی کیسا ہی معقول عذر کرے اور مکروہات خانگی کے سبب کیسی ہی مجبوری بیان کرے وہ ہرگز نہ سنتے تھے اور جب تک سب کام چھوڑ کر اُن کی فرمائش پوری نہ کی جاتی تھی وہ کسی عذر کو قابل سماعت نہ سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچپن سے، پڑھوں سے جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے انگریزوں سے اور ہندوستانیوں سے بشرطیکہ دل ملا ہوا ہو اور کسی طرح کی مغایرت نہ ہو، ہنسی اور خپل کینے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو اُن سے ایسی سخت محنت کراتی تھی اور تکان اور ماندگی اور ملال و کلاں کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی مگر چہ جس زمانہ میں ہم نے اُن کو دیکھا ہے اُن کی ہنسی اور چہل صرف باتوں میں رہ گئی تھی مگر جیسا کہ سنا گیا ہے ابتدا میں اُن کی شوخیاں صرف بات چیت ہی میں محدود نہ تھیں۔ کرنل گریم جو اُن کے قدیم دوست تھے لکھتے ہیں کہ وہ اس قدر خوش طبعی اور تسخیر کرتا ہے جس قدر کہ کوئی آدمی کر سکتا ہے۔ کبھی رات کے وقت ایک رشتی سے سانپ سانپ کہہ کر حاضرین کو ڈرا دینا، کبھی نہایت بھیانک اور ڈرا دنی آواز سے اونگھتوں کو چونکا دینا، کبھی کسی سوتے ہونے کی چھاتی پر چڑھ کر اٹس پٹا پٹا سا راجھ ٹال دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جن میں سے بعضی بیان نہیں کی جاسکتیں اُن کے دوستوں سے سُنی گئی ہیں۔

بعض اوقات اُن کے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی اُن کو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انھیں شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ کبھی بُرا نہ مانتے

تھے بلکہ خوب قبیبے لگاتے تھے اور خوش ہونے تھے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم نے اس امر کے متعلق ایک دلچسپ نقل بیان کی، وہ کہتے تھے کہ "حافظ عبدالرحمن جو ۷۵ برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ ریشک میں بھی اُن کے ساتھ تھے اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلبت تنخواہ کے سبب اُن کو اپنے پاس رکھتے تھے اُن سے اکثر ہنسی چیل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، حافظ جی اپنی ترقی کے لیے اکثر کہا کرتے مگر چونکہ ترقی کی گنجائش نہ تھی، سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کہیں اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بد صورت ہو اور بد صورت کبھی خوش نہیں ہو سکتا، ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں، آپ کا خط کیوں اچھا نہیں؟ سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی بد صورت ہو گیا ہوں۔ پس میرا خط کیونکہ اچھا ہو سکتا ہے۔"

"ایک دن سید صاحب نے حافظ جی سے کہا بھلا صاحب! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سید صاحب اُن کے کرتے تھے، بیان کیے کہ میں آپ کی بڑی خاطر کروں، و دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں، رات کو آپ کا پٹنگ اپنے پٹنگ کے برابر پھراؤں اور چٹا کروں اور جنسی کروں، سید صاحب نے کہا ان باتوں کو جانتے وہ یہ تباؤ کہ مجھے عہدہ کیا دو؟ حافظ جی نے ذرا دکھی صورت بنا کر کہا حضرت! میں مجبور ہوں چونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اس لیے کوئی عہدہ نہ دے سگوں گا، سید صاحب اور ہم سب لوگ یہ گرم فقرہ سن کر پھڑک گئے اور بہت دیر تک بنتے رہے" غرض کہ سر سید نے تا بقدر کہیں غم اور رنج کو پاس نہیں آنے دیا، شہر میں بیروہ سجات میں آبادی میں، جنگل میں جہاں کہیں ہوئے انھوں نے اپنی خوشی

اور دل لگی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور دہنیا کر لیا۔

وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو وحشت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھیں وہ ان میں باقی نہ رہتی تھی، انھوں نے اپنے بھتیجے کو اپنے بیٹوں کو اور اخیر عمر میں پوتے کو اپنے سے ایسا مانوس رکھا کہ ماںیں بھی بچوں کو اپنے ساتھ ایسا مانوس نہیں رکھ سکتیں، ان کا بڑاؤ ان سب کے ساتھ یا نکل ایسا یا راجیسا یا راجیسا کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے، مراد آباد میں ان کے بھتیجے کو کلکتے لڑنے کا شوق حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ سرسید چاہتے تھے کہ یہ دھت جاتی رہے مگر اس پر حیر کرنا گوارا نہ تھا، آخر لاپارہہ ہو کر ایک دن کہا کہ بھئی آج تمہاری پتنگ بازی کی ہم بھی سیر دیکھیں گے، شام کو جب کہ بیچ پڑ رہا تھا اور دونوں طرف سے ڈھیل دی جا رہی تھی، آپ بھی وہاں پہنچے اور ہاتھ بڑھا کر چلتی ڈور کو تھام لیا اور جب بیچ کٹ گیا تو پکار پکار کے کئی دفعہ کہا، ہم ہارے ہم ہارے، یہ دیکھ کر فریق ثانی کا جوش کم ہو گیا دوسرے دن کوئی ادھر سے پتنگ لڑانے کو نہ اٹھا اور پتنگ بازی کا خاتمہ ہوا۔

سرسید کی ذہانت بھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ان کی گاتار محنت اور متصل داعی مہانت کا ایک نتیجہ تھا، ایک یورپین مصنف نے لکھا ہے کہ ”میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو بڑے ذہین مشہور تھے لیکن آخر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اصل میں بڑے مختی تھے، سرسید کی ذہانت کی نسبت ایک انگریز نے سید محمود سے کہا کہ ”تمہارے باپ کا دماغ کیا ہے گویا ٹائپ کے حروف کی الماری ہے، جس طرح اس الماری میں جس حرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتا ہے اسی طرح ہر سوال کا جواب اس کے دماغ میں ہر

وقت موجود رہتا ہے۔ فی الواقع سرسید کے انتقال ذہنی کا یہی حال تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہر ایک ضروری سوال پر جو لاک میں دائرہ سائرس مہرتے تھے بجائے خود غور کر کے اس کی نسبت ایک نچترہ رائے قائم کر لیتے تھے اور اس لیے جب وہ سوال معروض بحث میں آتا تو ان کو اس کا جواب دینے میں زیادہ تامل کرنا نہیں پڑتا تھا اور یہ کہ داعی ریاضت اور برابر غور و فکر کرنے کی عادت نے ان میں یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر سوالات کی نسبت اونے تامل سے ایک بخیدہ اور معقول رائے ظاہر کر سکتے تھے۔

بہر حال یہ تمام نتیجے داعی غور و فکر اور نور و نظرت کے روشن رکھنے اور آپ اپنی تعلیم کرنے کے تھے۔ تقلید کی عادت، خواہ اس وقت بھی ہو، خواہ مسائل علمی میں اور خواہ معاملات دنیوی میں، انسان کو کبھی اپنے اوپر بھروسا اور اعتماد کرنے نہیں دیتی، وہ ہمیشہ بچوں کی طرح جو چلنے میں اوروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں، ہر معاملہ میں دوسروں کا منہ تکتا رہتا ہے۔ سرسید کو زمانہ کی ضرورتوں نے اول مذہبی تقلید سے نجات دی جس سے ان کو مذہبی مشکلات میں اپنی طبیعت پر زور ڈالنے اور اپنی رائے اور سمجھ پر تکیہ کرنے کی ضرورت اور عادت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ عادت ان کی طبیعت ثانی ہو گئی اور ہر قسم کے سوالات پر غور کرنا اور سوچنا اور اپنی مستقل رائے قائم کرنا ان کا دنیوی ہو گیا اور اس طرح ان کے قوائے عقلیہ بتدریج جلا پانے لگے۔

سرسید کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر جنہیں کا سب سے بڑا ثبوت ان کی مذہبی تحقیقات یا وہ تدبیریں ہیں جو ان سے مدرسہ العلوم کے قائم کرنے اور اس کی ترقی دینے میں ظاہر ہوئیں اور جن کا ذکر اس کتاب میں بعد ضرورت اپنے اپنے موقع پر ہو چکا ہے، اور اگر کسی کو ان کی عالی داعی کی مجسم تصویر

دیکھنی ہر قوم سید محمود کو دیکھ لینا کافی ہے جن کی نسبت مسٹر ڈائٹلی سٹوکس بیگل ممبر  
یجسٹریٹوں کو نسل و اسیرائے کشور ہند نے کونسل میں یہ الفاظ کہے تھے " نہایت  
نامور باپ کا نامور بیٹا " ہم یہاں صرف ان کے بعض لطیف خیالات کا ذکر کرتے  
ہیں جن سے ان کی طبیعت میں ایک خاص تناسب نمون لطیفہ کے ساتھ پائی  
جاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منجملہ اور بے شمار تدبیروں کے جو چندہ وصول کرنے  
کے لیے انہوں نے وقتاً فوقتاً اختیار کیں ایک تدبیر نواب مختار الملک مرحوم کی  
خدمت میں اس تصویر کا بھیجتا تھا جس میں مسلمانوں کی حالت کو ایک تباہ شدہ  
جہانزہ کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اور مدد ستر العلوم کو ایک کشتی کی شکل میں دکھایا  
تھا جو جہانزہ والوں کو اس تباہی سے نکالنے کے لیے جہانزہ کی طرف آرہی تھی اس  
تصویر کی مفصل کیفیت پہلے حصہ میں بیان ہو چکی ہے، یہاں صرف یہ حبت انا  
ہے کہ سرسید کا ذہن کیونکر اس خیال کی طرف منتقل ہوا! انہیں دنوں میں یہاں

۱۔ یہ وہ مشہور اور نامور بیگل ممبر کونسل قانونی و انسرنے کشور ہند بن جو ۲۰ برس کونسل ہند میں اول سکرٹری  
اور پھر قانونی ممبر ۱۰ اینگلو انڈین کوڈ مشنری میں ان کا یہ نقرہ درج ہے کہ "مجھ کو استعانت کے زیادہ  
ذریعے ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے ہوئے ہیں جو اٹھ پندرہ پورٹ میں سلاخ سے لگے تاک  
چھے ہیں، یہ ایسے فیصلے ہیں جو اہل ہند کے رسوم و عیالات ہی پر روشنی نہیں ڈالتے بلکہ عموماً اگر سبیل  
یہ کہنا گستاخی نہ ہوا اپنے لاعمل استدلال اور علیت کے لحاظ قابل تعریف ہیں، امدان میں  
سے کسی فیصلہ کے پڑھنے سے یہ نسبت ان فیصلوں کے زیادہ لطف اور زیادہ فائدہ حاصل نہیں  
ہو سکتا جو موثر سامی اباد ہند اور سید محمود مسلمان کے ہیں، جن قوموں میں ایسے مقنن پیدا ہوئے ہوں  
ان کی کیسے کوئی قانونی اصول ایسا ایک اور وقت نہیں ہو سکتا جو ان کو دشوار معلوم ہوا اور کوئی  
طریقہ عمل درآمد قانونی ایسا بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے فہم سے باہر ہو ۱۲۔



مدرسۃ العلوم پر ایک نظم لکھی گئی تھی جس میں ایک یہ شعر بھی تھا:

دور سے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے

ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

ظاہر اسر سید کو اس تصویر کے بنوانے کا خیال اسی شعر کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا کیونکہ یہ نظم اس تصویر کے بھیننے سے پہلے شائع ہو چکی تھی مگر شاعر کا خیال ایک عقیم اور غیر منتج خیال تھا جس میں اس سے زیادہ کوئی کرشمہ نہ تھا کہ ایک معقول شے (یعنی تعلیم) کو ایک محسوس چیز (یعنی سفینہٴ نجات) کے ساتھ تشبیہ دی گئی تھی لیکن جو مضمون اسر سید نے اس سے استنباط کیا اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، نواب مختار الملک کے دل میں جن کو اس وقت تک قومی معاملات سے چنداں دلچسپی نہ تھی، کالج کی محبت کا بیج بویا گیا جو رفتہ رفتہ ایک گھنا اور سرسبز اور سایہ دار درخت بن گیا۔

اسی قسم کی دوسری مثال وہ کہیں تھا جس میں سر جان اسٹریچی کو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت کالج کمیٹی کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تھا اور جس کو اسر سید نے خاص اپنی تجویز سے بنوایا تھا۔ اس کہیں پر ان جانوروں کی تصویریں کچھوائی گئی تھیں جن کے نام پر زماشہ جاہلیت میں عرب کے نام رکھے جاتے تھے اور اس لیے عرب کے بہت سے قبیلے انھیں ناموں سے مشہور تھے، جیسے قریش یا قریش (ویل مچھلی)، ثعلب (لوٹری)، کلب (گنا)، حمل (اونٹ)، اسد (تیر، ڈوب) اور بھیریا، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان سب تصویروں کے منہ سے بہانے سانس کے ایک ایک تار نکالا گیا تھا اور یہ سب تار ایک مقام پر جا کر ملتے ہوئے تھے جہاں انگریزی الفاظ میں یہ مطلب ادا کیا تھا کہ "ہم سب قبیلے متفق اللفظ سر جان اسٹریچی کا شکر یہ تہ دل سے ادا کرتے ہیں" اور اس سے گریا تمام مسلمانوں



کی شکر گزاری کا اظہار مقصود تھا۔

اسی قبیل سے کھجور اور اونٹ کی تصویر ہے جو سب سے پہلے سرسید نے انگریزی خطبات احمدیہ کے ہر ایک خطبہ کے سرے پر ولایت میں چھپوانی تھی۔ اور جو عرب کی خصوصیات میں شمار ہونے کے سبب ایک علامت دین اسلام کی قرار دی گئی تھی۔ اس میں سے کھجور کی علامت ہم نے پچھلے دنوں میں ایک چین کی تشریح پر بنی ہوئی دکھی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کتاب کو دیکھ کر ولایت کے کسی کارخانہ دار نے یا مارک ان فنڈ کے لیے اختیار کیا ہے جو مالک عرب میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اسی قبیل کا وہ نشان ہے جس میں ہلال اور صلیب کو جو تاج قبیری میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جمع کر کے مدرسۃ العلوم کے کتبوں اور اس کے کتب خانہ کی کتابوں پر مشیت کیا گیا ہے اور جس سے اسلام اور کچھ نئی کی مصالحت اور تاج قبیری کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار مقصود ہے۔ ایک اور مثال سرسید کے انتقال ذہنی کی سنہ نبوی کا بجائے سنہ ہجری کے قرار دینا اور تہذیب الاخلاق کا سال ماہ شوال سے شروع کرنا ہے۔ ظاہر سرسید سے پہلے سنہ نبوی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں گورا۔ جس زمانہ میں کہ سرسید آئین اکبری کی تصحیح کرتے تھے اس میں ایک جگہ سنہ ہجری کی نسبت ابو الفضل کا یہ قول ان کی نظر سے گذرا تھا کہ "از یہ سنہ ہونے ناکامی سے آید" یعنی یہ سنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مہاجرین کی ان مصائب کو یاد دلاتا ہے جن کے سبب ان کو وطن مالوف چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں سرسید نے ابو الفضل کے ان الفاظ سے بہت متاثر تھا اور اس کے حاشیہ پر قائل کی نسبت لعلت یا اس کا کوئی مرادف لفظ لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ابو الفضل کے اسی بے ادب جملہ سے ان کے دل

میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تہذیب الاخلاق کا سال تاریخ بعثت سے شروع کیا جائے کیونکہ درحقیقت اسلام میں کوئی واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کے برابر عظیم الشان نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ جو سنہ تیرہ سو بیس تک مسلمانوں میں متداول رہا ہو اس کی جگہ کوئی دوسرا سنہ قائم ہو سکے مگر اس نظر سے کہ سنہ نبوی تاریخ بعثت ختم المرسلین کو یاد دلاتا ہے اگر مسلمان کم سے کم سیر اور اسما الرجال کی کتابوں اور قومی میگزینوں وغیرہ میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ نبوی بھی لکھا کریں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح سب سے پہلے سرسید جی نے اس غلطی کو محسوس کیا تھا جو سنہ فضلی اور سد علی میں فرق نہ کرنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے حصہ باب ۲ میں بیان کر چکے ہیں، تاریخ مجنورہ میں انھوں نے ان مشکلات کو گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا جو اس غلطی سے لازم آتی تھیں۔ اگرچہ وہ تاریخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی مگر ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں جو سرکلر گورنمنٹ نے اس غلطی کے تدارک کے لیے جاری کیے ان سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اسی تحقیقات کا نتیجہ تھا جو سرسید نے تاریخ مجنورہ میں درج کی تھی۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ان کے ذہن کی جودت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے مگر یہاں بطور نمونہ کے اسی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

## اخلاق اور خصائل

سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ جو کسی کی تعریف میں بولے جاسکتے ہیں اس کے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے۔ لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے عمل پر نہیں ہوتا کیونکہ

لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے، یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسید میں جس طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح اس کو خدا تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کیے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل۔ لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی راپوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اس کے اخلاق و ذائل سے بالکل پاک معلوم ہوتے تھے اسی لیے مٹربک نے اس کے مرنے کے بعد اپنی اسپچ میں کہا تھا کہ "اگر اس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق ان سے بھی بڑے تھے۔"

ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو، بات کا پکا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، محنتی ہو، صاحب استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے۔" اس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھادی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسید کے حق میں جاسم و مانع ہوگی۔ جو اختیار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا، جس قدر اس کے دوست اور ملنے والے تھے سب اس کے مداح اور ثنا خواں تھے، سب اس سے ہمت رکھتے تھے، سب کو اس پر اعتبار تھا اور سب کو اس کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا ہی شاق گوارا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں کو اپنے مرتبی اور سرپرست کا مرنے کا شوق گزرتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حین اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اس کی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اس کو اپنے مقاصد میں

ہوئی کیونکہ بیادقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں جب تک اُن کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاق نہ ہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔

اُس نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے پہلے لائف میں بسر کیے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گزرے کہ ایک زمانہ اُس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا اور دوست اور دشمن سب کو اُس کے اونٹے اونٹے کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا، مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہو جائے باوجود اس کے اسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُس کے کیرکڑ پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُس کے چال چلن میں کوئی قبہ نکالتا سوا اس کے کہ اُس کو کافر و محد و پیرسی و کرستان کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اُس پر وہ الزام لگانے لگے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا کسی سے کچھ بن نہ آیا، جیسا کہ کہا گیا ہے، رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب گناہ کافر کہا و اعظا نے انھیں اور گمراہ  
 جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ وریادقت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی مچان میں ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کیے بغیر نہیں رہتے اگر سرسید کی سچائی میں سائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اُس کو پرہت بنا دیتے مگر چند صریح تہمتوں کے سوا اُس کا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھتے سے پاک رہا، شمس العلماء مولانا ندیر احمد اور نواب محسن اللہ نے ٹھیک لکھا تھا کہ "علم بالانساب اگرچہ علم منطونوں ہے مگر اس شخص کے بارے میں تو اُس کے افعال اُس کے نسب کی تصدیق کرتے ہیں" اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید میں جہاں بہت سی

غویاں تھیں انھیں کے ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں مگر جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے وہ اُن عیوب سے جو انسان کی خصلت اور دنیاوت پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُس کے اخلاق کا اُس کے ہمنشینوں اور جلسوں پر اثر پڑتا تھا۔ اس کو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا تھا۔ اُس کی جفاکشی اور مستعدی اوروں کو جفاکش اور مستعد بناتی تھی، اس کی سچائی اور ہمت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اس کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہائی کیرکٹر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کی زندگی کے واقعات سے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں، اُن کے اخلاق کا سنجی امانہ ہو سکتا ہے مگر یہاں ہم اُن خاص خصلتوں کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کو اُن کی کامیابی میں بہت بڑا دخل معلوم ہوتا ہے اور جو اُن کے تمام افعال و حرکات و سکنات میں ایسی نمایاں تھیں کہ اُن سے شاید ہی اُن کا کوئی دوست اور ملنے والا انکار کر سکے۔

## راستبازی

اولاً راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں جیسے صدق، مودت، حمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے، کسی حکیم کا قول ہے کہ اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی۔ اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اُس نے محض اپنی

راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو صحیح جانا اس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا جس بات پر دل سے یقین کر لیا اس کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا جس بات میں کلمہ یا قوم کی بھلائی سمجھی اس کے کہنے اور کرنے میں کس کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ ان کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے کائنات کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو ان کو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اس کو متنبہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ان کا ایک دوست جو اخبار کا اڈیٹر تھا، اس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے۔ جب وہ پرچہ سرسید کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اس کو لکھا کہ "کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط وہ حقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کائنات کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اس کو بطور سچ کے ظاہر کرو؟ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کائنات بلکہ خلاف ایمان داری کے کام کیا۔ آپ مجھ کو معاف کیجیے گا، یہ سب اس کے کہ آپ سے محبت ہے یہ کر ڈی نصیحت کی ہے۔"

جب ان کے اڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اس کا جواب انھوں نے اس طرح لکھا ہے "میں اس خیال سے کہ آپ میری



کبھی تحریر کا بُرانا مانیں گے جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے، ایسی ہی پرائیوٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے :-

اُن کے ایک نہایت عزیز اور خالص دوست کو ایک زمانہ میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا تھا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا اور اس امر کی اطلاع انہوں نے سرسید کو بھی کی تھی۔ اُن کو اسی باب میں سید صاحب لکھتے ہیں بھائی ... کل میں سارے دن سترود رہا۔ کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی بلا کر پڑھ لیتا ہوں، ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالافتی اور شامت اعمال سے ایسی سُستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا، نہایت پھر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے بچاؤا کریں یا قضا کریں، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا منہ پر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بچنے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سُستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا جاسکے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر بچ جانا، اور گڑ بچ جانا، اور حضورِ نعت

ہی نہیں۔ تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا تفریق ساقی استغفار سے دیتا تھا ہمان  
کہدینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا  
تہ آپ کی کیا ہوتا؟ تو کرمی نہ میسر ہوتی، فاختے مر جاتے نہایت اچھا ہوتا والسلام  
سرستید نے ایک موقع پر دلی کے ایک نہایت مقدس عالم سے جو اپنے  
شاگردوں اور معتقدوں کو رفع یدین کی تائید کرتے تھے مگر خود کبھی ہاتھ نہیں  
اٹھاتے تھے، کہا کہ ”حضرت نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ باوجود معتدلاً  
وین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خوف سے جس بات کو دل سے حق  
جاتے ہیں اس کے موافق کبھی عمل نہیں کرتے۔ ہم ہزاروں گناہ کرتے ہیں اور  
دینا کے کردہات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اس کے کرنے  
میں ایک لمحہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے“  
سرستید کے کہنے کا ان کو ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے اسی روز جامع مسجد میں جا کر  
علی الاعلان رفع یدین کیا، لیکن معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ اس پر قائم رہے یا نہیں۔  
اس شخص نے اگر صحیح پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اردو لٹریچر میں  
سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے  
میں کسی کی طعن و ملامت سے نہ ڈریں، تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے  
سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنی چاہتے  
تھے اس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے۔ اس نے تہذیب الاخلاق میں  
مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ ٹھیکی او جھل ٹھکار کھیلنا اور اپنا نام  
پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے ان کا کوئی مضمون اس میں درج نہ ہوگا۔ چنانچہ رفتہ  
رفتہ لوگوں کی جھجک ٹھکنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ ہر شخص اپنے نام سے  
کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا اور بڑے بڑے لائق اور ذی علم اور

دین دار لوگ صد ہا مضمون عام لائے کے برخلاف اپنے نام سے شائع کرنے لگے۔  
 بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر میں اکثر آیات کے  
 معنی مجبور کے خلاف بیان کیے ہیں اس پر ان کو خود یقین نہیں ہے بلکہ صرف یہ  
 مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی رو سے کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ یہ حال سرسید  
 کو بھی معلوم ہوا، انہوں نے نہایت جوش میں لکھا کہ ”اگر دین اسلام کے  
 حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا“  
 وہ سید مہدی علیجاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں سچ اپنے دل کا حال لکھا ہوں۔ اگر  
 خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات  
 حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا“

اس نے اپنی لاسٹی اور صاف گوئی سے صرف ان مسلمانوں ہی کو مخالف  
 نہیں بنایا جو پچھلے خیالات رکھتے تھے اور جن سے کسی طرح موافقت کی امید  
 نہ تھی بلکہ جو بات اس کو حق معلوم ہوئی اس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں  
 کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے  
 یا نہیں نیشنل کانگریس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو بنگالہ  
 سے کشمیر تک سرسید کو کاب کا تپا خیر خواہ جانتے تھے، ان کی نہایت تعریف کرتے  
 تھے، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ان کی قدر کرتے تھے، اخباروں میں ان کی  
 نسبت مدحیہ آرٹیکل چھاپتے تھے، اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے ان کے سامنے  
 ایڈریس پیش کرتے تھے۔ پبلک اسپیچوں میں ان کا ذکر خیر کرتے تھے، سرسید  
 کو معلوم تھا کہ اگر کانگریس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم سے کم تعلیم یافتہ  
 ہندو قاطبہ مخالف ہو جائیں گے، مگر جب ان کو سچتہ یقین ہو گیا کہ کانگریس کی اکثر  
 خواہشیں ناممکن الوقوع اور فاسد مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں

کا اس میں شریک ہونا پولیٹیکل خطرات کا باعث ہو گا، انہوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اس کی شرکت سے روکا اور کانگریسین گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے ان کو خود غرض اور اینگلو انڈینز کا خوشامدی اور ٹائم سروے سب کچھ کہا، صدر آرمیکل بنگالی اخباروں میں ان کے برخلاف چھپ گئے، کے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب جو حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند نے ان کو عنایت فرمایا اس کو بنگالیوں نے کانگریس کی مخالفت کرنے کا صلہ قرار دیا، سٹر ہیوم جو سرسید کے دوست تھے وہ ان سے سخت بدگمان ہو گئے، بعضے ایجوکٹڈ مسلمان بھی ان کی طرف سے کھٹک گئے، مگر سرسید نے کسی بات کی کچھ پرمانہ نہیں اور جہاں تک ممکن تھا مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے نہیں دیا۔

سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ ان پر راستبازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع راستبازی کو اپنا دین ایمان سمجھتا تھا۔ جس زمانہ میں وہ ولایت میں تھے انہوں نے ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر جو اس وقت یہاں جاری تھا، ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی کی تھی، ازاں جملہ ایک دیہاتی مدرسہ کی نسبت جس کا انہوں نے ہندوستان میں خود معائنہ کیا تھا، یہ لکھا کہ مکان مدرسہ میں گائے بندھی ہوتی تھی اور مدرسہ کے سب غیر حاضر تھے۔ وہ جب ہندوستان میں پہنچا تو سر ولیم میور جو اس وقت شمالی مغربی اضلاع میں لفٹنٹ گورنر تھے، ان کی نظر سے بھی گزرا، چند روز بعد انہوں نے ایک پبلک اسپیچ میں کہا کہ میں نے ضلع میں دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی ہے کہ تعلیم کی حالت عمدہ ہے اور اس محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں جو سرسید احمد خاں کے نتائج کے مخالف ہے۔“

یہ اسپرچ مع اردو ترجمہ کے اخبار میں چھپ کر ولائیت پہنچی اور سرسید کی بھی بھی نظر سے گزری۔ ترجمہ کے الفاظ سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ سرولیم میونسپلٹی نے مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے۔ ان کو نہایت رنج ہوا اور جب ہندوستان میں واپس آئے تو آلہ آباد میں ہزار آزر سے مل کر نہیں گئے سیدھے بنارس چلے گئے ہزار آزر کے پرائیویٹ سکول کی چٹھی سرسید کے نام بنارس میں پہنچی جس میں لکھا تھا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔"

سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجوہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سید محمود کی تسلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷۔ نومبر کی تھی، سرولیم نے نوں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے:-

"مائی ڈیر سید احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا، اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کس غلط واقعہ بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں ان نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔"

نہ سرسید نے اپنے پمفلٹ میں ایک دیہاتی مدرسہ کے حاضر سے جہاں گائے بندھی ہوئی اور مدرسہ اور طلبہ غیر حاضر تھے، یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدرسہ کی، یہ حالت ہے مگر سرولیم میونسپلٹی اس نتیجہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے نہ یہ کہ جس گائے کے مدرسہ کا انھوں نے پمفلٹ میں حوالہ دیا تھا ان کا وہ بیان غلط تھا ۱۲

”مجھکو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھکو براہ راست کیوں نہ لکھا، آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھکو اور بھی سنجھتا بنے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ مجھ پر نہ کیا جس کی میں آپ سے امید کرتا تھا اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔“

مدرسٹر بریلی نے اردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی اپنے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو، استنہال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اس کے شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔“

”دو کیپٹن لنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجہ بالا خط گناہت کے حوالہ سے لکھیں گے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔“

سر سید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اٹھ گیا۔“

کرنل گریم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ: ”سر ویم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں مگر کوئی اور ویسی جہلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرنا مگر سید نے اس کو بڑھ کر ڈال دیا اور مجھکو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔“

کرنل موصوف کا بیخیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے



بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رُسنے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک سو سو مہینوں پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ ان کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفاء میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لیے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا۔ جس میں کہ سرولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی، نہایت سبک اور حقیرانہ ایک کینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمنڈر سیرٹھ کے ساتھ گزرا۔ جب سائٹنگ سوسائٹی علیگڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ ان کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم نہیں بھیکن پورے ضلع علیگڑھ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے، اس لیے وہ افتتاح کی رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سرسید سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو ہم نہیں آنے کے سرسید نے کہا: "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریذیڈنٹ بھی ہے اس کو شریک نہ کیا جائے۔" انہوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بریلی نے جو علیگڑھ میں شین بیج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے بڑی مشکل سے حساب کمنڈر کو راضی کیا اور ان کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سرسید کا اس باپ میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ ان کے نزدیک صاحب کمنڈر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک التزام سے پاک مانتے تھے۔

جن یورپین افسروں نے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کی مخالفت کی تھی یا اس کے لیے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے تھے۔ سرسید نے ان سے پراسٹیوٹ طور پر پرلٹنا جلنا ترک کر دیا تھا اور کبھی ان کے ساتھ ظاہر داری کا برتاؤ نہیں کیا، یہاں تک کہ ہم نے سٹامپے کہ جب حضور سرجان اسٹریچی ہندوستان سے ولایت کو جانے لگے اور کالج کیشی علیگڑھ کی طرف سے ان کو ایڈریس دینا قرار پایا تو جو مسودہ ایڈریس کا انعقاد جلسہ سے پہلے سرسید نے لکھ کر جناب ممدوح کے ملاحظہ کے لیے بھیجا تھا اس میں جہاں کالج کے محسنوں کا شکریہ لکھا تھا ان افسروں کی شکایت بھی صراحتہ یا کنایتہ لکھی تھی جو اس میں خلل انداز ہوئے تھے۔ اگرچہ جناب ممدوح کے ایما سے آخر کار وہ شکایت آمیز الفاظ سرسید کو مسودہ میں سے نکلنے پڑے مگر سرسید نے ہزاروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے اسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فرموش نہیں ہو سکتی۔

سرسید نے یورپین ڈریس جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، محض انگریزوں کی تقلید سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ زیادہ تر اس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی لباس ان کی ہم وطن قوموں سے مختلف ہونا چاہیے، اور چونکہ مصر و قسطنطنیہ و ایران اور اکثر ممالک اسلامیہ میں مسلمان ٹرکس ڈریس یا اس کے قریب قریب پہنتے ہیں اس لیے انھوں نے خود ترکی لباس اختیار کر کے اپنی قوم کے لیے ایک مثال قائم کی تھی۔ باوجود اس کے کہ ان کو اس فیشن کے سبب اکثر مواقع پر سخت مشکلات پیش آئیں مگر انھوں نے جو وضع مسلمانوں کے لیے مناسب سمجھ کر اختیار کی تھی اس سے کبھی سرسید تجاوز نہیں کیا۔ دل میں دربارہ فیصہ کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کالج کیشی کی طرف سے سپاس نامہ

ویا گیا، سرسید اُس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہاں جوتا اتار کر جانا ضروری تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے ادر ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سرسید اُن کے ساتھ سٹرک تک نہیں ہوئے، بنارس کے کمشنر مسٹر پی کارمیل سے وہ جوتا پہنکر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اتاروائے بغیر کسی ہندوستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر وائس جب تک علیگڑھ میں کلکٹر رہے ہم سنا ہے کہ سرسید کبھی اُن سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اتار کر اُن کے کمرے میں جائیں، مگر انھوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور کے ہاں صرف چدسے کی غرض سے وہ اُس وقت گئے تھے جبکہ مدرسہ نہایت بے مروت سامانی کی حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا فریسیہ یہ تھا کہ وہ خود ایک پینگری پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا اُس کو فرش پر دو زانو بیٹھا ٹپتاتا تھا ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے جب تک کرسی پر بیٹھے اور جوتا پہننے کی اجازت حاصل نہیں کر لی وہاں جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سرسید جیسے خود راستباز تھے اسی طرح راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے جس زمانہ میں وہ مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتے تھے اُس وقت خان بہادر منشی غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ وہاں نوکری کے امیدوار تھے پھر چند روز بعد وہ نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہو گئے تھے۔ اُس وقت حسن اتفاق سے رہتے رہتے میں چند لائق اور ذی علم اہلکار سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے جن کی سرسید کے ہاں آمد و رفت تھی، خان بہادر نے اُن سے یہ خواہش کی کہ مجھے سید صاحب سے ملوادو، انھوں نے کہا بہت اچھا مگر وہ لائبریر ہیں۔ یہ فقہان کی اصطلاح سے ناواقف تھے انھوں نے یہ سمجھا

وحاشیہ آگے صفحہ پر

سید صاحب قید اسلام سے آزاد ہیں۔ ایک دن سید صاحب اور دیگر اہل کارہ ایک جگہ جمع تھے نماز کا وقت آگیا، سب نے سید صاحب کو امام بنایا، منشی غلام نبی خاں چونکہ نہایت کھرے اور پچھے آدمی تھے ان کو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لاندہب یعنی غیر مسلم کو کس طرح امانت پر کھڑا کر دیا جو نہی سرسید نے نیت باندھی انہوں نے اگ چاند بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ سرسید نے نماز ہی میں یہ معلوم کر کے نیت توڑ دی اور منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ انہوں نے کہا میں امانت کی یاقت نہیں رکھتا، لیکن آپ اپنا مذہب مجھے بتلائیں، اس وقت اگر میرا دل ٹھکیگا تو میں خود آپ کا مقدس بنوں گا ورنہ مجھے معاف فرمائیے گا۔ سید صاحب نے کہا میں شافعی مذہب رکھتا ہوں۔ منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے پیچھے پڑھی خوشی سے نماز پڑھوں گا۔ آخر سرسید ہی نے نماز پڑھائی۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھ کر سید صاحب مجھ پر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے باوجودیکہ میں اس وقت ان کے ایک اونٹے ماتحت اہل کار کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ بلا تکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے۔ حالانکہ ان کی عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہ تھی باوجود اس کے انہوں نے گزری صاحب جنٹ مجسٹریٹ ریتنگ سے ایک

۱۔ مذہب کا لفظ ہر آج کل دین کے معنوں میں بولا جاتا ہے فقہا کی اصطلاح میں اس کے معنی نہیں ہیں بلکہ ان اذکار میں سے ہر ایک امام کے طریقہ کو مذہب کہتے ہیں اور کسی لیے وہ لاندہب اس کو کہتے ہیں جو کسی خاص امام کے طریقہ کا پابند نہ ہو۔ ۱۲۔

نہایت نازک موقع پر میری سفارش کی، دوسری دفعہ جو وہ ایک مہینے کے لیے رہتا تھا بدل کر گئے تو مکان علیحدہ کرایہ کو نہیں لیا بلکہ صرف اس نظر سے کہ وہاں کے لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ ہو، میرے ہی غریب خانہ پر آکر اترے اور مہینے بھر تک وہیں قیام کیا، پہلی دفعہ جب وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے ایک روز میں سخت بیمار ہو گیا تھا جس سے پشیاپ اور پاخانہ بند ہو گیا۔ مجھے نوکر موہنے چند روز گزرے تھے اور میری تنخواہ صرف تیس روپیہ ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا، غرض کہ عجیب بے کسی کی حالت تھی، صدر امینی کے ناظر نے جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا، میرے حال کی اطلاع پا کر سید صاحب کو رات کے نو بجے باخبر کی تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم کو ساتھ لیے چلے آئے ہیں اور ہسپتال اسٹنٹ کو جلیخانا سے لانے کے لیے آدمی بھیج کر آئے ہیں تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا مگر حکیم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر ان کے علاج سے فائدہ نہ ہو تو مجھے پھر اطلاع دی جائے اور یہ کہہ کر چلا گیا، اتفاق یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہ ہوا، سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا اور رات کے دو بجے اُس نے آکر چلا دیا، یہاں تک کہ صبح کی نماز کے وقت جا کر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہو گئی، سید صاحب تمام رات میرے غریب خانہ پر جا گئے رہے اور جب مجھے افات ہو گیا تو صبح کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف لے گئے، جس شفقت اور نیرنگانہ عنایت کے ساتھ انھوں نے میری تیمار داری میں وہ رات بسر کی اُس کو میں تمام عمر فراموش نہ کروں گا۔

نشی صاحب کہتے تھے کہ ”دنی میں سولوی امام بخش صہبانی نے سید صاحب سے پوچھا کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جو اُس پر اس قدر فہر بان ہو سید صاحب



نے کہا "کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ جیسا میں سسٹرا ہوں ایسا ہی وہ سسٹرا ہے جس زمانہ میں کہ سرسید انگلستان میں تھے اور ان کی آڈولونہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر بذریعہ سوسائٹی اخبار کے شائع ہوئی تھیں ان پر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوجھاڑ پڑتی تھی ان دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں ان کو برابر مخالفت کے خط بھیجتے تھے کہ ایسی تحریریں

یہاں نہ بھیجی جائیں۔ ایک دفعہ انھوں نے گردن مڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھ بھیجا جس پر یہاں بہت لے دے ہوئی اور مولوی صاحب مدوح نے اپنے خط میں اس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں سرسید نے ان کو ایک لطیف تحریر بھیجی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جن سے آپ کو افسوس ہوا اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں، ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی طور پر نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں، افسوس کہ مجھے ایسے الفاظ لکھنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ میرے خدا معاف کیجیے جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے، میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کرو گے۔ بھائی! کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں بُرا کروں اور اس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ بُرا نہ کہیں، ہم کو اپنے

لے چونکہ تپا آدمی مصلحت اندیش نہیں ہوتا اور اپنے کمرے پن سے لوگوں کو اپنا مخالفت بنا لیتا ہے اس لیے انھوں نے آپ کو اور فشی صاحب کو سسٹرا یعنی دیوانہ قرار دیا۔ ۱۲۔



خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا بچھے چمٹا ہے کہ نہ جہانز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے، نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو الگ ہو، نہ تغیر ذبح مرغی کھاتے وقت بھیچا چھوڑے، پس جب میں نے نہایت کچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور کچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرتا! میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں، نہ روایت شاذہ سے، والی مصر کے ساتھ بعض علماء مصر بھی تھے، سب انگریزوں کے ساتھ تغیر ذبح کیے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے، مہر حال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا شاید میں غلطی پر ہوں، صرف معافی چاہتا ہوں ۛ

## محبت و صداقت

دوسرے محبت اور الفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لیے ان کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور یہ وجہ تائیت پایا جاتا ہے وہ اپنے ایک دوست کو ایک دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکر رنجی ہو گئی ہے، لکھتے ہیں ”وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں، کسی پر وہ عاشق نہیں ہوئے، کسی سے انھوں نے دل نہیں لگایا، ان کو مزاج دوستی اور محبت کا مطلق معلوم نہیں، سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا، نہ وہ نہ خدا کی دوستی کا مزاج جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔“

ایک اور خط میں جو سید مہدی علی کا مضمون گردن ٹرٹری مرغی کے

برخلاف اخبار میں دیکھ کر ان کو لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں "آپ نے جو کچھ میرے  
مرد مر غنی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا آپ یقین کیجئے کہ اُس نے عجیب مجھ  
کو دیا ہے، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولتِ عشقِ مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے  
یا نہیں! کیونکہ بغیر اُس کے آدمی میں اور سستی میں کچھ فرق نہیں ہے۔"

## کنبے کی محبت

انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کنبے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جو  
کہ ایک نیچرل تعلق ہے۔ کسی کا قول ہے کہ "جس کے دل میں اپنے کنبے کی محبت  
نہیں اُس کو کسی سے بھی محبت نہیں"۔ سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد  
سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ ان کو بیس برس تک نہیں بھولا  
سُنا ہے کہ ان کے عزیزان کے سامنے بھائی کا ذکر اس لیے نہیں کرتے تھے  
کہ ان کا داغ تازہ ہو جائے گا۔ بہت مدت کے بعد ان کی بھتیجی کے منہ سے  
باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا، سرسید کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ گویا آج ہی بھائی  
کا انتقال ہوا ہے۔

بھائی کے مرنے کے بعد انہوں نے صغیرین بھتیجی کو اس طرح پرورش  
کیا جیسے مائیں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہیں۔ باوجودیکہ بھائی زندہ تھیں بھتیجی  
کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا، سفر و حضر میں، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا، مدتوں  
اپنے ساتھ ایک پنگ پر سلا یا اور ہر طرح سے اُس کی دل واری اور دلجوئی  
کی۔ خد میں جب سارا کنبہ دلتی میں تھا اور آپ بچپن میں تھے اُس وقت بھی  
بھتیجیا ان کی جان کے ساتھ تھا۔

جب سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا اُس وقت ان کی عمر کچھ اوپر چالیس برس

کی تھی اور تین صغیر من بچے جن کی پرورش اور رکھ رکھاؤ ایک بے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا، موجود تھے، ہر چند دوستوں نے مجھ یا کہ دوسری شادی کر لو تاکہ اپنی زندگی بھی آسائش سے گزرے اور بچوں کی پرورش میں بھی آسانی ہو، مگر محبت اور وفاماری نے ہرگز اجازت نہ دی۔ اُن کے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں اُن کو ہمیشہ دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا، وہ سن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے، ایک دن وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے، میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا، انھوں نے دردناک لہجہ میں کہا کہ "محمود کی ماں کہاں سے آوے گی؟ پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا۔"

جب وہ انگلستان گئے تو وطن سے بیٹی کی سخت بیماری کا آثار پہنچا، انھوں نے فوراً وہاں سے تار دیا کہ اگر ہمارے پہنچنے تک اُس کے پہنچنے کی امید ہو تو ہم واپس ہندوستان آنے کو تیار ہیں مگر دوسرا تار اُس کے مرنے کا پہنچا جس سے اُن کو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ جب تک ولایت میں رہے ننگین اور فرسہ خاطر رہے اور جب ولایت سے واپس آئے تو دلی جلنے کو ہرگز جی نہ پاتا تھا باوجودیکہ اُن دنوں میں دیوانی کی بڑی تعطیل تھی، صرف ایک دو روز دلی میں ٹھہرے اور ساری تعطیل علیگڑھ، مرزا پور اور بنارس میں بسر کی۔

بلکہ سرسید کی بی بی جیسا کہ معتبر ذریعوں سے سنا گیا ہے، فی الواقع ایسی نیک سرشت اور لائق بیوی تھی جس کے بعد سرسید کا دوسرا نکاح کرنا بہ نسبت نہ کرنے کے زیادہ تعجب انگیز ہوتا، وہ بھی اسی مانا کی نواسی تھی جس کے سرسید نواسے تھے اور اس لیے نیک دلی اور عالی حوصلگی دونوں میں بیوی میں یکساں پائی جاتی تھی سرسید کے بعض احباب کا بیان ہے کہ اگر کبھی سرسید کی غیبت میں اُن کے مکان پر جاتا ہو گیا ہے تو ہماری ویسی ہی مدارت ہوئی جیسی اُن کی موجودگی میں ہوتی تھی، ہم کو بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ گو یا سید صاحب خود مکان پر موجود ہیں۔

اپنی والدہ کے ساتھ جیسی اُن کو ولایت کی تھی ایسی بہت ہی کم سنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں ماں کی اطاعت کرتے تھے اور اُن کے غصہ اور خفگی کی برداشت کرتے تھے اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھ کو ماں کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہوا تھا، کیونکہ غم کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو میں پہلے مر جاؤں اور میرے بعد والدہ کی زندگی تلخی اور سختی میں گزرے۔ انھوں نے مرنے سے چند سال پہلے میرے ہاتھ میں جہاں اُن کی والدہ مدفون ہیں، ایک پبلک اسپتال میں اپنی ماں کا ذکر کیا۔ سنا اُن کا دل بھرا آیا اور اس بڑھاپے میں اُن کو ماں کے ذکر پر رونا دیکھ کر لوگ متعجب ہو گئے بھائی کے نواسوں کی نہایت شفقت کے ساتھ انھوں نے سرپرستی کی اور اُن کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو انھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے اُن کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

## وطن کی محبت

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت اور موانست ہوتی ہے خصوصاً ایسے وطن کے ساتھ جیسے کہ دلی ہے جہاں پر ویسی بھی آکر زمین پکڑ لیتے ہیں، مگر سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی، ایک زمانہ تو وہ تھا کہ اُن کو دلی کی منصفی سے دوسری جگہ ترقی پر بھیجتے تھے اور وہ وہاں سے ہرگز نکلتا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو وہ زمانہ تھا کہ دلی میں چند خاندان نام و نمود کے باقی تھے اور ہر قسم کے اہل کمال اور اہل ہنر زمانہ کی لیساط کے موافق وہاں موجود تھے۔ قلعہ کا چراغ اگر چہ ٹھنسا رہتا مگر گل نہ مٹتا تھا، سرسید کو جو زندہ دل سوانحی

وہاں میسر تھی دوسری جگہ اس کے ملنے کی امید نہ تھی، مگر قدر کے بعد حیب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح رہ گئی اب اسی حُب و وطن کا یہ تقاضا ہوا کہ جن آنکھوں سے اُس کی بہار دیکھی تھی انہیں آنکھوں سے اُس کی خزاں کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سرسید نے دلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا بھی اتنا ہی انوس نہوا ہو گا جتنا کہ سرسید کو دلی چھوڑنے کا انوس تھا، اُن کے آرٹیکلوں میں یا اسپچوں اور کلچروں میں یا پریامیٹو خطوں میں جہاں کہیں دلی کا ذکر آ گیا ہے اُن کا دل اُٹ سے بغیر نہیں رہا

وہ اپنی کتاب راہ سنت پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں ”یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھرتے ہیں کجاوہ صحتیں، کجاوہ مجلسیں، کہاں وہ آندہ، کہاں وہ شفیقہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما و صلی، صرف یاد ہی یاد ہے۔“

ایک اور آرٹیکل میں جہاں اردو اخباروں کا ذکر کیا ہے وہ یوں لکھتے ہیں اس اُجڑے ٹہر کے اخباروں کا بھی جس کا نام لیتے دل بھرتا ہے، ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں..... ہمارے وطن کے اخبار ہم سے اس لیے ناراض ہیں کہ درستہ العلوم دہلی میں کیوں نہ مقرر ہوا؟ بھائی! کہاں ہے وہ دلی اور کہاں ہیں وہ دلی والے؟ جو نقشِ کہ مٹ گیا اُس کا اب کیا نام لینا ہے، مرثیہ پڑھا کرو اور دلی والوں کو رو یا کرو۔“

جس زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دلی میں تجویز ہو رہا تھا انھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ لکھا تھا کہ آپ کی سب کوششیں اور تدبیریں اور خیالات بے سود ثابت ہوں گے، نہ دہلی میں کوئی انتظام کرنے والا ہے اور نہ دہلی اس لائق رہی ہے، وہاں کے مسلمانوں پر مسلمانوں کے گھروں پر مسلمانوں کے

گھروں پر مسلمانوں کے محلوں پر اب تک نحوست برستی ہے، ان کی طبیعت ان کے اخلاق، راہ و رسم، سوشل حالت ایسی تبدیل ہو گئی ہے کہ جب کبھی دلی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کی باتیں سن کر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں! خدا نے دلی سے سب کچھ چھین لیا، ذاک تقدیر العزیز العظیم۔

سرسید کی طبیعت میں ایک خاص صفت تھی جو بڑے بڑے کاموں کا بوجھ اٹھانے والوں میں ہونی نہایت ضروری ہے، وہ دل بچھانے والی اور ہمت توڑنے والی تقریبوں سے ہمیشہ دور دور اور الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے اگر ایسا نہ کرتے تو جس قدر قومی اور ملکی اور مذہبی خدمات انھوں نے انجام دی ہیں اس کا عشر عشر بھی ان سے سہرا انجام نہ ہو سکتا، سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدر ان پر نہایت سخت ہوا تھا، دو وقت انھوں نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور پندرہ بیس روز تک ان کی حالت نہایت نازک رہی، مگر جس وقت بیٹے کا دم نکلا اور گھر میں کہرام مچا وہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر چلے گئے اور جب تک لوگ ان کو دفن کر کے نہ آئے وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر جو اس روز سے علیگڑھ گئے ایک آدھ بار سے زیادہ پھر کبھی جا کر گھر کی صورت نہیں دیکھی، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے دلی کا غم بھلانے کے لیے دلی کی پروا و باش ہی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی تھی۔ ان کے بعض ہم وطن کہتے ہیں کہ اگر دلی سے کچھ اُٹس ہوتا تو وہ دلی چھوڑ کر علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم نہ کرتے، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر نبی امیہ کو بغداد سے اُٹس ہوتا تو وہ اُندلس میں جا کر اپنی سلطنت قائم نہ کرتے، دلی جو سیکڑوں میں مسلمانوں کا دار الحکومت رہا اور اس لیے پُرانے خیالات اور قومی و مذہبی توہمات کا مرکز تھا وہاں سرسید کے منصوبوں



کا پورا ہونا بلا تشبیہ ایسا ہی مشکل تھا جیسا مکہ میں اسلام کا نشوونما پانا۔  
 اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی سبھلائی کا خیال اور قومی  
 ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلی ہی کی تباہی اور میربادی نے پیدا کیا، فتح دہلی کے بعد  
 جس وقت وہ میرٹھ سے اپنی ماں اور خالہ کی خبر لینے کو دلی میں پہنچے انھوں نے تمام  
 شہر کو بالکل ویران پایا۔ یہاں تک کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، پیاسوں کے لیے  
 پانی کی ضرورت ہوتی تو ایک صراحی پانی کے لیے ان کو خود قلعہ میں جانا پڑا، جس  
 دوست یا عزیز کا حال دریافت کیا اس کو مقول سنایا مفقود جس قلعہ میں سلاطین  
 کے عیش و عشرت کے سامان دیکھے تھے اُس کے در و دیوار سے ان کے خون کی  
 بو آتے دیکھی، اگرچہ اُس وقت ہزاروں ایسے بھی تھے جو مرگ انبوہ کو جن سمجھتے  
 تھے مگر سرسید جیسے ذکی النفس آدمی کے لیے یہ انقلاب ایک تازہیانہ تھا، دلی کا  
 وہ سناٹا دیکھ کر ایک ایسی چوٹ ان کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ زخم اور آخر  
 کار ناسور بن گئی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی اگر بسج پوچھے تو دلی ہی کی حالت  
 دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوا، غدر سے پہلے جیسے دلی کے لوگ دنیا کے حالات  
 سے بے خبر تھے ایسے شاید ہی کسی دوسری جگہ کے لوگ ہوں، سرسید کہتے تھے  
 کہ ”ایک دفعہ جو میں رتھک سے کسی تعطیل میں دلی آیا تو وہاں کے ایک معزز  
 آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں گئے تھے؟ اور جب میں نے رتھک کا  
 نام لیا تو انھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رتھک بھی انگریزوں کی عمارت میں ہے!  
 وہ بے بھی کہتے تھے کہ ”دلی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک مجسٹریٹ کو  
 شکاف کہتے تھے کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام شکاف تھا“

## دوستوں کے ساتھ برتاؤ

جو برتاؤ سرسید کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانہ کے دوستوں سے بالکل نرالا تھا، جہاں تک اُن کا حال دیکھا گیا اُن کی خوشی بلکہ اُن کی زندگی کا مدار صرف دُ چیزوں پر معلوم ہوتا تھا، کام اور دوستوں کی ملاقات، اُن کو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اپنے خاص و مخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی وہ فی الواقع دوستوں کو زندگانی کا ایک عنصر سمجھتے تھے۔ اُن کا اس مقولہ پر لپڑا لپڑا عمل تھا کہ ”اگر ساری دنیا قبضہ میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ بیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے“ باوجودیکہ دن بھر میں اُن کا کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ کام سے خالی نہ ہوتا تھا اور ایسے شخص کو تنہائی زیادہ پسند ہونی چاہیے یا اینہمہ دوستوں سے کبھی اُن کا جی نہ اکتاتا تھا۔ ابتدائی ملاقات میں وہ بہت روکھے پھیکے معلوم ہوتے تھے، ناواقف آدمی اُن کو پہلی ہی بار دیکھ کر نہایت محبوس اور تنگ مزاج سمجھتا تھا مگر جس قدر اُن سے زیادہ رُبط بڑھتا جاتا تھا اسی قدر اس مقولہ کی تصدیق ہوتی جاتی تھی کہ ”الرَّغْمَۃُ اِلَى الْاَلْمِیۡمِ تَخْلُقُ لِحَاکِ وَ تَقْرَبُ بِلِکِّ مِنْهُ دَوْرُ فِیۡحٍ وَ جُبُوۡتِ الْاِحْسَابِ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ“ کزنل گریم لکھتے ہیں کہ ”میں اس کو یعنی سرسید کو ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں، میرا اور اُن کا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہے نہ کہ بطور ایک دوست کے، جتنی زیادہ اُن کی میری واقفیت بڑھتی گئی اسی قدر اُن کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوتی گئی“

سرسید اپنا دشمن تو شاید ہی کسی کو سمجھتے ہوں مگر جن کو وہ اپنا دوست جانتے تھے وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ قوم کی عام خیر خواہی کے سہاراوں بلکہ لاکھوں کے

۱۔ یعنی کریم النفس آدمی کی طرف جس قدر تھکے اُس سے زیادہ میل جول برگا اور معاشرت دور ہوتی جاوے

دل میں اُن کی جگہ کر دی تھی۔ انھیں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کی دوستی یا رازہ کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی اور اُن کی چیز میں کچھ فرق نہ سمجھتے تھے۔ سرسید کا گھرانہ کا ہڈل یا سراسٹے تھا اور اُن کا دل سرسید کی مٹھی میں تھا وہ جب اوحس قدر چاہتے اُن کے نام بغیر پوچھے چندہ لکھ دیتے تھے اور اُن کو طوعاً یا کرہاً قبول کرنا پڑتا تھا۔

دوستی کے متعلق ایک کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ "ایک روز امام محمد باقر نے اصحاب سے کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے کہ دوست کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جس قدر نقدی کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لے؛ سب نے عرض کیا "لَا اَللّٰہَ اِلَّا ہُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ" آپ نے فرمایا "بس تو تم میں کوئی دوستی کے لائق نہیں ہے۔" مگر سرسید کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ اور اُن کے دوستوں کا حال سرسید کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کی جیب سے جو چاہتے نکال سکتے تھے۔

سرسید کے دوستوں میں سے اُن کے ایک نہایت عزیز دوست خرچ میں کبھی اعتدال اور میانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے اُن سے چندہ مانگا ہو اور اُنھوں نے انکار کیا ہو۔ وہ اپنی جیبی عاوت کے موافق بطور ظرافت کے کہا کرتے ہیں کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں ہاں مگر سید احمد خاں کی زبان میں ضرور جاو و تھا کہ جہاں روپیہ دو روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا تھا وہاں اُن کے ایک اسٹوڈنٹ پر آنکھ بند کر کے سیکڑوں پوچھتے تھے۔

سرسید ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ اس طرح پر متواتر امداد کی درخواست کرنے سے شرم آتی ہے مگر ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے

وہی ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہے کہ "خاٹہ دوستانہ پر وہب و درہ  
 دشمنان مکروب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں  
 اور کچھ شرم نہیں کرتے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے  
 مانگیں! لیکن اُن کا شکریہ ہم پر واجب ہے ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا  
 چندہ کسی قدر باقی تھا، ہم نے اُن سے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اس کو  
 بیباق کر دو، انھوں نے کہا بیباقی کا تو آپ نام نہ لیجیے، جب تک زندگی ہے  
 بیباقی تو نہ ہوگی، آج اس چندہ کی باقی ہے کل دوسرے چندہ کی، اسی طرح باقی  
 دار مراٹوں گا، پس بیباقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی، مگر جس قدر روپیہ چاہو لے لو،  
 اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ "در حقیقت یہی حال ہے، کوئی زمانہ ایسا  
 نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لیے چندہ  
 نہ مانگتے ہوں، مگر ہمارے دوست بھی ہمارے اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں۔"

۷ "گر مگر زبیت پوسہ گرتسیم مرنج

سرخی لعل لببت ہیں کہ چہ زریا بود دست"

انہیں دوستوں میں سے بعض کے ساتھ نہایت بے تکلفی تھی، وہ جو کچھ  
 چاہتے تھے سرسید کو کہہ بیٹھتے تھے، اُن پر رُو در رُو اعتراض کرتے تھے، اُن کے  
 مذہبی خیالات اور رالیوں پر نکتہ چینیوں کرتے تھے، ان سے ہر قسم کی ہنسی اور چُہل  
 کنی باتیں ہوتی تھیں، وہ ہمیشہ سرسید کی جھڑکیاں کھاتے تھے اور خفگیاں بہتے تھے  
 مگر نہ کبھی سرسید کو اُن سے ملاں ہوا تھا اور نہ اُن کی خفگی یا جھڑکی کا برا مانتے تھے۔  
 اُن کے حسب حال یہ شعر تھا

"تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب!

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یوں سزا کے بعد"

جب کسی دوست کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آتی تھی جس سے مغائرت کا خیال پیدا ہوتا ہو تو ان کو یہ امر نہایت شاق گزرتا تھا۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کا بیان ہے کہ میں ریتنگ سے میرٹھ جاتا تھا، جب دلی پہنچا تو ایک دوست کے مکان پر ٹھہرنا ہوا، وہاں میں نے سنا کہ سید صاحب بجنور سے آئے ہوئے ہیں، میں ان کی خدمت میں پہنچا، انھوں نے فوراً میرا اسباب فرودگاہ سے منگوا لیا اور فرمایا کہ پانچ چار روز تم کو یہاں ٹھہرنا پڑے گا، پھر ہم تم یہاں سے ساتھ چلیں گے، میں ٹھہر گیا، انھوں نے شہر کے مشاہیر سے مجھ کو ملوایا، اتفاق سے محمد بخش خاں صدر الصدور میرٹھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے، انھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ میرٹھ تک مجھے بھی اپنی گاڑی میں شریک کر لینا، سید صاحب نے ان کو لکھ بھیجا کہ میری گاڑی میں منشی غلام نبی شریک ہیں اس لیے آپ کی گنجائش نہیں، مجھے شرکت کے لفظ سے یہ خیال گزرا کہ نصف کرایہ گاڑی کا مجھے دینا پڑے گا، غرض کہ میں سید صاحب کے ساتھ دلی سے میرٹھ کو روانہ ہوا راہ میں اپنی نالائقی سے میں نے نصف کرایہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا، انھوں نے نہایت غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے مجھے اپنی اس کینہ حرکت سے ایسا انفعال ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا، آخر مجھ کو معافی مانگنی پڑی اور پھر کرایہ کے باب میں ان کے سامنے دم نہیں مارا، اسی طرح انھوں نے ایک دوست کو کسی قدر روپیہ کا چک بھیجا مگر اس نے واپس کر دیا اور لکھا کہ میں یہ روپیہ نہ لوں گا اس کے لیے مجھ سے بہتر مصرف موجود ہیں، سرسید نے اس کا جواب لکھا کہ "آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس میں چک مسئلہ کا ذکر تھا اس کو پڑھ کر میں تم پر نہایت خفا ہوا جو محبت و کجیبتی مجھ کو تم سے ہے وہ اس لائق نہ تھی کہ تم ایسے کلمات کہتے جو

ایک غیر شخص کو کھتے زریا ہیں۔ خبردار اس قسم کے خیالات ہمارے ساتھ ہرگز مت کرو۔ اگر تم رقعہ مرسلہ کو کام میں نہ لاؤ گے تو نہایت آرزو دگی ہوگی اور نیشن ہوگا کہ تم کبھی نہیں سمجھتے۔ اب دوبارہ اس باب میں نہ لکھنا۔

جس دوست کے ساتھ سرسید کی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی وہی اکثر موردِ عتاب رہتا تھا مگر اس عتاب کی قدر وہی خوب جانتے تھے جو اس کے مورد ہوتے تھے۔ خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں جن پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی رہتی تھی وہی آج سب سے زیادہ سرسید کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں اور دنیا میں کسی دوست یا عزیز کو ویسا غمخواہ اور غمگسار نہیں پاتے۔ سرسید کا ایک خط ہاتھ لگا ہے جو انھوں نے علالت کی حالت میں اپنے پشیدہ سے لکھا کہ ننان بہادر کو رام پور بھیجا تھا، نہ اس میں عرقی شوق و آرزو کا اظہار ہے نہ جدائی کی معمولی شکایت ہے مگر اس کے ہر لفظ سے محبت چمکی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں: ”مگر می زنیو ا ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جاسکتا۔ زبان کھلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بڑا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں ہاتھ کھلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ہاروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔“

خان بہادر ہمیشہ بلا ناغہ صبح کے چار بجے سرسید کی کٹھی پر آتے تھے اور گھٹا آرو گھٹا وہاں ٹھہر

کر پھر باخوری کو جاتے تھے یہ اس صبح کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے ۱۲۔



ع۔ اسے کہ ہرگز فراموش نہ کروں گا، لائق ہو گیا ہے۔“  
 نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ  
 ”میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں، میری ان سے پہلی  
 ملاقات ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی اس وقت سے آج تک ایک بات بھی ان میں ایسی  
 نہیں دیکھی جس کو برا کہہ سکوں۔ اس شخص کیسی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں  
 نہیں دیکھی اللہ تعالیٰ نے ان میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی  
 سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا  
 نے ڈال دی ہے۔“

اسی محبت کی کشش تھی کہ محسن الملک نے حیدرآباد سے آکر وطن مالوٹ  
 کی طرف رخ نہیں کیا بلکہ علیگر ٹھہر کر اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا اور کبھی ایک دو دن سے زیادہ  
 اٹاوہ میں جا کر قیام نہیں کیا، اور اگر حفظِ صحت کا خیال ان کو مجبور نہ کرتا تو غالباً  
 وہ سرسید کی زندگی میں علیگر ٹھہر کر چھوڑ کر کبھی پٹی نہ جاتے۔ نظیری نے کیا خوب  
 کہا ہے۔

”درس ادب اگر بود ز منز منہ بختے

جمعہ بہ مکتب آور و مفضل گریز پائے را“

سرسید کی خفگی اور غصہ میں جو کشش تھی وہ کسی کی مہربانی اور عنایت میں بھی نہیں  
 دیکھی گئی۔ سید مہدی علی کو ہمیشہ ان کے عتاب آمیز خط جاتے تھے چنانچہ وہ خود  
 ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”مہدی علی کو سوائے غصہ اور خفگی کے کبھی کچھ نہیں ملا باوجود  
 اس کے سید مہدی علی کا معاملہ ان کے ساتھ شمع و پروانہ کا سا تھا۔ الہ آباد کے جلسہ  
 کانفرنس میں جس زور و شوق اور وجد کی حالت میں انہوں نے اپنا لکچر دیتے وقت  
 تمام حاضرین کے سامنے سرسید سے خطاب کیا تھا وہ اکثر لوگوں کو یاد ہو گا خصوصاً

اس وقت کا سماں کبھی دل سے فراموش نہ ہو گا جب کہ انھوں نے سرسید سے  
مخاطب ہو کر یہ اشعار پڑھے تھے ۔

دلبران ماہ سپیکر دیدہ ام      درجہالت چیز دیگر دیدہ ام  
ایں چہ نورست اینکہ تاباں از نوبت      ہفت کوکب نورافشاں از نوبت  
تو مسکل از کمال کیتی      منظر نور جمال کیتی

سرسید نے ایک آرٹیکل میں جو غالباً محبت پر لکھا ہے مسٹر پٹلی کا یہ قول نقل  
کیا ہے کہ ”انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیے کہ اس کو درست  
بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیے کہ اگر کبھی وہ دشمن  
ہو جائے تو اس کے ضرر سے بچنے کی جگہ باقی رہے۔“ اس قول کو نقل کر کے وہ  
خود لکھتے ہیں کہ ”اس کا پہلا حصہ جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ہے وہ تو نہایت  
عمدہ ہے، مگر پھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ پر تھے کی ہے اس میں سمجھ  
کی کچھ بھی بات نہیں بلکہ نری سکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت  
بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے، اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں  
کہہ سکتا، یہ بیچ ہے کہ بھنے دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست کے مجھ  
کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انھیں کو دنیا باز اور بُرا کہتی ہے، دوست پر بھروسا  
کرنے والے کو نا بھجھ نہیں کہتے، ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی  
سمجھ چاہیے۔“

سرسید نے جو کچھ لکھا ہے یہ خاص اُن کے دلی خیالات تھے اور جہاں تک  
ہم کو معلوم ہے اُن کا ہمیشہ اسی کے موافق عمل درآمد رہا۔ وہ بے شک زور و  
آہمیز اور زور و پیوند نہ تھے بلکہ اس شعر کے حقیقی مصداق تھے ۔  
”عیب ننت کہ بیگانہ دارے گزری      کہ ہر کہ زور و گسل نبت و پوندت“

مگر جب کسی سے دل مل جاتا تھا پھر خواہ وہ شخص بندوبست یا عیسائی یا یہودی یا مسلمان اُس سے کسی طرح کی منگوائی اور بیگانگی باقی نہ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے پرستے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بتقام علیگڑھ ایک جوائنٹ کانفرنس نے جلسوں کے بعد تمام ممبروں اور وزیٹروں کے سامنے ایک تقریب کی تھی جس کے آخر کے چند فقرے یہاں نقل کر کے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

انھوں نے کہا ”اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادری نہایت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لیے اسی کا گیت گایا جاتا ہے۔ ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے علاوہ دو ہوتے موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر اس سے نہایت دوستی اور برادری اور عزت پرانہ محبت ہے جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر اس اور اس اُن کی سیم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے، اپنا نام اُس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے اُن کا نام اُس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اُس کا نام سید اس مسعود قرار پایا۔“

”دوسرا نمونہ راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی کی طرف نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا، ہمارا یہ ڈارھی سٹا و دست یہاں موجود ہے اور سید اس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ اُن کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید اس مسعود دادا راجہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔“

سر سید جس کو دوست سمجھ لیتے تھے اُس کی طرف سے فی الواقع اُن کا دل ایسا صاف ہو جاتا تھا کہ اس کی نسبت بُرائی کا کبھی تصور بھی نہ آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا سعادت یا دراندازی اُن کو دوست سے جب تک کہ علانیہ اور متواتر اُس سے دوستی کے خلاف بائیں سرزد نہ ہوں، بدگمان نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ جب کسی کی نسبت اُن کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ دوست نہیں پھر اُس سے مطلق تعلق باقی نہ رہتا تھا۔ ظاہر واری کا ملنا فی الحقیقتہ اس شخص کو نہ آتا تھا۔ اُن کے حال پر بعینہ یہ شعر منطبق ہوتا تھا۔

مرسخان ولم را کہ این مُرخ و حشی زبانی کہ ہر فاست مشکل نشیند  
 وہ سید مہدی علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں تو اُس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُس نے غلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی ہوگی۔ میں تو دوست کے گال دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی پر عمل کرتا ہوں اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے، مگر جب کہ حقیقت میں غلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشہ محبت جو نہایت نازک ہے، کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی اور محبت ایسی سخت چیز ہے کہ تھوڑوں اور ہزاروں صدروں سے نہیں ٹوٹی، مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک ادنیٰ سی غلاف محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے اُس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔"

سر سید کو کسی دوست نے لکھا کہ فلاں دوست سے بھی آپ چندہ طلب کریں۔ اُس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ "جو فلاں اُن کی طرف سے میرے

دل میں ہوا ہے وہ اب تک کم نہیں ہوا، پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے  
اُس نگاہ سے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو  
اُس کے دل میں نہیں ہے، ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے دل میں  
نہیں ہے۔“

اُن کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ و قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ  
ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام کے خط میں مولوی زین العابدین خاں  
کی نسبت لکھتے ہیں ”جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت  
ذکر لکھا ہے وہ حقیقت وہ بہت کم ہے۔ اس کا فرغارت کن ایمان کو جیسا کہ وہ  
بے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے  
رشتے دنانے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔“

اگرچہ سید ہر ایک معاملہ میں نہایت آزادانہ خیالات رکھتے تھے مگر  
دوستی کے معاملات میں بڑے کٹھن و ٹوٹو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے خالص و  
مخلص دوستوں سے اسی قسم کی توقعات رکھتے تھے جیسے اگلے زمانہ کے وضع دار  
اور با وفا دوستوں کے حالات سننے میں آئے ہیں قطع نظر پرائیویٹ باتوں کے  
پبلک معاملات میں بھی جو زیادہ مہتمم بالشان ہوں، ان کی یہ خواہش معلوم ہوتی تھی  
کہ دوست اُن کی رائے کے موید ہوں اور اگر کوئی دوست اُن کی رائے سے  
اختلاف کرتا تھا تو اُن کو حسد سے زیادہ ملتا تھا۔

جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال ہوا وہ اپنے ہر ایک دوست  
سے اس بات کے توقع تھے کہ اُن کے کام میں دل سے مدد دیں۔ جن قدیم دوستوں  
نے توقع کے موافق تعلیمی معاملات میں اُن کو مدد نہیں دی اُن کے ساتھ وہ ربط  
وضبط جو قدیم سے چلا آتا تھا قائم نہ رہا اور نئے دوست جو ان معاملات میں

اُن کے مددگار تھے اُن کو وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھتے تھے۔ خاں بہادر برکت علی خاں کی نسبت اُن کی اخیر دم تک یہ تمنا رہی کہ کالج میں ایک ممتاز مکان اُن کی یادگار میں تیار کرائیں۔ سردار محمد حیات خاں کو اپنا قوت بازو سمجھتے تھے۔ قاضی رضا حسین رئیس پٹنہ، خلیفہ سید محمود حسن خاں وزیر پٹیالہ، مولوی چراغ علی اور سیر ظہور حسین کے سرنے کا اُن کو ایسا رنج ہوا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے سرنے کا کبھی کسی کو اس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا۔ نواب انتصار جنگ سے اگرچہ وہ ٹرسٹی بل کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر آزرہ ہو گئے تھے مگر چونکہ مدرسہ کی امداد اُن کی بلبر ایک آدھ کے سوا کسی نے نہیں کی اس لیے وہ ملاں چند روز بعد بالکل جاتا رہا تھا اور ان کی ویسی ہی جگہ دل میں ہو گئی تھی جیسی قدیم سے چلی آتی تھی۔ نواب عماد الملک کو ان کی نیکی اور استبازی اور علم و فضل اور مدبرانہ العارم کی حقیقی خیر خواہ اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور اُن کی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک نور مجسم ہے، شمس العلماء مولانا نذیر احمد کی نسبت ایک ناواقف آدمی نے اُن کے سامنے بطور شکایت کے کہا کہ باوجود اس قدر مقدور ہونے کے انھوں نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں دی۔ سر سید نے بد مزہ ہو کر اُن کے چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسہ میں دیتے رہے ہیں اور جو مقبولیت اور رونق ان کے لکچروں سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوئی اس کا ذکر کر کے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لیے باعثِ فخر ہے اُس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ بکاتا، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ جنھوں نے کالج کے چندوں کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی، اور سید زین العابدین، سیر تلاب علی، سید مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، راجب



جے کٹن داس، حاجی اسماعیل خاں اور مرزا عابد علی بیگ کو وہ شل اپنے اعضاء و جوارح کے سمجھتے تھے۔ انگریز شخصیں دوستی و محبت کے باب میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا۔

وَإِذَا رَأَيْتَ صَدِيقَهُ وَشَقِيقَهُ  
لَمْ تَذَرِ أَيُّمَا ذُو وَالِأَخْرَجَاهُ

یعنی تو اس کے دوست اور گے بھائی کو دیکھ کر یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ بھائی کو نسا ہے اور دوست کو نسا

## نوکروں کے ساتھ تعلق

اسی جلی مہر و محبت کا مقضا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور گے بندھوں کو تا بمقدور عمر بھر اپنے ساتھ بنا ہونا چاہتے تھے جس شخص کے قدم اُن کے ہاں جم گئے، پھر نہ وہاں کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ اُن سے جدا ہوتا چاہتا تھا، اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی شکایت کرتا تھا تو اُس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا، اُن کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے اُن سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح اُن کے دل سے نہ اُترا، ہمیشہ اُن کا معتمد علیہ اور مسافر و حضر میں اُن کے ہمراہ رہا اور آخر انہیں کی وفات میں مر گیا، اُس کے بعد چھوٹے بھائی کو داروغگی ملی جس کی آوارگی اور بد چلنی حد سے گزر گئی تھی مگر وہ بھی اخیر دم تک اُن سے نہ چھوٹ سکا۔

حافظ عبدالرحمن مرحوم جو سید محمود کے بچپن کے استاد تھے، ۲۵ برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُن کا خاتمہ ہوا، مرنے وقت انہوں نے سید محمود اور سرسید کو بلا یا جب دونوں کو دیکھ لیا تو فراراً روح پر واز گئی۔ سرسید کو اُن کے مرنے کا ایسا تعلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُن کے مرنے کا رنج و الم رہا، منشی ذوالفقار جو اُن کے بیچ کا حساب کتاب کھنڈنا

تھا اس کے رنے کا بھی اُن کو کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا خمیر مہر و محبت بنا ہوا تھا۔

## فراخ حوصلگی

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف ہیں سے تھی انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جائیداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اس کو یا اپنی ضروری آسائش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اٹھایا۔ وہ ۳۷ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں سو روپیہ سے لے کر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے۔ جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد اخیر دم تک چھ سو روپیہ ماہوار پنشن کی آمدنی رہی مگر کبھی ان کی آمدنی خرچ کو کٹھی نہیں ہوئی۔ ان کے ایک معزز رشتہ دار کا بیان ہے کہ "جب ولی کی منصفی سے ان کو ترقی کے ساتھ باہر بھیجنے لگے تو ان کی والدہ نے جو ان کی طبیعت اور خصلت سے خوب واقف تھیں، صرف اس خیال سے جانے نہیں دیا کہ جس قدر زیادہ آمدنی ہوگی اسی قدر خرچ بڑھ جائے گا، پھر اپنا گھر چھوڑ کر باہر جانے سے کیا فائدہ "

ابتداء سے ان کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہران کے دل میں اٹھی اس پر روپیہ صرف کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی ان کو تلاش ہوئی اگر وہ میں گئی قیمت

پر بھی ملی تو اُس کو لیے بغیر نہیں چھوڑا۔ ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا اُن کا شوق ہوا صد بارو پیہ اُس میں صرف کر ڈالا کسی تصنیف کے لیے میٹرل جمع کرنے میں کسی کتاب کے چھپانے کے اہتمام میں کسی سوسائٹی یا انجمن یا مدرسہ قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت زیادہ زیادہ خرچ کرتے رہے۔ ساری عمر تصنیف تالیف میں گزری مگر کبھی حق تصنیف سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کرائی اُن کی کتابیں اور مضامین جس کا جی چاہتا تھا چھاپ لیتا تھا، انہوں نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا۔

جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ ثواب کے معمول کاموں میں بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ بجنورہ میں غدر سے پہلے تین مسجدوں کے بننے میں انہوں نے کافی مدد دی، سوضع بینسورہ جو بجنورہ اور دلی کے رستے میں پڑتا تھا وہاں ایک سرائے تھی جس میں سرسید آنے جاتے کھانا کھاتے کے لیے ٹھہرا کرتے تھے۔ اس سرائے میں بھٹیاردوں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی، اُس مسجد کی ابھی بنیادیں ہی بھری گئی تھیں کہ دو بھٹیاردوں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا اور اس لیے مسجد کی تعمیر بند ہو گئی۔ سرسید نے اُس کی تعمیر نامتام دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ دلی سے اپنے رشتہ داروں اُردوں اور عورتوں سے وصول کر کے اُس کو لوہا کر دیا۔ پھر خاص بجنورہ میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی " اُس کے بنوانے میں بھی انہوں نے بہت مدد دی، مگر وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غدر ہو گیا، غدر کے بعد سرسید نے فوراً اس کی تعمیر جاری کرائی اور اس کو مکمل کرادیا، اسی طرح کاندھلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین مرحوم و مغفور بنواتے تھے، سرسید نے روپیہ بھیجا

چاہا، مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری تنخواہ کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جاسکتا، مرسید نے رجسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا۔ مگر جب وہ خیالات بدل گئے تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے جب اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ ”میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھسہ کی تعمیر کا خیال ہے“

مستحقوں کی امداد اور دستگیری کرنے کی بھی اُن کی نسبت بے شمار شاہیں سننے میں آئی ہیں، خصوصاً غدر کے بعد جب کہ مسلمان شرفا کے صدر اہلخانہ تباہ ویراں ہو گئے تھے، اُن کے دوست محمد سعید خاں کہتے تھے کہ ”سراہ آباد میں جو شکتہ حال امرا و مورث مسلمان اُن کے مکان کے برابر سے گزرتا اُس کو خود بلا لیتے تھے اور علیحدہ لے جا کر اس کا حال دریافت کرتے تھے اور ایسے طور پر اُس کے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خیر نہ ہو۔“ اُن کے ایک معزز اور ثقہ دوست کی روایت ہے کہ ”مرث تک غدر کے بعد اُن کا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے صرف بقدر اخراجات ضروری لے کر باقی کل روپیہ دلی میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے، بعض اشخاص غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ مرسید کا یہ برتاؤ دیکھ کر بہ تصنع اپنے تئیں مفلوک اور مصیبت زدہ ظاہر کرنے لگے اور مرسید اُن کے اصل حال سے سے واقف ہونے کے بعد بھی اُن کے ساتھ اُسی طرح سلوک کرتے تھے۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ ”سراہ آباد میں جب کہ نواب لفٹننٹ گورنر کا دربار ہونے والا تھا اور لوگ اطراف و جوارب سے دربار میں شامل ہونے کو آئے ہونے لگے، ایک شخص بنظاہر معقول اور سفید پوش تیار تھا۔“

کے مکان پر آئے اور اُن کو الگ لیا کر کہا کہ میں ویرا میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا، مگر میرا آدمی اسباب نے کر بھاگ گیا اور میں بالکل بے سروسامان رہ گیا ہوں۔ سرسید نے اُن کو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو جیل دسے کر مانگ کھاتا ہے تین چار روز بعد وہ پھر شریف لائے اور کچھ اور طلب کیا، سید صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا، غرض کہ تین دفعہ ویرا ہونے سے پہلے وہ اُن کے پاس آیا اور ہر دفعہ اُس کو کچھ دیا اور کھانا اسی طرح ساتھ کھلایا۔

اُس زمانہ میں سرسید کو یہ خیال تھا کہ سینکڑوں شریف اور خاندانی افلاس میں مبتلا ہیں اور جس جیلے سے روٹی ملتی ہے حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب سے انھوں نے مدرسۃ العلوم قائم کیا اُن کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا۔ وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھینکتے نہ دیتے تھے اور بچانے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کار خیر سمجھتے ہوں، اس کو ایک قسم کی معصیت جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا اُن کو ہمیشہ کے لیے در یوزہ کر بنا نا ہے، اسی لیے اُن کی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تسلیم میں منحصر ہو گئی تھی جس ورشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اس پر دُور و بک کرتے تھے اُس کو دیکھ کر نادان آدمی اُن کو سخت بد اخلاق اور بد مزاج تصور کرتا تھا مگر وہ اُن کا غصہ اور دُور و بک کرنا سراسر معنوی ہوتا تھا، اُن کا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لیے بد اخلاق بننا نہایت ضرور ہے۔

سرسید کی جو امر دی اور فیاضی صرف داد و دہش ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اُن کی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے اپنے سایہ

سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ غدر کے بعد انھوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی جن کی نسبت حکام کو اشتباہ ہو گیا تھا، صفائی کرائی۔ بعض اشخاص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے یا غیبوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، مگر درحقیقت بے گناہ تھے، ان کو بطور خود دہاں سے بلا کر ان کی تحقیقات کرائی اور ان کی بریت پر خود گواہی دے کر ان کو بری کرایا۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو بعض ناخدا ترس مند و ستابینوں شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب ان کو بھانسیاں دلوانے پر کمر بستہ تھے۔ بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے دلی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے تھے ان کے دراندہ وارثوں کی پینشنیں مقرر کرائیں مولانا عالم علی مرحوم مراد آبادی کی صفائی کرانے میں جو کوشش سرسید نے کی وہ ہم پہلے کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ غرض کہ اس شخص نے مسلمانوں کو کیا من حیث القوم اور کیا من حیث الافراد فائدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو نیا ضامن برتاؤ اس شخص کا تھا اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علیگر ٹھہ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گارٹیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ

لے مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمید الدینی کا ایک خط ہمارے سامنے تھا تیسرے سرسید کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مولانا نام بخش صہبائی مرحوم جو اس عاجز کے نانا تھے ایام غدر میں ان کے بے گناہ قتل ہونے پر عالی حضرت نے جناب نانی صاحبہ و دیگر دراندگان کا وظیفہ سرکار انگریزی سے مقرر کر دیا تھا۔ جب تک نانی صاحبہ زندہ ہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندہ نے والدین سے منگوا کر جو احسانات آنجناب کے اس خاندان کے ساتھ ہو گئے ہیں وہ بیان سے باہر ہو۔



ہو گیا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کی توقع اور حوصلہ سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں ان کا رہنا ہوا یہ لوگ اُن کے نہایت شکر گزار اور ثنا خواں رہے۔ ان کے ایک دوست کا بیان ہے "میں بنارس میں اُن سے ملنے گیا تھا، دریا پر پہنچا تو شام ہو گئی تھی اور کشتی کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔ ہر چند ملاحوں سے کہا کہ کشتی لگا دو، مگر انہوں نے نہ مسانا۔ لیکن جب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ حج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں فوراً کشتی لگادی اور مجھے پار اُتار دیا۔ کشتی سے اتر کر میں نے ملاحوں کو کچھ دینیا چاہا مگر انہوں نے کچھ نہ لیا اور یہ کہا کہ سرکار (یعنی سرسید) ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں ہم اُن کے مہمان سے ہرگز کچھ نہ لیں گے" ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزدور دل کا سنا ہے جو سرسید کے نام پر بلا مزدوری کام کرتے تھے۔

سالم نام ایک یہودی صنعتی بین کار ہے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لیے پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لوگے؟ اُس نے دس یا پندرہ روپیہ کے، سرسید نے کہا میں تم کو پچیس روپیہ مہینا دوں گا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اس نے عوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی وارھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخوارت سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اُس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لیے اس کو بقدر ضرورت دیتے رہے اور اُس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اُس کا چڑھا ہوا تھا حساب کر کے اُس کے حوالے کر دیا۔

جس زمانہ میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی اُن کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب

سید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہنا چاہتے ہیں تو مولوی صاحب نے ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیونکر جا سکتا ہوں! ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ہے، ان کو کس پر چھوڑ کر جاؤں! انہوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے، سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا فکر کیجیے نہیں۔ خدا باریق ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہنا چاہتا ہوں۔ انکار کر دوں گا اور اس سے میری آئندہ ترقی رُک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے ان کے ساتھ ہو لیے اور جتک رہنا ہو اسب خرچ سید صاحب کے ذمہ ہوا۔

سرسید کی اس قسم کی فراخ مرادگی کی مثالیں بے شمار ہیں جن کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں ان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے، کیونکہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحہ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتے، مگر سرسید کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنیٰ تھی۔

درحق او مدح و درحق تو ذمہ درحق او شہد و درحق تو قسم  
سرسید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل کڑھی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انہوں نے گزشتہ چالیس برس میں سرانجام دیں وہ کون کرتا، انہوں نے ایسے کاموں کے لیے جو ہندوستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کا ان کو بالکل عادت نہ تھی، دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا۔

ہوگا، اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیوں میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے، اگر وہ اپنے گھر کو مہا نسرانہ بناتے تو علیگڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا، اگر وہ ہزار ہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لیے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ڈٹے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے تھے، کیونکر اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے، اگر وہ یورپین طریقہ پر ہائی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد نے سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ اونچے درجہ کے انگریزوں کی طرح ماند و بود کرتے ہیں گورنروں کو مہان رکھتے ہیں، اسی کے ہم نوالہ ہیں جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ سپید کو چارو ناچار فیلڈوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے پھاٹک بغیر سمجھ نہیں سکتی، اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو کوئی اعلیٰ درجہ کا انگریز یا اعلیٰ درجہ کا بیٹوان کی طرف رنج نہ کرے اور ایسی موٹی اسمیاں دام میں نہ آئیں تو چندہ کی بھاری بھاری رقمیں کن سے ہاتھ لگیں؟"

میر حال اس باب میں سرسید کی ایک خاص حالت تھی، اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو ایسی طرح فائدہ پہنچا سکے تو وہ بلاشبہ قوم کا سرتاج ہے اور بے شک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا مسٹر سمول اپنی کتاب سلف ہلپ میں لکھتے ہیں کہ جو شخص اپنے روپیے سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتا وہ بہت ہی ذلیل آدمی ہے، جو انوں کو خیال رکھنا چاہیے

کہ جوانی کی کفایت شعاری کہیں بڑھاپے میں جا کر خست نہ بن جائے اور جو کام  
 (یعنی کفایت شعاری) پہلے فرضِ اعظم تھا وہی گناہِ عظیم نہ بن جائے۔  
 اگرچہ سرسید کی زندگی پر ایسا سودگی کے ساتھ گزری اور ان کی حیثیت  
 ایک متوسط الحال شریف ہندوستانی کی حیثیت سے بہت زیادہ رہی مگر خدا  
 تعالیٰ نے ان کا حوصلہ بقابلہ ان کی حیثیت کے زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا  
 کیا تھا۔ اس لیے ان کی آمدنی کبھی ان کے اخراجات کو ملتی نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ  
 مقرض رہنا ایک لازمی بات ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو جو  
 مقرض ہو گئے تھے، اس طرح لکھتے ہیں "قرضہ کی پریشانی بلاشبہ بہت  
 رنج دہ ہے جس کے سزے سے میں خوب واقف ہوں، بہت کم مسلمان  
 ہوں گے جو اس رنج میں مبتلا نہ ہوں۔ مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلی دے  
 لیتا ہوں کہ مقرض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے، میں اس حدیث پر پورا یقین  
 رکھتا ہوں کہ "مما حیب المال کافر" جس پر حضرت ابو ذر غفاری کا یقین اور  
 عمل تھا کافر کے لفظ سے کیا مراد ہے اس بحث کو چھوڑ دو، جو اس کی مراد ہو  
 وہ ہو، لیکن ہم ابو ذر تو بن نہیں سکتے مگر خدا کی رحمت ہے جو اس نے ہم  
 کو مقرض رکھ کر کفر سے بچایا ہے۔ پس میرے دل کی تسلی کو تو یہ خیال کافی  
 ہے۔ معلوم نہیں کہ سرسید کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے  
 باز رکھا تھا یا جب مال جمع نہ ہو سکا تب اس حدیث پر یقین ہوا؟ درحقیقت  
 یہ ان کا حسن بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا ورنہ روپیہ پیسے  
 کی محبت سرے سے ان کی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی اور وہی اثر  
 ان کی اولاد میں موجود تھا کہ باوجود معقول آمدنی کے ہمیشہ مقرض اور تمہیدست

سرسید کے ایک دوست ایک زمانہ میں ان کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جب مینا ختم ہوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر ان کے دکھانے کو لے گیا، سرسید نے کہا "بس مجھے دکھانے کی کچھ ضرورت نہیں، یونہی چلنے دو، میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہو گا" حق یہ ہے کہ جو شخص بات دن اور ول کی صلاح و فلاح کی فکر میں رہے گا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہو سکتا ہے، ولیم پٹ جبراً لوگوں میں سے تھا جنہوں نے انگلستان کو انگلستان بنایا ہے، اس کی نسبت لارڈ مکالے نے لکھا ہے کہ "اُس کے بیوی تھی نہ پتھے، نہ محتاج رشتہ دار تھے اور نہ اسراف کی عادت تھی، باوجود اس کے جب وہ مراٹھوں سے ادنیٰ کاغذ کو اس کا قرضہ ادا کرنے کے لیے چار لاکھ روپیہ منظور کرنا چاہا، اگر وہ مفتہ میں پندرہ منٹ بھی انتظام خانگی کے لیے صرف کرتا تو ان تمام اخراجات کا معقول انتظام ہو جاتا، اُس کے نوکروں کی لڑائی نہایت حیرت انگیز تھی، ایک مہلتہ میں صرف گوشت کابل ساڑھے بارہ من کا تھا اور اسی کے قریب سرخ مچھلی اور چائے کا۔"

اگرچہ سرسید بمقابلہ وزیر اعظم انگلستان کے ایک نہایت غریب اور کم حیثیت آدمی تھے مگر خانگی انتظام کے متعلق ان کی بے اعتنائی نسبتہ ولیم پٹ سے کچھ کم نہ تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ ولیم پٹ کو یقین تھا کہ جس سلطنت کی بہتری کے لیے وہ اخیر دم تک کوشش کرتا رہا وہ اُس کا قرضہ ادا کرنے کی تکفل ہوگی مگر غریب سید کو چار لاکھ چھوٹے چار سو کا بھی ادا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا اور اسی لیے جہاں تک ہم کو معلوم ہے جس طرح کہ اس نے وارثوں کے لیے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی اسی طرح قرضہ کا بوجھ کسی پر نہیں

ڈالا۔ اگر بالفرض کچھ قدر قلعیل کسی کا دنیا باقی رہ گیا ہوگا تو سید کی پولیٹیکل نیشن جمہ  
اُن کے بعد ایک نسل تک جاری رہنے والی ہے، اس قرصے کے لیے کافی  
سے بہت زیادہ ہے۔

ایک دوست نے سرسید کے ایک رشتہ دار کا یہ منقولہ بیان کیا کہ سید  
احمد خاں نے اگرچہ ناجائز طور پر کبھی ایک غر مہرہ نہیں یا مگر اُن کی تنخواہ اور  
رحمیر ہی اور پولیٹیکل نیشن کی اس قدر آمدنی تھی کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتے اور  
فصلوں خرچ میں روپیہ برباد نہ کرتے تو آج اُن کی اولاد کے برابر دلی میں بہت  
ہی کم صاحب جائیداد نظر آتے۔ میں یہ سن کر چپ ہو رہا اور سعدی شیرازی کا یہ  
شعر دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔

اے کہ آگاہانہ حالت درویشاں را

توجیہ دانی کہ چپ سودا و سرست ایساں را

## انتقام کا خیال نہ ہونا

مخالفوں اور دشمنوں کی برائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی اُن سے انتقام لینے کا  
ارادہ نہ کرنا یہ بھی سرسید کے اُن اوصاف میں سے تھا جو اُن کی ذات کے  
ساتھ مخصوص تھے۔ اس شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس  
کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ برائی کا بدلہ لینا تو درکنار اس کو کسی کی برائی  
یاد بھی نہیں رہتی تھی۔ بلاشبہ محمدن کالج کی بدخواہی یا جن اصول پر سرسید نے  
اُس کو قائم کیا تھا اُن میں رخنہ ڈالنا اس کو حد سے زیادہ ناگوار گزرتا تھا مگر جن  
لوگوں کی برائیاں اس کی ذات تک محدود تھیں اور کالج تک اُن کا علانیہ طور  
پر کچھ اثر نہ پہنچتا تھا اُن کی نسبت قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی برائیاں



اُس کو محسوس بھی ہوتی تھیں یا نہیں؟

حکایات نقمان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ”ایک مچھڑیل کے سینگ پر آ بیٹھا اور یہ سمجھ کر کہ ریل پر میرا بوجھ بڑا ہوگا اُس سے کہا کہ اگر میرا بوجھ تجھ پر شاق گزرا ہو تو کہہ دے تاکہ میں اڑ جاؤں بیل نے کہا اے نادان مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو مجھ پر بیٹھا بھی ہے یا نہیں چہ جائیکہ تیرے بیٹھنے سے مجھ کو کچھ تکلیف ہوئی ہو۔“ بعینہ یہی حال لوگوں کی بُرائی کے مقابلہ میں اس شخص کے تحمل اور حوصلہ کا تھا۔

اُن کے ایک دوست راوی ہیں کہ ”سراوآباد میں جبکہ سرسید وہاں صدر الصدور تھے محکمہ صاحب حج کے ایک بندو کلرک کو سرسید سے کچھ رنجش تھی وہ اکثر گناہم عرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا، اس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور اُن کے گھر میں اُس کی لاش موجود ہے، فوراً تلاشی لی جائے۔ اسی وقت پولیس کا عملہ اُن کے مکان پر چڑھا آیا۔ سرسید نے مکان میں پرورہ کراویا اور تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا منہایت رنج ہوا، مراد آباد کا کوتوال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی پر فریاد کیا گیا۔ سرسید اور اُن کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی، جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر جب کہ سرسید کے ایک معزز پورچین دوست کو کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پا کر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھہرے تھے، اُن کو ایک لائق

انگریزی والوں کی ضرورت ہوتی۔ چونکہ سرسید اس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے انھوں نے اسی کی سفارش کی اور اُس کے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اُس کو دوسروں پر یہ مہوار کا نوکر رکھ کر لے گئے۔ جو صاحب اس حکایت کے ناقل ہیں یہ کہتے تھے کہ ” مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اُس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ بُرائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، مگر اُس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دوسرا نوکر رکھا کہ بیسج دید اُس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خاں ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اُس کی جینٹیوں کی خاک پڑ جائے اُس کی نجات ہو جائے۔“

جب رفیق ہند میں سرسید کے خلاف نہایت سخت سخت آڑھیل شائع ہونے لگے اور غشی سراج الدین ادیٹر سرسید گوٹا نے اس کا جواب لکھنے پر قلم اٹھایا تو سرسید اُن کو لکھتے ہیں ” میں نے آپ کا اظہارِ موخہ ۸ جنوری پڑھا بلاشبہ میں آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے، ممنون اور احساسِ مند ہوں اور آپ کو اس تحریر کی نسبت جو اُس پر چہ میں ہے، بوجہ جوشِ محبت معذور سمجھتا ہوں، مگر جانے دو، جو جس کا دل چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ اگر ہمارے بُرا کہنے سے اُن کا دل خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو، تم بھی اُس بُرا کہنے سے خوش ہو، کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے وہ خط جناب خان بہادر بکت علی خاں

۱۔ یہ اس گناہِ خط کی طرف اشارہ ہے جو لاہور کے جلسہ کانفرنس واقع ۱۸۵۹ء میں جانے سے ایک دن پہلے سرسید کے نام علی گڑھ میں آیا تھا اور جس میں یہ عبارت الفاظ لکھے تھے کہ ” اگر تم لاہور میں آئے تو ہمتی دراصل جو تے سے موٹری جانے گی اور جو حال کل سر بازار تھا وہ دوست (یعنی خان بہادر) کا کیا گیا ہے اس سے بڑتر تہ بال حال کیا جائے گا“ - ۱۱ -

کے پاس بھیج دیا۔ اگر ان کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ بھیجتا..... تم میرے ساتھ محبت رکھتے ہو اور اس کا بھی تم کو یقین ہے کہ جو لوگ میری نسبت عیب لگاتے ہیں وہ مجھ میں نہیں ہیں، تو تمہارے خوش رہنے کے لیے اور مجھ کو خدا کا شکر کرنے کے لیے کہ وہ عیب اس شخص میں جس کو تم دوست رکھتے ہو نہیں ہے، کافی ہے، اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہے۔ پس بُرا کہنے والوں کی بُری بات کا یہی نیک پہلو نکالو اور خوش رہو۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔“

جب منشی سراج الدین نے اس کا جواب لکھا تو پھر سرسید نے ان کو اسی مسغون کے متعلق دو سزا خط لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں ”ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں بُرا کرنے والے کی بُرائی سے ہم کو کیا کام ہے؛ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے بُرائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں اس کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں سے اس کے دُور کرنے میں کوشش لازم ہے، اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ بُرائی ہم میں نہیں ہے۔ بُرا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہیے کہ کون ہے؛ دنیا میں بے بھی یا نہیں؛ پس یہی آرام و آسائش کا طریقہ ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو یہی طریقہ اختیار کرو۔ میں یقین کرتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہ..... صاحب کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ ان سے بھلائی یا سچائی کی توقع نہیں، کچھ ہی کرو آواز ہی سننے کا۔ پس گلہ کیا ہے؛ کیا تم دنیا کے پتھروں سے گلہ کرتے ہو؛ اور کیا وہ کسی کی دشمنی سے ڈنک مارتے چلتے ہیں؛ پس ان کے حال سے بحث مت کرو لوگوں کا جیسا دل چاہے ویسا ان کے ساتھ برتاؤ کریں۔ اگر ہم سے معافی

چاہتے ہیں بہارا اس نے کیا گناہ کیا؛ کیا میری وارثی منٹ ٹگٹی؛ آپ آکر دیکھ لیں بدستور بے بلکہ خود و خود بڑھ گئی ہو گئی مجھے تمام عمر افسوس رہے گا کہ میں نے وہ خط کیوں برکت علی خاں صاحب کے پاس بھیج دیا؛ اگر خاں صاحب ممدوح کی نسبت اس میں ستوشش بات نہ لکھی ہوتی تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔ خیر! جو ہو گیا اس پر افسوس سے کیا فائدہ ہے؛

”میرے نزدیک منشی..... کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہیے۔ خدا کی دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے، تم اپنا کام کرو، مگر جان لو کہ تمہارا کیا کام ہے؛ نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب؛ دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں جس سے دل رکا ہوا ہو اس سے مت ملو، کیونکہ اس سے مل کر خوشی نہ ہوگی، یا منافقانہ طریقہ پر ظاہر داری کرنی پڑے گی، نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہے، اسی طرح ان کی باتوں کی پروا کرنے میں بالکل آرام ہے۔“

اگرچہ سرسید فطرۃ نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض ان کی سرشت میں داخل تھا مگر ان کی اہستہ دانی روک ٹوک اور حرج و تربیت سے یہ تمام ملکات ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہو گئے تھے۔ اسی نیک اور عاقل ماں نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بیڑوں کی بُرائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلا ہی لینے کا خیال ہو تو اسٹن پڑے اور نہ ہر دست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے، اسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی کرنا خود آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اسی تعلیم و تلقین کا یہ نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے واجب

اقتل ہونے کے فوٹے کھڑے میں جا کر نکھوٹے، جنھوں نے اُس کو کافر و ملعونہ  
 کرستان اور دجال ٹھہرایا، جنھوں نے گناہِ خطوں میں اُس کو گالیاں نکھ کر بھیجیں  
 اور قتل کی دھمکیاں دیں، اُن کی نسبت اُس نے علیؑ رُوس الا شہاد یہ کہا کہ " میں  
 اپنے کسی بھائی سے کسی مجلس سے نہ دنیا میں بدلا لینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں  
 میں نہایت ناچیز ہوں مگر اُس رسولؐ کی ذریت میں ہوں جو رحمتہ للعالمین ہے  
 میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا اور تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھ کو سزا کہا، جنھوں نے  
 مجھ پر اتہام کیا یا آتشہ کہیں اور کریں سب کو معاف کروں گا۔"

فی الحقیقتہ اچھی ماں اولاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اُس میں عمدہ  
 اخلاق کی بنیاد ڈالتی ہے اور سیراٹیوں کا رخ نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سیرت  
 کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت غنیظہ و  
 غضب پر مجبول ہوئی تھی مگر ماں کے حسن تربیت نے گویا اُن کی ماہیت بالکل  
 بدل دی تھی۔ اُن کے رشتہ داروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں نے  
 بیٹے کو کبھی کسی ماں یا نوکر پر بھی سختی یا بدزبانی نہیں کرنے دی اور اگر کبھی  
 کوئی ایسی حرکت اُن سے صادر ہوگئی تو اُن کو ایسی سزا دی گئی جو عمر بھر  
 فراہوش نہ ہو۔ چنانچہ ایک بار جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ایک نوکر پر زیادتی  
 کرنے کے جرم میں اُن کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور کئی دن کے بعد جب انھوں  
 نے نوکر سے قصور معاف کر لیا، تب گھر میں آنے کی اجازت ملی۔ اگرچہ  
 جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے مگر جبلت نہیں  
 بدل سکتی۔ لیکن عمدہ تربیت جس طرح گھوڑے کی ٹوسنی اور سرکشی کو چالاک سے  
 بدل دیتی ہے اسی طرح انسان کے غنیظہ و غضب کو ادا العز می اور دلیری  
 کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور وہی چیز جو پہلے درندوں کی خصیلت



معلوم ہوتی تھی اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسید میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُن کا جلی غنیمت و غضب فی الواقع، مہجنتوں کی حمایت اور جوش ہمدردی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُن کو پرائیویٹ معاملات میں سما اس کے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا اُبال آجاتا تھا۔ بہت ہی کم غصے ہونے دیکھا ہے جو کچھ اُن کا غصہ اور افسوس تھا وہ قوم کی غفلت یا نالائقی پر تھا۔ یا اُن کی تنہا ہی و بربادی پر یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر یا قوم کے بے جا تعصبات اور اُن کی پوشیل بے وقعتی پر۔

مکن ہے کہ بمقتضائے بشریت کسی کی طرف سے اُن کے دل میں کچھ رنج ہو مگر اُن کے ظاہر حال اور قول و فعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کسی کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اس کو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیاں دیتے تھے اُن کا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتا تھا۔ اس کے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ اُس کا اخبار تھا جو پچیس برس جاری رہا مگر کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی اس میں نہیں لکھی گئی۔ وہ جس طرح اپنے اخبار کو چھڑ چھپاؤ اور سنزل اور حرمت گیری و کج بگوشی سے پاک رکھتا تھا اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو ان لغویات سے بچنے کی نصیحت کرتا تھا۔ وہ ایک اخبار کے ادیٹر کو لکھتا ہے جس میں بطور تیغ اخباروں کے کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا تھا "کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالائقی اخباروں کے تافہذب ہونے کو ہے؛ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون مذاق نوشتہ ... آپ کے اخبار ۳۰ اپریل میں چھپا ہے۔ آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا۔ لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع تھا کیا اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت و قدر کھو دے؟"



اسی ایڈیٹر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں، بدگو کے ساتھ گوبدگوٹا کی تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں، میری نسبت لوگ کیا گیا کچھ نہیں لکھتے ہیں؛ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا؛ ہندوستانی ریاستیں ہندوستان میں قیمت ہیں ہمیشہ انکے ساتھ دوستانہ تہاؤ چاہیے" ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد ایڈیٹر سر مور گزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بہاول پور کی شکایت لکھی کہ وہاں سے علیگڑھ کالج کے لیے کچھ چنہ نہیں پہنچا۔ سر سید نے فوراً ان کو تنبیہ کیا اور لکھا کہ "سرکار بہاول پور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کے لیے اور چند روئے ہوئے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے مرحمت کیا ہے۔ چونکہ اس کی اطلاع آپ کو ضروری تھی اس لیے فی الفور یہ مختصر نیا زمانہ روانہ کرتا ہوں۔"

الغرض اس کے تمام جذبات اور تمام نیشن ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہو گئے تھے، اس کا غصہ تھا تو قوم کے لیے، شکایت تھی تو قوم کے لیے، حرص و طمع تھی تو قوم کے لیے اور خود غرضی تھی تو قوم کے لیے، اپنے لیے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

## خود غرضی کا الزام

سر سید پر اکثر خود غرضی کا الزام لگایا گیا ہے، بے شک خود غرضی کو اگر زیادہ وسیع معنوں میں لیا جائے تو ایک لحاظ سے ان کو خود غرض کہا جاسکتا ہے، جو عظیم الشان کام انھوں نے قوم کی ترقی کے لیے اختیار کیا تھا اور جس کے بغیر وہ قوم کی حالت کا درست بیرونا غیر ممکن سمجھتے تھے بلاشبہ ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے چھر کر ڈیڑ مسلمان یک دل و یک جان ہو کر اپنی تمام بہت

طاقت اور استطاعت اُس کام کے پورا کرنے میں صرف کر دیا اور جب تک  
اُس کو مقربائے ترقی تک نہ پہنچائیں دوسرے کام کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں  
یہاں ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُن کی یہ خواہش ممکن الوقوع تھی یا نہیں؟ اور  
آیا فی الواقع جیسا کہ وہ سمجھتے تھے مسلمانوں کی بھلائی کا صرف یہی ایک راستہ  
تھا کہ سب مل کر اُن کے کام میں مدد کریں، مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا ہی  
سمجھتے تھے۔ اگر اسی کا نام خود غرضی بنے تو ہم کو اپنی قوم کی پہرہ کی بے  
ایسے بہت سے خود غرضوں کی ضرورت ہے، اور ہم اُسید کرتے ہیں کہ اگر  
مسلمانوں میں ایسے دس بیس بلکہ دو چار خود غرض بھی اور پیدا ہو جائیں تو ساری  
قوم کا پیرا پلہ ہو جائے۔ دنیا میں ایسے نیک آدمیوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو ہر  
ایک کے کام میں مدد دینے اور ہر جگہ گاڑی میں کندھا لگانے کو موجود ہیں، لیکن  
ایسے افراد صدیوں اور قرونوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو تمام دنیا کو اپنا معاون  
و مددگار بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اُن کو اپنے کام کی برائی کا ایسا یقین ہوتا ہے  
کہ اُس کو تمام دنیا کے کاموں سے مقدم جانتے ہیں اور چونکہ اور لوگ بھی جوں جوں  
اُن کے کام کی حقیقت کھلتی جاتی ہے، اس کو ویسا ہی یقین کرتے جاتے ہیں  
اس لیے اُن کے دل میں اپنے کام کی عظمت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

## حُبِ جاہ کا الزام

بعض اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ سید احمد خاں نے جو کچھ قوم کی خیر خواہی  
کے پردہ میں کیا اُس سے محض اپنی ناموری اور شہرت اور گورنمنٹ میں اعزاز حاصل  
کرنا مقصود تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حسرت میں مرے جاتے ہیں کہ ہم کو بھی  
ویسی ہی ناموری اور اعزاز حاصل ہو جائے مگر چونکہ اس کا استحقاق نہیں رکھتے

اس لیے کبھی اپنی سرا کو نہیں پہنچتے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت چاہنے سے عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عزت کے لائق کام کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے جو لوگ قوم کی خیر خواہی کی آڑ میں اپنی شہرت اور اعزاز چاہتے ہیں، نہ ان سے قوم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود ان کو شہرت اور عزت نصیب ہوتی ہے لیکن جو شخص سچے دل سے قوم کی بھلائی کے کام کرتا ہے عام اس سے کہ وہ اپنی شہرت و عزت کا خواہاں ہو یا نہ ہو، وہ قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور خود بھی شہرت و عزت حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ”فَوْضُ مَدْحِكَ وَتَمَكُّكَ إِلَىٰ اَعْلَىٰ نَبَاتِهَا تَعْدُ حَلْفَ اَبِيْدِقَانٍ اَخْلَسَتْ وَتَدْمُكَ بَعِيْتِ اِنْ اَسَاتْ“

جو لوگ سرسید کی نسبت ایسے لپیٹ خیالات رکھتے ہیں ان کے جواب میں ان سے زیادہ کہنا فضول ہے جو نواب عماد الملک نے سرسید کی دعوت کے جلسہ میں جو نظام کلب جید آباد میں ۱۸۹۱ء میں منعقد ہوا تھا، کہا تھا کہ ”کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں“

## اپنی راستے پر تعلق

منجملہ اور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف میں جو سرسید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ ان میں یہ تھا کہ ان کو اپنی ہر ایک

لے یعنی اپنی تعریف اور مذمت اچھے کاموں کو سوچ دے کیونکہ وہی تمہاری بھلائی کے لیے مداح اور تمہاری برائی کے لیے مذمت کرنے والے ہیں۔ ۱۲۔

رائے پر خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ کس اور معاملہ سے ہمیشہ ایسا وثوق  
 معلوم ہوتا تھا کہ کس دلیل یا سبب یا مخالف پارٹی کی مجارٹی سے اس میں نزلزل  
 آنے والا نہیں۔ اسی لیے ان کو عموماً خود رائے اور بیٹھا کہا جاتا تھا۔ یہ تو ظاہر  
 ہے کہ ان کی ہر ایک رائے جس پر ان کو اصرار ہوتا تھا ہمیشہ صائب اور غلطی کے  
 پاک نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر ان کو اپنی راپوں پر ایسا وثوق  
 جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نہ ہوتا تو جو بڑے بڑے کام ان سے بن آئے ان میں  
 سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ انھوں نے قوم کی بھلائی کے لیے جتنے کام اٹھائے  
 وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور ان کی نگہ سے ماہر تھے۔ یہاں تک کہ  
 ولایت میں جیسا کہ ان کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے منصوبوں  
 سے سید مبدی علی خاں کے سوا اپنے اور دوستوں کو بہت کم مطلع کرتے تھے  
 کیونکہ کسی سے یہ امید نہ تھی کہ ان کی رائے سے اتفاق کرے گا اور ان کی ہمت  
 بندھوائے گا۔ پھر جب ہندوستان میں آکر انھوں نے اپنے منصوبے علی الاعلان  
 پورے کرنے کا ارادہ کیا تو جیسا ان کو خیال تھا، ہزاروں مخالف کھڑے ہو گئے  
 اور جہاں تک ہو سکا ان کے کاموں میں کھنڈت ڈالی۔ باوجود اس کے ہر ایک  
 کام میں ان کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مخالفین روز بروز کم ہوتی گئیں  
 اور آخر کار ان کے کام نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے  
 لگے۔ اگر ان کی رائے مستزلزل ہوتی اور ان کو اپنی تجویزوں اور منصوبوں پر  
 کامل وثوق نہ ہوتا تو کیونکر ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکتی  
 تھی جن کا سا زمانہ مخالف ہو اور کیونکر ان کی کوششیں اس درجہ تک  
 کامیاب ہو سکتی تھی۔ پھر جس قدر ان کی تجویزیں اور منصوبے پورے ہوتے  
 گئے اور جس قدر لوگوں کی مخالفت بچا اور ناواجب ثابت ہوتی گئی اسی قدر

اُن کو اپنی بلائوں پر زیادہ دُتوق ہوتا گیا اور اپنی ہر ایک بلا سے پہلے اُن کا اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ اب چاہو اس فصلت کو اُن کی خود بلائی اور ہیلے پن کے ساتھ تعبیر کرو اور چاہو یہ سمجھو کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں اور جن سے مخلوق کو عظیم الشان فائدے پہنچے ہیں وہ سب ایسے ہی قوی اور مضبوط دل والے تھے کہ جو ارادہ کرتے تھے اس پر ثابت قدم رہتے تھے اور جو منصوبہ باندھتے تھے اُس کو پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ اُن کی رائیں مستقل اور غیر متزلزل ہوتی تھیں، وہ اپنی غلط بلائوں پر بھی ویسا ہی اصرار کرتے تھے جیسا صحیح رايوں پر، کیونکہ وہ انھیں رايوں کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے۔

با اینہم اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود بلائی یا جو دُتوق کہ اُن کو اپنی رايوں پر تھا وہ خدا عزوجل سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکہ ایسا عالی دماغ ان کمزور اور بودی تادیلوں کو صحیح سمجھتا ہے؛ بہرچند کہ اُن کے دوست اُن تادیلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔ کالج کے متعلق بھی اخیر زمانہ میں اُن سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جن کو لوگ تعجب سے دیکھتے تھے مگر درحقیقت ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کے قابل نہ تھی۔ جو حیرت انگیز کاسیانی باوجود سخت فحاشیوں اور مزاحمتوں کے سرسید کو اپنے مقاصد میں ہوئی اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں جو کہ تو اُن کے انحطاط اور فتور کا زمانہ تھا، اُن کو اپنی اہمیت رائے پر جتنا کہ چاہیے تھا اس سے زیادہ اعتماد ہو جانے اور وہ اپنی عقل اور سمجھ کو خطا اور غلطی سے پاک سمجھنے لگیں اس کے سوا اخیر عمر کے صدقات نے بھی اُن کے دل و دماغ پر کچھ کم اثر نہیں کیا تھا۔ قطع نظر اس کے انسان کا

متہائے کمال یہ ہے کہ اُس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں، نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بے شمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا بجائے اس کے کہ اُن کے اخلاقی نقص کی دلیل ہو، اُن کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی نفسیت اور قابلیت پر دلالت کرتا ہے، گویا شاعر نے سرسید ہی کی شان میں یہ شعر کہا تھا: "شخص الا نامہ الی کمالک۔ فاستعذ۔ و ن شراً عندی من بعد یعیب و اجل۔"

یعنی ترے کمالات دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رو گئی ہیں سداں کی نظر بد سے بچنے کے لیے کسی عیب کی پناہ ہے۔)

## مذہب

سرسید کی مذہبی خدمات و اصلاحات اور مذہبی تحقیقات کے متعلق جو کچھ اُن کی تصنیفات سے ثابت ہوا، بقدر ضرورت بیان ہو چکا ہے یہاں ہم اُن کے وہ مذہبی خیالات دکھانے چاہتے ہیں جو اُنہوں نے اپنے پرائیویٹ خطوں میں یا کسی پبلک تقریر میں ظاہر کیے ہیں اور جن سے ان کے دل کی اصلی کیفیت اور اصلی واردات متکشف ہوتے ہیں، کیونکہ تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بعد غور و خوض کے تمام پہلو اور جوانب دیکھ کر لکھا جاتا ہے۔ اور جہاں تک مصنف کے اسکان میں ہوتا ہے وہ اپنی تصنیف کو کم سے کم اُن لوگوں کی نکتہ چینی سے بچانے میں ضرور کوشش کرتا ہے جن کو وہ اپنے نزدیک مخاطب صمیم جانتا ہے۔ بہ خلاف اس کے پرائیویٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہمراز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جن میں سوچنے اور غور کرنے کا نہایت کم موقع ملتا ہے اُن سے اُس کے دل



کئی تنگی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس کے دل خیالات روز روشن کی طرح سب پر ظاہر ہوتے ہیں پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مذہبی خیالات جو کھلے دکھنے پر انھوں نے اپنے بازو دستوں کو کھٹے ہیں یا کسی پبلک جلسہ میں بے ساختہ اور بجاہتہ ظاہر کیے ہیں یا جو ایسے ہی کسی اور طریق سے ہم تک پہنچے ہیں اس عنوان میں کسی قدر ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں۔

## حقیقت اسلام کا یقین

جہاں تک کہ سرسید کے اقوال اور انعال اور خیالات سے استدلال ہو سکتا ہے ان کو دین اسلام کی حقیقت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اگرچہ ان کے مذہبی خیالات اور مذہبی عقائد مسلمانوں کے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور عقائد کے تابع نہ تھے مگر ان کا ایک عقیدہ بھی شاید ایسا نہ نکلیے گا جو اصولاً کسی نہ کسی اسلامی فرقہ کے عقیدہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ ان کو اہل سنت کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے زیادہ بتدریج کہا جاسکتا ہے جیسا کہ اکثر اکابر اسلام کو کہا گیا ہے۔ لیکن ان کی نسبت کافر یا ملحد یا نیچری بمعنی نیچر لسٹ کہنا اسی قسم کا بہتان ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر مذہب میں محققوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے۔

انھوں نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا اس میں اپنے عقائد صاف صاف بیان کیے تھے۔ اس لیے اول ہم اس لکچر کے چند مقامات اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ لیکن ہر ایک عقیدے کے ساتھ جو کچھ انھوں نے بطور دلیل کے بیان کیا ہے اس کو ان کے لکچر میں دیکھنا چاہیے۔ اول انھوں نے کہا کہ "میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ سولہوی ہوں، نہ مفتی

نہ قاضی اور نہ داعی، نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص گودہ یا کیسا ہی دوست ہو، وہ میرے خیالات کی پیروی کرے، یہاں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن ازلوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جن کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازل مذہب خدا ابد آباؤ تک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھے گا کیونکہ جیسادہ ازل ہے ابدی بھی ہے، ختم ہو گیا۔

## توحید

پھر کہا کہ "وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جاسکتا ہے وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو بہ حق جانتا ہے اور اُس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ یہی رکن اول اور رکن اعظم اسلام کا ہے اور باقی ارکان اُس کے تحت ہیں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کسی خاص دعا کی معجون ہو اور اسی کے ساتھ اس کے اجزا بھی ملے ہوئے ہوں۔ خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جانا اور سمجھنا نہ صرف جانا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین کرنا، اسلام ہے اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔ پھر کہا کہ "خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اُس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اُس کی ذات اور صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اُس کے استحقاق عبادت پر جو اُس کو لازم ہے، پورا پورا یقین ہو، اس کی ذات کا یقین تو اُس کے موجود بالذات انہی وابدی وحدۃ لا شریک لہ ہونے پر یقین ہوتا ہے۔ اس کی صفات کا یقین اُس کے مانند صفات کا کسی دوسرے میں نہ ہونے

پر یقین کرنا ہے۔ تمام صفتیں جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں، عالم، رحیم، صی اور مثل ان کے اور جو ان کا مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اور جن میں اور ان کا اشتراک بھی بوجہ تا تصور ہوتا ہے اس مفہوم سے اور اس اشتراک سے بھی خدا کی صفات کو ٹیڑھا اور منترہ ماننا اس کی صفات پر یقین ہونے سے اس کے استحقاق عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شے ہو خدا کے مستحق عبادت نہیں جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے.....

## رسالت

ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خدا کے واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں..... محمدی ہونے کے لیے ضرور ہے کہ ہم اس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی..... جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا اور اس کی صفات کو پہچانا، یقین کریں، خود عقل ہی ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جس سے ہم کو ہدایت ہوئی کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے ہادی ہونے پر یقین نہ کریں اسلام جس کو میں نے ایسے استحکام سے سچا بنایا اس کی ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ پس اس کی تصدیق بالقرۃ دوسرا رکن اسلام کا ہے جو پہلے رکن سے منفاک نہیں ہو سکتا۔

"اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدہ لا شریک جانتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق نہیں کرتا اس کی نسبت یہ کہنا کہ محمدی نہیں یا سرادف معنی لے کر یہ کہنا کہ وہ مسلمان نہیں، بالکل صحیح ہے مگر اس کو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کے اصول کی رو سے درست

تہیں..... موحدینِ محض کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے پر قدیم سے علما میں بحث چلی آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مخلد فی النار ہوں گے، کوئی کہتا ہے کہ بعد عذاب کے نعمت پاویں گے۔ اس بحث کو انھیں عالموں کے لیے چھوڑ دو اور ہم کو اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو کہ ”علیٰ ذمہ انفا ابی ذرؓ“

## فرائض منصوصہ

پھر کہا کہ ”وعدائیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہگار اور ان کے شکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے شکر کی نسبت کہا ہے کہ وہ ٹھکری نہیں یا بمعنی سرادق مسلمان نہیں۔ اس کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے کی وہی بحث پیش آ جاتی ہے جو ابھی موحد محض کی نسبت میں نے بیان کی۔“

## شُرک فی النبوة

پھر کہا کہ ”شُرک کی بحث جو کہ اسلام کا پورا دشمن ہے اور جس کے ساتھ اسلام جمع ہی نہیں ہو سکتا، بہت بڑی ہے، مگر میں اس وقت ایک شتمہ اس کا

لہ یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے ابو ذر غفاریؓ سے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے ایروز سے فرمایا: ”یا ہن عبد قال الا الہ الا اللہ ثم مات علی ذلك الا دخل الجنة“ انھوں نے یہ سن کر زمین باہر ازراہ تعجب یہ الفاظ عرض کیے کہ ”وان تری وان سرق، اور آپ نے فرمایا کہ وان زنی وان سرق اور تیری دنہ اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ علیٰ ذمہ انفا ابی ذرؓ ۱۲

بیان کروں گا۔ جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وعدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قراء و بیٹے میں وعدت ہے اور کسی کو اس میں شرکت نہیں پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اسی کی تابعداری کو باعث سبجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو میں شرک فی النبوة سے تعبیر کرتا ہوں، خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات پر ملزم ٹھہرا کر فرمایا "اتخذوا حبانہم و روباہوا و رابا من دون اللہ" پس اس طرح کی پیروی ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیتی ہے۔

## ائمہ مجتہدین

سیری اس تفسیر سے آپ یہ تصور کریں کہ میں ائمہ مجتہدین کے برخلاف رائے رکھتا ہوں۔ نہیں، میں ان کو امت کا سرتاج اور ان کے اجتہادوں اور اختلافوں کو باعث رحمت سمجھتا ہوں۔

## مقلدین

یہ بھی آپ غیاں نہ کوں کہ میں ان کے پیرو مقلدین کو برا کہتا ہوں یا تقلید کو برا جانتا ہوں مگر اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ مقلدین کے بعض افعال اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ انہوں نے اپنی غلطی سے نہ کہ ان کی تقلید سے ان کو ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ تقلید کے برخلاف ہیں اور عدم تقلید کے مسئلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے اجراء میں کوشش کرنی چاہتے ہیں ان کی بھی میں عزت کرتا ہوں۔

## غیر مقلدین

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مقصود ایک ہے اور دونوں خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں فرقوں کے سبب باہم رنج و عداوت پیدا ہوئی ہے۔ یہ شیطان کے دسوسے ہیں جو گروہ اسلام کو متفرق کرنے اور قوت کو ضعیف کرنے کی فکر میں ہے۔ حقیقت میں اسلام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اس پر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گویوں کو بھائی سمجھنا ہے۔ باہمی اختلافات کی وجہ سے اسلام کے مجمع کو متفرق کرنا اصول اسلام کے برخلاف ہے اور اس برکت کی ناشکری ہے جو خدا نے دی ہے اور جس کو فَلَاقَ بَيْنَ قَوْمٍ يَكْفُرُ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔“

## نبوت پر استدلال

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مندرجہ ذیل تقریر کی۔ ایک ایسے شخص نے جو ریتیلے نگریلے ملک میں پیدا ہوا، جو چھوٹی عمر میں یتیم ہو گیا، جس نے نہ کسی دارالعلم میں تعلیم پائی نہ سقراط اور بقراط اور افلاطون کے مسائل کو سنا نہ کسی استاد کے سامنے تعلیم کو بیٹھا، نہ حکما اور فلاسفوں اور پولیٹیکل و مارل سائنس کے عالموں کی صحبت اٹھائی، بلکہ چالیس برس اپنی زندگی کے تا تربیت یافتہ اور بد اخلاق اونٹ چرانے والوں میں بسر کیے، چالیس برس تک بجز ایسی قوم کے جو بت پرستی اور باہمی جنگ و جدال میں مبتلا تھی اور چوری اور زنا کاری پر عورت و مرد کو فخر تھا اور کسی کو نہیں دیکھا، وہ دفعۃً اپنی تمام قوم کے برخلاف اٹھا، چاروں طرف سے وہ بت پرستی میں گھرا ہوا تھا مگر اس نے کہا تو یہ کہہ لایا لا الہ الا اللہ



اس نے صرف یہ کہا ہی نہیں بلکہ تمام قوم سے بھی جو سیکڑوں برس سے لت و  
 سنات و سوزنے کو پوجتی آتی تھی۔ یہی کہو اویا، اُن غلام بد اخلاقیوں اور اہم مورل  
 عادتوں کو تمام قوم سے سزا دیا۔ بتوں کو زمین پر گر دیا۔ اُن کو ٹوڑ دیا اور خدا کے  
 نام اور خدا کی پرستش کو تمام عرب کے جزیرہ تماہیں بلند کیا۔ وہ جزیرہ جو ابراہیم اور  
 اسمعیل کے بعد سے ہزاروں ناپاکیوں سے ناپاک ہو گیا تھا پھر اُس کو اُس کی اصلی  
 پاکی اور دین ابراہیم کی بزرگی تک پہنچا دیا، چالیس برس بعد کس نے یہ نورا اُس  
 کے دل میں ڈالا جس نے نہ صرف جزیرہ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو روشن کر دیا۔  
 ”اُس نے لا الہ الا اللہ کی تسلیم کے بعد جو احکام دین کے اور اخلاق کے  
 لوگوں کو بتائے کیا کوئی فلاسفر اس سے واپس ہٹا سکتا تھا جو اُس اُمی نے بتائے  
 صرف بتائے ہی نہیں بلکہ اپنے پاک دل، اپنی پاک زبان کے اثر سے لوگوں  
 کے دلوں میں بٹھلا دیئے۔ یہ کام وہ تھا جو نہ کسی فلاسفر سے ہو سکتا تھا نہ کسی  
 سلطان مقتدر سے۔

پھر کیا چیز اُس بچہ میں تھی جس نے جزیرہ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو خدائی کا  
 کرشمہ دکھلا دیا؟ کوئی سخت سے سخت دہریہ اور لاندہب بھی اگر ایسے شخص  
 کو معاذ اللہ نبی نہ مانے گا تو اس کو یہ ماننا تو ضرور پڑے گا کہ اگر بعد خدا کے کوئی  
 دوسرا شخص بزرگ ہے تو یہی ہے۔ رومی خدا کا یا رسول اللہ پس جو شخص نبوت  
 کی حقیقت کو سمجھے گا تو اسکان سے خارج ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم کی تصدیق نہ کرے۔

## اعجاز قرآن

پھر قرآن کے معجزہ ہونے پر سند درجہ ذیل تقریر کی ”قرآن مجید جو تیرہ

سو برس سے معجزہ یقین کیا جاتا ہے میں بھی معجزہ ماننا ہوں مگر ہمارے قدمائے  
 صرف ایک ادب پر ہی دلیل اُس کے معجز ہونے کی قرار دی تھی۔ یعنی فصاحت اور  
 کلام کی عمدگی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آج تک کسی بشر سے نہ کسی فصیح و بلیغ  
 سے اُس کی ایک یا دس آیتوں کے برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا۔ باوجودیکہ  
 اُن سے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہہ لاؤ۔ بلاشبہ میں بھی قرآن  
 مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں۔..... لیکن یہ دلیل..... ایسی  
 نہیں ہے جو غیر معتقد لوگوں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہو اور اُن کے  
 دل کو تسلی دے سکتی ہو۔ میں ایک اور دلیل رکھتا ہوں جس کو میں اس دلیل  
 سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں۔ وہ دلیل کیا ہے! وہ ہدایتیں انسان کے لیے  
 ہیں جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی اور ہدایت اس کے مثل بہ شک  
 نہیں ہو سکتی۔ میں اس کو بھی معجزہ بلکہ اصلی معجزہ قرآن مجید کا سمجھتا ہوں ۛ

وہ قرآن مجید اُس زمانہ میں نازل ہوا جو جاہلوں اور نادانوں اور ناتربیت  
 یافتہ لوگوں کا زمانہ تھا، وہ اس زمانے کے جاہل لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی  
 تھا اور اُن اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی تھا جو اُس  
 وقت کی دنیا میں تھے اور جو آئندہ دنیا میں ہونے والے تھے، ضرور تھا  
 کہ اُس کی ہدایتیں اس طرح پر بیان کی جائیں کہ اُس سے ایک صحرائی ادنیٰ چرانے  
 والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط اور بقراط دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔  
 قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے  
 مختلف درجوں کے متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک  
 جاہل بدو، ایک مقدس مولوی اُس کے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے  
 ایسا ہی ایک فلاسفر انھیں الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے۔

اور کسی لفظ کو پتھر یا فلسفہ سے خلافت نہیں پاتا، کسی زبان میں، فریج، لیٹن  
 عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ میں کوئی ایسی کتاب لکھ دو یا اگلے زمانے کی  
 لکھی ہوئی کتابوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت کے بھرے ہوئے  
 ہوں اور پھر نہایت دلکش اور سہل الفاظ میں اور پھر اس سے جاہل اور عالم عالی  
 اور فلسفی سب کو یکساں فائدہ حاصل ہو اور سب کے دل پر یکساں اثر ڈالے  
 نہایت ناممکن ہے۔ مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود  
 ہیں اور یہی اس کا اصلی اور سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اس کے مسائل جیسے  
 اس زمانہ میں سچے تھے جب کہ زمین ساکن مانی جاتی تھی ویسے ہی اب بھی سچے  
 اور قابل تسکین ہیں جبکہ سورج ساکن اور زمین گھومتی مانی جاتی ہے، اور یہ حکمت  
 و فلسفہ جو اس زمانے میں سچی مانی جاتی ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو، جیسے یونانی  
 حکمت اب غلط ثابت ہوئی ہے، اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول  
 سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید فریسا ہی سچا ثابت  
 ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی  
 وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔

## فرائض منصوصہ

پھر نماز روزہ وغیرہ کی نسبت اس طرح بیان کیا "غیر مشتبہ منصوصہ  
 مسائل جیسے نماز روزہ حج اور زکوٰۃ ہیں اور جو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرض  
 بتائے ہیں، ان کو میں بھی اسی طرح فرض سمجھتا ہوں جیسے ایک جاہل مسلمان  
 یقین کرتا ہے، لیکن جب ان پر مخالف کا حملہ ہوتا ہے تو ان کی لمیت اور  
 اہلیت بتانی ضرور پڑتی ہے، اگر یہ بحث پیش ہو کہ ہاتھ منہ دھونے کو

یعنی وضو کو) عبادت سے جس کا تعلق دل سے ہے، کیا تعلق ہے؛ حدیث کے بعد بے محل منہ میں کلمی کرنے سے کیا تعلق ہے؛ غانہ کو حیر ایک روحانی فعل ہے اٹھنے بیٹھنے سر نیچا اور سرین اوپنچے کرنے سے کیا علاقہ ہے؛ تو یہ مجبوری ہم کو اس کی اصلیت اور نماز کے ارکان کی میت پر بحث کرنی ہوگی اور سمجھانا پڑے گا کہ وضو کیوں فرض کیا گیا ہے؛ اور نماز کے ارکان کیوں قرار پائے ہیں۔

## دین اسلام

پھر دین اسلام کی نسبت اس طرح بیان کیا "میرا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام ایک مکمل اور آخری مذہب ہے۔ مجھ کو خدا سے اس قول پر یقین کامل ہے کہ "الذیوم اکملت لکم دینکم و اقمتم علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً" مگر جب مفسرین و خدا ان پر رحمت کرے، اس تکمیل کے یہ معنی بتائیں کہ خدا نے فلاں جانور کو حلال اور فلاں جانور کو حرام بنا کر دین کو کامل کر دیا ہے تو میں ان سے مخالفت کرتا ہوں گو کہ وہ فخر الدین رازی ہوں، یا ملا علی نیشاپوری۔ بیان سے بڑھ کر اور کوئی۔ اور ان بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ جناب اگر یہی معنی تکمیل دین کے ہیں تو سلام؛ میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر غلط ہے۔ دین اسلام خدا کی توحید کے کامل طور پر بتانے سے، اس کے ہر ایک قروع و اصول کو روشن کر دینے سے مکمل ہوا ہے یہی تکمیل دین کی ہے اور اس تکمیل کے سبب وہ آخری دین ہے اور اس تکمیل کے سبب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی بغیر تبدیل کے قائم رہے گا۔"

## حمایت اسلام کی وجہ

پھر لکچر کے اختتام پر یہ الفاظ کہے کہ "جو تائید اسلام کی ہیں نے اپنی ناست میں اختیار کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ مخواہ مجھ کو اسلام کی تائید کرنی چاہیے۔ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اس میں چلے جانا دوسری بات ہے اور اس کی تائید پر متعد ہونا دوسری بات ہے۔ پچھلی بات اس شخص کو زیبا نہیں ہے جس نے پورا یقین اس پر خود نہ کر لیا ہو۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کیا ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے اور میں اس دل یقین پر اس کی تائید کرتا ہوں نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں۔"

یہاں تک سرسید کی اس تقریر کا خلاصہ تھا جس میں انھوں نے بمقام لاہور اسلام کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ اب ہم ان کے بعض پرائیویٹ خطوط سے چند متغالات الفاظ کرتے ہیں جو انھوں نے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوں میں کچھ تو وہ ہیں جو ہم کونٹری سراج الدین احمد کے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں اور کچھ ہم نے اور ذریعوں سے بہم پہنچائے ہیں۔

## حقیقت اسلام کا یقین

اگرچہ سرسید عام لوگوں کے کافر و ملحد کہنے سے کچھ ناراض نہ ہوتے

تھے مگر جو لوگ اُن کے حالات سے سنجوئی واقف تھے اگر وہ اُن کی نسبت ایسا خیال بھی کرتے تھے تو اُن کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے ولایت جانے کو تھے ایک خط حکیم غلام نجف خاں مرحوم نے جن کے ساتھ اُن کی اور اُن کے بڑے بھائی کی دوستی اخوت کے درجہ تک پہنچ گئی تھی اُن کے پاس بھیجا تھا جس میں غالباً اس قسم کی کوئی بات ہوگی کہ ولایت جا کر مذہب کو نہ چھوڑ دینا یا عیسائی نہ بن جانا۔ انھوں نے ولایت پہنچ کر اُس کا یہ جواب بھیجا:

”حادث نے آپ کا عنایت نامہ مجھے دیا تھا میں نے خیال کیا تھا کہ جب میں ولایت سے پھر کراؤں گا اور آپ سے اشاء اللہ تعالیٰ ملوں گا اسی وقت جواب دوں گا۔ حقیقت میں وہ عنایت نامہ محبت آمیز منہسی کی بات تھی، نہ جواب لکھنے کے لائق۔ اگرچہ میں یقینی سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم پرانے وقتیا کو سی ہندوستانوں کے سے ہیں، حال کے زمانے کی جہ باتیں ہیں نہ وہ وہن میں آتی ہیں اور نہ پسند ہوتی ہیں، مگر خاص جس امر کی نسبت آپ نے مجھے لکھا اس کا نہایت تعجب ہے اس لیے کہ میری نسبت اس قسم کے خیالات کی الیتہ جاہل ناواقف آدمی کو گنجائش ہو سکتی ہے یا دشمن و حاسد جو کچھ چاہیں خیال کر سکتے ہیں، مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیوں نہ ہوا؟ شاید بمقتضائے محبت ایسا خیال ہوا ہو اس لیے کہ دوست کو ہمیشہ بڑے بڑے خیالات گزرتے ہیں جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اُس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے علمی و ادبی والوں کو احد ہزار ہزارہ وائے کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشدی کا جُستہ و دستارے کرتے ہیں اُن کو بھی نہیں ہے۔ والسلام“



## تقلید کی مخالفت

ایک خط میں سید مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں: ”میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ بچاتا، اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر توجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔ فرض کرو کہ تقلید چھوڑتے میں کسی مسئلہ یا عقیدہ میں غلطی میں پڑوں چنداں نقصان نہیں، مسلمان تو رہوں گا..... جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ کوئی معما اور بدر چاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین معانی درکار ہوں۔ خدا فرماتا ہے: ”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ ذُرِّيَّتَهُمُ الْعَرَبِيَّةَ لِيُتْلَىٰ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ كَرِيْمًا لِّيُذَكِّرَ الَّذِينَ لَمْ يَرْجِعُوا إِلَى اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ“۔

## تقلید کی مخالفت

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”بھائی جان سنو! اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنے مکتوبات نمبر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اُس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برا بھلا سمجھتا کیا ہے جو میں ہر

کی تحقیقات کرنا ہوں اور تقلید کی پرغا نہیں کرتا، ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور ہمیشہ میں داخل ہونے کے لیے ائمہ کبار تو درکنار مولوی جٹو کی بھی تقلید کافی ہے لاکھ لاکھ اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں کہ بدلائل و مباحثہ مجھ کو قائل کرو یا چائے کہ میری یہ رائے صحیح ہے یا غلط؟ اور میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابو بکرؓ اور عمرؓ کے دوست اسلام ہوں؟ آیا میں جو اسلام کو ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ سے زیادہ درست رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ تو درکنار ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی بالغرض اگر کچھ غلطی کریں تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا، اور میرا یہ اعتقاد کہ اگر تمام عالم کافر ہو جائے یا تمام عالم فرشتہ ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کچھ زیادتی یا نقصان نہیں ہوتا، اسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں ہے۔ پس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے یا غلط؟

پھر اسی خط میں لکھتے ہیں "لوگوں نے جہاں خبروں میں مجھ کو برا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آگیا، معلوم نہیں کہ آپ نے آئیکل میں کیا لکھا ہوگا؛ مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے، میں تو بدست تیرے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میرے دوسوڑی کی فتور کریں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا، شخص اسلام کے حق میں تقلید شکمبا سے بھی زیادہ دیر تامل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ سے

کے ازباآمن دون اللہ سمجھ لیا بے خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچانے  
آمین! اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو  
سب سے پہلے آمین ثم آمین ثم آمین :-

## تعصب

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :- تعصب خود بر خلاف شریعت ہے، ہندوستان  
کے مسلمان اس میں گرفتار ہیں، خدا کی نامہربانی اُن کی طرف رجوع ہے..... پھر  
اس کا علاج کیا ہے! خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتا ہیں تصنیف  
ہو رہی ہیں اور سر روز چھپتی ہیں اور کتے ہیں اُن میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے  
جاتے ہیں اُن کو دیکھ کر مر جاتے کو دل چاہتا ہے۔ بہت سی باتیں اُن میں بلاشبہ  
سچ ہیں اور وحقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اسلام کو بڑی  
ہے..... میرے صرف ایک لفظ لکھتے سے کہ ”میراں ہیں“ نالائقوں کو اس  
قدر طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں  
جو اوصاف چھپ رہے ہیں اُن سے کسی کجخت کو غیرت نہیں آتی :-

## اسلام کی حمایت

ایک اور خط میں خطبات احمدیہ کے بعض مضامین کے متعلق لکھتے ہیں  
”افسوس صد افسوس ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو  
ایسے لغو اور مہمل کہا نیوں میں ڈال دیا ہے اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اس کی تحقیق  
اور اس پر غور کیا جائے تو اس کو کافر، لاد مذہب، مرتد، عیسائی، حرام خوردہری مرغی  
کھانے والا بتاتے ہیں :-“

”آیہ یاتی من بعدی احمد کا نہایت عمدہ بیان مسٹر گہنتر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور بخوبی۔ بجنسہ اس آیت کا موجود ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے اور وہ وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے مگر جس طرح پیر کہ اس کو مسٹر گہنتر نے ثابت کیا ہے اس کو پڑھ کر مسلمان متعصب سرولویوں کو غیرت کرنی چاہیے کہ جو کام ان کے کرسٹے کا تھا اس کو ایک غیر مذہب کے منصب شخص نے کیا ہے۔ میں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا، بعینہ مسٹر گہنتر کی تحریر یہ نقل کر دی ہے۔“

”مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آنحضرت کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ریت میں موجود ہے۔ چنانچہ عبری توریث میں وہ لفظ اور نشان شمالی آنحضرت کے بجنسہ نکالے ہیں مگر انوس کہ اس پر بھی میں کافر ہوں اور باران باد فروش و غط گو مسلمان! کیا انھوں نے خدا کو بھی اپنا ہی ساتا بنا یقین کیا ہے!..... میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر لوگ مجھ کو برا کہتے ہیں اگر خدا مجھے اس پر صبر کا صل عطا کرے تو میرے لیے ایک نہایت عمدہ زادراہ دوسری دنیا کے لیے ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے ایسا کس کا نصیب جس کو نہایت عمدہ زادراہ وہاں کے لیے ہاتھ آوے۔“

## طیور منخفقہ اہل کتاب

ایک اور خط میں درباب طیور منخفقہ اہل کتاب کے لکھے ہیں جو کچھ غصہ آپ کو مجھ پر درباب گردن مروسی ہوئی شرعی کے ہے وہ میری گردن پر، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علما نے ترکستان (یعنی ترکی) نے بلا کسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے، تمام ترک جن کی خاک پاہونے کی بھی ہم کو ریاست ہے۔ سب بتامل کھاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے ویندار عالم نے جو ترکستان (یعنی ترکی) سے

آیا تھا اور ایسا سخت مذہب میں تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹو گراف کی تصویر کھچوانے سے انکار کیا، درباب گردن مڑوڑی سرخی کے مجھ سے کہا کہ ”ہذا قصور انصاری کا باس لنا فی کلہ قد احل اللہ لنا طعم اهل الكتاب“ علاوہ اس کے جو شخص احتیاطاً اس کا مرتکب نہ ہو نہایت عمدہ بات ہے، مگر اس کو مسئلہ شرعی ٹھیرانا اور اس کے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پانوپرست خود تیشہ زدوں ہے۔ اس فقرے کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے آثار اللہ تعالیٰ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر اس کی تفسیر عرض کر دیں گا۔

ایک شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ جو شخص منکر خدا ہو وہ بھی جیسے کہ بعض لوگ کہتے ہیں، مہذب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں سرسید کہتے ہیں ”سوائے توحید و ات باری تعالیٰ کے ماننے کے تہذیب نفس انسانی اور شایستگی حاصل نہیں ہو سکتی۔“

## فضول مذہبی بحثوں سے اجتناب

سرسید مذہبی مسائل میں اُس میدان سے جس کرائیوں نے اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے لازم پکڑ لیا تھا، سرمو تجانہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی نبوت بلکہ خدائی کا بھی دعوے کرے کہ یا تو اُن کو اس کا رد لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا وہ اکثر معترضین کے حملوں یا اعتراضوں کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو فضول بحثوں سے جین سے مسلمانوں میں تفرقہ پرشے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوا، ہمیشہ رد کرتے رہتے تھے اور کہیں کسی ایسے مسئلہ سے تعرض نہ کرتے تھے جو اُن کے دائرہ کی حدود سے باہر ہو۔

ایک شخص نے سرسید غلام احمد صاحب قادیانی کی نسبت جن کو صاحب الہام

اور ٹیل مسیح ہونے کا دعویٰ ہے۔ ایک طول طویل خط سرسید کو لکھا۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں۔ "مخدومی ہر شخص یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعویٰ کر سکتی ہے مگر اس کا نتیجہ کیا! اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے؟ ناوان ہیں وہ جو ان سے جھگڑا کرتے ہیں یا سلام۔"

ایک اور شخص نے مرزا صاحب کے خیالات کی مخالفت میں کچھ لکھنے کا ارادہ سرسید سے ظاہر کیا اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں "آپ جو برسالہ نسبت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی لکھتا چاہتے ہیں کیا آپ کو بھی کچھ مانجھو لیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور مجھ کو ہرگز اس قدر فرصت نہیں ہے کہ نسبت حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے جو محض غلط روایات پر مبنی ہے کچھ لکھوں۔"

منشی سراج الدین نے ان سے دریافت کیا کہ گھر میں تصویر رکھنی کیسی ہے! اس کے جواب میں لکھتے ہیں "ان چیزوں کو موجودہ حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج مہرج ڈالنا اور ان کو متوحش اور زیادہ متنفر کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جن کی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں ہرج پڑے گا، پس اس کو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیے۔ پہلے امورِ معظم اور اصول کو واضح کرنا چاہیے، تصاویر و تماثل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں، اس کی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی و جواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے، پس جو بیل کہ چل رہا ہے اس کو آرمار نے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔"

کسی نے سرسید کو بذریعہ تخریب کے اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب نے آپ کی مصنفہ کتابوں کو اپنے ایک شاگرد سے جو رئیس اعظم ہے چھین کر



آگ میں جلا دیا۔ سرسید اُس کے جواب میں لکھتے ہیں ”اُس کو ایعنی مولوی کو اس عمل سے کیا فائدہ ہوا! اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فائدہ ہوتا اور اس کا بھی دل ٹھنڈا ہوتا۔“

مستورات کے پردہ کی نسبت اُن کی رائے درتعلیم یافتہ جوانوں کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُن کی عورتیں منہ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں۔ ایک دفعہ شاید مولوی عبد الحلیم شرر نے اپنے اخبار میں اُن کی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردے کے مخالفت ہیں۔ اس پر نئی سرراج الدین نے اُن سے اس باب میں اُن کی رائے دریافت کی۔ سرسید اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں ”میں پردہ کی رسم کا مستقد و جہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتحقیق ہندوستان میں اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا۔ مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ جسکے منہ اور ہاتھ پہنچنے تک اور پانوں سٹخنے تک ستریں داخل نہیں ہیں، فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منہ کو بھی پردے میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھ دیا ہے۔ شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہو گا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردہ میں داخل نہیں ہیں، اُن کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔“

ایک دفعہ کسی شخص نے مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے اخبار میں سرسید کی نسبت یہ لکھ دیا کہ اُن کی رائے ہے کہ حضرت علیؑ رضی نے متعہ کیا ہے۔ انھوں نے فوراً اخبار نویس کو لکھا کہ ”میرا پرگز یہ عقیدہ نہیں کہ جناب علیؑ رضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا ائمہ اطہار میں سے کسی ایک نے بھی متعہ کیا ہے۔“

سرسید سے جیسا کہ ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں، اکثر لوگ اُن مسائل

مذہبی کی نسبت رائے پوچھتے تھے جن پر آج کل نئے خیالات کے لوگوں کی توجہ مبذول ہے اور سرسید سب کام چھوڑ کر ایسے سوالات کا جواب فوراً لکھتے تھے۔

## وبا سے بھاگنا

کسی نے ان سے پوچھا کہ جہاں وبا ہو وہاں سے دوسری جگہ چلا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں ”جس شہر میں وبا ہو وہاں سے چلا جانا وبا سے بچنے کو منع اس اعتماد کے کہ اگر خدا نے اس فعل سے ہمارا وبا سے بچنا مقدر کیا ہے تو بچیں گے اور مقدر نہیں کیا تو باوجود چلے جانے کے نہیں بچنے کے خلاف شرع و احکام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے۔ مذہب اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لیے جو اسباب ہوں ان اسباب کو فاعل حقیقی نہ سمجھے بلکہ فاعل حقیقی خدا کو سمجھے جو علت لعل تمام افعال و واقعات کا ہے..... جس طرح کہ آدمی امراض میں وعا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ دوا مرض کے لیے مفید ہے مگر اس کے ساتھ ہی یقین کرتا ہے کہ اگر خدا نے صحت مقدر کی ہے تو صحت ہوگی، اسی طرح جہاں وبا ہے وہاں سے چلا جانا مثل دوا ہے۔ اگر خدا نے بچنا مقدر کیا ہے تو اس دوائے فعلی سے فائدہ ہوگا، نہیں تو نہیں۔ سنجاری میں جو حدیثیں ہیں ان کا بھی یہی مطلب ہے، ایک حدیث میں ہے ”فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا“ مگر اس حدیث کے الفاظ پورے نہیں، اس کے بعد جو حدیثیں ہیں ان کے الفاظ پورے ہیں ”فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا زَا مَنَةً“ جس کا صحت مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ کر چلا جانا کہ ہم اس سے بھاگ کر بچ جاویں گے، ممنوع ہے، کیونکہ اگر اللہ نے مقدر نہیں کیا یعنی سنجنا، تو بھاگ کر نہیں بچ سکتے۔“

” جہاں وبا ہے وہاں داخل ہونا اور وبا کے مقام سے چلا جانا دونوں کی

کیساں حالت ہے..... اگر اسباب کی طرف توجہ ممنوع ہو تو جہاں وہاں ہے وہاں جانے کا اقتناع غلط ہو جاتا ہے اسی دلیل سے جس دلیل سے کہ ایسے مقام سے چلا جانا ممنوع ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام کو جا رہے تھے اور معلوم ہوا کہ وہاں وہاں ہے تو صحابہ سے صلاح کی اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مت جاؤ! اس وقت ابو عبیدہ نے کہا "أَفِرَادًا مِنْ قَدَرِ اللَّهِ" اس کے جواب میں حضرت عمر نے کہا "نَعَمْ نَفَرًا مِنْ قَدَرِ اللَّهِ إِلَى قَدَرِ اللَّهِ" پس اس جواب سے ٹھیک مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہی جواب اُس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو اس مقام سے جہاں وہاں ہے، چلا جائے اور کوئی شخص اس کو کہے کہ افراراً من قدر اللہ تو اس کا جواب یہی ہوگا۔ نَعَمْ نَفَرًا مِنْ قَدَرِ اللَّهِ إِلَى قَدَرِ اللَّهِ پس جب اُن تمام حدیثوں اور اُن کے الفاظ و مقاصد پر غور کرو تو یہی مطلب و حکم پایا جاتا ہے ہیں نے بطور خلاصہ کے اول لکھ دیا ہے۔ یہ بات کہ جو عزیز اقربا جن کی تیار واری اُس کے ذمہ ہے اور وہ متبلا ہوں اور وہ شخص جو وہاں کے ڈر سے اُن کو چھوڑ جاوے، یہ ایک دوسرا گناہ ہے، عام بحث سے اس کو تعلق نہیں۔ اُس شخص کی نسبت وہ حدیث ہے جو سنجاری "اجرا الصاہر فی الطاعون" میں مذکور ہے۔

## اسلام کا ادب

اسلام اور شعائر اسلام کا ادب، قرآن مجید کا ادب اور خدا اور رسول کے نام کی تعظیم سرسید کے دل میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے صوفی خوش اعتقاد سے کچھ کم نہ تھی، بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں چند شہادتیں بطور نمونہ کے ذکر کی جاتی ہیں۔

بہی کے ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اُردو تحریروں میں علالت

وقت وہی مقرر کرنے چاہیں جو قرآن مجید میں لکھے جاتے ہیں بسر سید نے ان کو لکھا "ہم نہیں پسند کرتے کہ جو علامتیں مدت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہو گئی ہیں وہ اردو تحریر میں سروج کی جائیں اور آیت و مطلق و غیرہ جو خاص اصطلاحاً قرآن مجید کی ہیں اور تحریروں پر بولی جائیں۔ گو شرعاً و عقلاً اس میں کچھ قباحت نہ ہو لکن تعظیماً للقرآن المجید ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔"

خطوں پر جو اکثر لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا الحمد لمصلياً لکھ دیا کرتے ہیں اس کی نسبت وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت بنی القاد اور ٹھٹھ سنت پر چلنے کا کام ہے حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی سب سے اولیٰ نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اس قسم کے ہر تاڑے سے اسلام کی بوکت و منزہت ان کے دل میں نہیں رہی۔ بعض اس کے کہ اسلام کی باتوں سے ان کے دل میں نیکی خضوع اور خشوع پیدا ہو سکتی اور قناعت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث نبوی کا بھی جس میں خدا کے نام سے کام شروع کرنے کا حکم ہے۔ یہی مشا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں "كُلُّ آفِرٍ ذِي بَالٍ لَمْ يُبَدِّئْ بِسْمِ اللَّهِ فَعَدَا بَتْرًا" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو امرزں بال یعنی عظمت اور شان و ولانہ ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔"

ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحنیں کے موقع پر سجانے والی سجانے کے سبحان اللہ یا صرحبایا جزال اللہ کہا جایا کرے اور اجلاس کے موقع پر ایک منبر رکھا جایا کرے جس پر کھڑے ہو کر لوگ اسپچ کیا کریں۔ سر سید نے اس سے سخت ناراضی ظاہر کی

اور کہا " ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جیسے ذہنی اغراض کے لیے ہوتے ہیں ان الفاظ کو استعمال کرنا جو شعائر اللہ میں سے ہیں ان کی ہتک حرمت کرنا ہے اور لا تملوا شعائر اللہ میں داخل ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ ہم ایک عاشقانہ شعر پڑھیں اور سننے والے کی خوبی کسی شعر میں باندھیں، یا ایک معشوق کے بجز وصل اور اُس کے خط و خال اور عشوہ و زائر تو بہ شکن کو دلچسپ نظم میں ادا کریں، اور سننے والے اس کی تحسین میں ان کلمات کو استعمال کریں جو خاص رب واحد معبود وغیرہ نے اپنی عبادت میں استعمال کرنے کے لیے بطور شعائر اللہ مقرر کیے ہیں۔ افسوس کہ جس وقت ہمارے دوست ہم کو نصیحت کرتے ہیں، اس وقت ان کو ان الفاظ کی عظمت کا اور ہمارے کاموں کی خست کا خیال نہیں رہتا اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنے خبیث اور ذلیل کاموں میں خدا کی عظمت اور اس کے شعائر کی حرمت کو بھول جاویں اور انھیں ذلیل دنیاوی کاموں میں شعائر اللہ کو گدھ کر کے اُس کی عظمت کو لوگوں کے دلوں سے کھو دیں کیا ہم کو زہیہ ہے کہ اپنے لغو اور ذلیل دنیاوی کاموں میں اُس منبر کی جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (یا ایہا النبی و اُمّی یا رسول اللہ) کھڑے ہو کر وعظ فرمایا۔ قرآن مجید لوگوں کو سنایا، خطبات روحانی ارشاد فرمائے، صحابہ اور ائمہ علیہم السلام نے اُس سنت کو اختیار کیا اور اب ہماری مسجدوں کے لیے مخصوص ہے جس پر وہی سنت ادا کی جاتی ہے، نقل بنا کر کھڑے ہوں..... یہی خیالات ہیں جن کے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل تو کانپ جاتا ہے۔ ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبیہ) مشہور محمدی رکھا جاتا ہے۔ کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اُس نے ان نقطوں کو لکھا، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ

نہیں سمجھتا کہ کس مقدس نام کو کس جگہ استعمال کرنا ہے۔ اور اسلام کی عظمت کو دل سے بھلاتا ہے؛ ایک اخبار نکلنا ہے اور مخبر صادق (ہائے افسوس کس دل سے) اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ کوئی اخبار الصدیق کے نام سے مشہور ہے۔

ایک دفعہ محمد بن ایچو کیشیل کانفرنس کے اجلاس میں ایک زیر و لیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ کانفرنس کے چندہ کی آمدنی جمع رکھنے کو دیا اور کسی غرض کے لیے ایک شخص امین قوم مقرر ہونا چاہیے۔ سر سید نے یہ مضمون سن کر اسے بدیدہ ہو کر درونک آواز سے کہا، "امین قوم تو صرف ایک شخص تھا سو گزر گیا اب کوئی امین قوم نہیں ہو سکتا، ہاں اس عہدہ کا نام امانت دار قوم ہو سکتا ہے، چونکہ آنحضرت ابتدائے عمر سے عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اس لیے اس لقب کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر ہونا انھوں نے گوارا نہیں کیا۔

ایک شخص نے سر سید سے استفسار کیا تھا کہ اگر غازی قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جاوے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں اس کے جواب میں انھوں نے یہ لکھ بھیجا "عذوی غازی قرآن مجید بلفظ نہ پڑھئے اور اس کا ترجمہ پڑھ لیتے ہیں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ غازی نہیں پڑھتے" ایک اور شخص نے ان سے دریافت کیا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ جو آپ نے

اپنی تفسیر میں کیا ہے، اگر قرآن سے علیحدہ چھاپ لیا جاوے تو آپ اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں! اس کے جواب میں انھوں نے لکھا "اول تو یہ تہلاد کہ ایسے مردود ترجمہ کو خریدے گا کون! دوسرے یہ کہ جو ترجمہ تفسیر کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہایت سرسری طور پر ہوا ہے اگر صرف ترجمہ چھاپا جاوے تو نظر ثانی کا محتاج ہے اس کا اہتمام اس طرح پر کہ صرف اردو بغیر متن قرآن کے چھاپا ہو سہر گز پسند نہیں ہے، نہ میں اس کی اجازت اپنی زندگی میں دوں گا۔ میں اس کو نہایت عظیم گناہ سمجھتا ہوں، لیکن اگر مع متن قرآن مجید چھاپا جاوے تو میں نظر ثانی کرنے کی محنت گوارا کروں گا و اسلام۔"



## تفسیر قرآن لکھنے کی غایت

قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے سرسید کا مقصد جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ہرگز نہ تھا کہ اُس کے مضامین عام طور پر تمام اہل اسلام کی نظر سے گزریں، چنانچہ ایک دفعہ ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد ان کے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کی تفسیر دیکھنے کا شائق ہوں، اگر آپ مستعاروں تو میں دیکھنا چاہتا ہوں، سرسید نے اُن سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا مسلم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا، انھوں نے کہا، الحمد للہ، پھر کہا کہ آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہوں گے، انھوں نے کہا، الحمد للہ، سرسید نے کہا بس تو میری تفسیر آپ کے لیے نہیں ہے، وہ صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو مذکورہ بالا معاذ پر سچتہ یقین نہیں رکھتے یا ان پر معترض یا ان میں متردد ہیں۔

سرسید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ "اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک کوپے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جیب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آدے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اُس کو بہت کم چھپاتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں، سر دست عام لوگوں میں اُس کا شایع ہونا اچھا نہیں۔"

## نبی کی محبت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق اور غایت درجہ کی ارادت اور سچی محبت معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقینی سو موضوع و مفسرے ہے اگرچہ تمام محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہو۔ بعض روایتوں پر جن کے ذریعے سے مخالفوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرنے کا موقع ملا ہے، وہ بعض اوقات نہایت غنیط و غضب میں آ کر یہ کہہ اٹھتے تھے کہ اگر اس کا راوی میری حکومت میں یہ روایت کرتا تو میں اس پر مفری کی حد جاری کرتا۔

منشی سراج الدین نواب انتہار جنگ سے روایت کرتے ہیں کہ "سید صاحب کے کفر کا فتویٰ جو مولوی امداد اعلیٰ نے علما کے پاس مہر و دستخط کے لیے بھیجا تھا جب وہ مولوی سراج الدین احمد مرحوم سنبھلی کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو پڑھ کر یہ کہا کہ "میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر کبھی ہنر و دستخط کر سکتا ہوں جس کو میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر چشم پڑا ہے اور ناز ناز روتے دیکھا ہے۔"

سرسید نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اپنے چند فلسفی اشعار لکھے ہیں جن میں سے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان کے دل کا لگاؤ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا ظاہر ہوتا ہے۔

خدا وارم، دل بریاں ز عشق مصطفیٰ وارم      نثار و بیچ کافر سازد سامانے کہ من دارم  
رجبر ملی امیں قرآن بہ پیغامے نمی خواہم      ہمہ گو تار معشوق ست قرآنے کہ من دارم

جس ننانے میں کہ وہ سرحدیم میور کی کتاب لائف اوف محمد کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے انھوں نے ولایت سے مولوی سپید مہدی علی خاں کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے ”مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اُس فقیر سکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔ مارا ہمیں نغمہ شاہنشاہی اس سنت“

## اسباب دنیوی سے بے تعلقی

سر سپید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے کوشش کرتے تھے، اُمر سے ملتے تھے، حاکمان وقت سے میل جول رکھتے تھے اور خود دنیا داروں جیسی زندگی بسر کرتے تھے، کہا جاسکتا تھا کہ وہ دنیا دار ہیں لیکن ان کی حالت پر نظر کرنے سے یہ مشکل اُن کو عرفی معنوں میں دنیا دار کہہ سکتے تھے۔ ایک بزرگ کا حال جو بظاہر تعلقات میں گھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر دل کو کسی چیز سے تعلق نہ تھا، لکھا ہے کہ وہ اپنے اصطلیل کے گھوڑے دیکھ رہے تھے کسی نے طنز کے طور پر کہا کہ جس دل میں خدا ہو اُس میں گھوڑے نہیں سما سکتے، انھوں نے کہا ”اے منجہاد رگل زوہ ام نہ در دل“ سر سپید کا حال دیکھ کر اس مقولہ کی بخوبی تصدیق ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایسے لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو باوجود کثرت تعلقات کے ہر ایک تعلق سے آزاد ہیں اور جن کی نسبت کہا گیا ہے

پاک ہیں آلائشوں میں، بند شوں میں بے لگاؤ

رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیان سے الگ

۷ سینکڑوں پھندوں میں یہاں جکڑا ہوا بے بند بندہ  
پر ٹوٹے کوئی دل اُن کا تو وہاں سبک الگ

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا جن کو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا، درحقیقت  
کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا، باوجود قطعی مایوسی کے جو اُس کو مسلمانوں کی  
طرف سے تھی اور جس کو وہ اکثر پرائیوٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ  
ظاہر کرتا تھا، اس کی کوششیں اخیر دم تک بلا رنج و برہم جاری رہیں حالانکہ اس کو یقین  
تھا کہ مسلمانوں پر مردنی چھا گئی ہے اور قومی زندگی کی رتق اُن میں باقی نہیں رہی  
باوجود اس کے وہ دن رات اُن کی ترقی کی تدبیروں میں مصروف تھا اور جن  
کاموں کو وہ بے سود و لا حاصل سمجھتا تھا اُن میں اُس کی سرگرمی و دلچسپی دیکھ  
کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر ایک کام میں اُس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ یہ اسی  
کی بہت اور اسی کا حوصلہ تھا جو اُس کی ذات پر ختم ہو گیا۔

وہ اپنے نہایت عزیز اور خالص دوست اور مددگار نیاز محمد خاں  
رئیس جالندھر کو اُن کے تعزیتی تار کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ کا تار  
ہمدردی کا پہنچا۔ جو ولی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اُس کا میں  
صرف شکر گزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اُس کو نہایت محبت و قدر سے  
دیکھتا ہوں اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن  
خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف  
ہو، کیونکہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور  
عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے، پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کروا سلام۔"

وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاستے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ وہ شخص تھا جو ایک امید سوہوم پر کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے، اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کر گیا۔ اس نے اپنے بڑے فرض کے ادا کرنے کی جلدی میں جس کے لیے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا اپنی ہزاروں روپیہ کی جائیداد اور اثاثہ البیت اور ہزاروں روپیہ کی کتابیں مکے و مدینہ کے کعبہ و فریخت کر دیں اور اس کے دل پر ذرا میل نہ آیا اس نے غم کے بعد لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تعلق لینے سے ایسی بے پروائی کے ساتھ انکار کر دیا کہ کوئی دو چار ہنگی زمین کے لینے سے بھی اس طرح انکار نہیں کر سکتا، وہ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ کرنے کو ایک پیسا نہ ہوتا تھا اپنی ساری تنخواہ خزانہ سے منگوا کر مدرسہ کی ضرورتوں میں اٹھا دیتا تھا اور جب تک مدرسہ کا روپیہ وصول نہ ہوتا آپ قرض دام کر کے گزارہ کرتا تھا، جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو بقول مسٹر آرنلڈ کے نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ اور جب وہ مرا تو اس کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک پیسا

گھر میں نہ نکلا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی زائد کوئی صوفی کوئی درویش دنیا سے بے تعلق ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہم کو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں کوئی ایسا کافر مل سکتا ہے؟ **وَاللّٰهُ دَرُّمَنْ قَالٰ -**

دولت بغلط بود از سعی پشیمان شو کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو  
 اگرچہ سرسید کی تمام زندگی دنیا ماروں کی ذوق میں بسر ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا رنگ جو ابتدائے عمر میں ان پر چڑھ گیا تھا وہ نفس و اسپین تک بدستور چہرہ ہار با، ان کے بعض خوابوں سے جو ضخیم کتاب میں نقل کیے گئے ہیں ان کی طبیعت کو ایک خاص تعلق طریقہ نقشبندیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ نیز انہوں نے اپنی اکثر تحریروں میں مشائخ نقشبندیہ کا ذکر ایسے طعم پر کیا ہے جس سے اس تعلق کا کافی ثبوت ملتا ہے، خصوصاً شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے چہرہ سے ایک رقت آمیز بشارت ظاہر ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مدت سے یہ کوچہ چھوٹ گیا تھا وہ مرنے سے چند سال پہلے زیادہ تر اسی ارادہ سے ولی گئے کہ شاہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوں۔ اور ہمیشہ حضرت مجدد کے مزار پر جانے کے لیے سر بند جانے کا قصد رکھتے تھے۔ ایک خط میں سردار محمد حیات خاں صاحب کو لکھتے ہیں "مائی ڈیر حیات! آپ کا عنایت نامہ سچا..... بعد بہ سات پٹیاں لہ جانا ہو گا۔ آپ کی ملازمت کو بھی جی چاہتا ہے اور سر ہند میں حضرت مجدد کے مزار کی زیارت کا ارادہ ہے، کیا عجب ہے کہ ملتان تک آنا ہو جائے۔ ملتان میں کن کن بزرگوں کی زیارت ہے، ان سے اجازت لے لیجیے اور یہ بھی دریافت فرمائیجیے کہ کیا عنایت ہو گا"

تصویر شیخ کے مسد کے متعلق جس پر طریقہ نقشبندیہ میں سالک کی



ترقی کا دلرو مدار ہے جو خیالات سرسید نے ۱۸۵۷ء میں اپنے رسالہ سوسومہ نیتقہ میں ظاہر کیے تھے وہی خیالات وہ اُس کی نسبت اخیر دم تک رکھتے تھے مگر جس طرح وہ اور باتوں میں کسی کے مقلد نہ تھے اسی طرح تصوف میں بھی اُن کے خیالات بالکل آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلق رہنا اور جو قرآنے خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کیے ہیں اُن کو اپنے اپنے موقع پر بغیر افراط و تفریط کے استعمال کرنا تمام تصوف کا خلاصہ ہے یہی اُن کا قول تھا اور اسی کے موافق اُن کا عمل تھا۔

وہ ایک دوست کو اُس کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں ”سب سے بڑا کام انسان کے لیے دنیا میں یہ ہے کہ دنیا کو برتنے اور دل کو اُس سے تعلق نہ ہو۔ رسولانا مردم فرماتے ہیں ”چھیت دنیا از خدا غافل بدن“ مگر میرے نزدیک اس میں کسی قدر خلطی ہے۔ خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے کہ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑتا اسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ اگر خدا خود چاہے تو ہم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہم کو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج تو کر دے، خدا کی قدرت سے خارج ہے۔

من تو شدم تو من شدمی من تن شدم تو جاں شدمی

تا کس مگوید بعد از من دیگرم تو دیگر می

پس از خدا غافل بدن چہ معنی وارو؛ دنیا ہمارے برتنے کے لیے ہے ہم خوب چین سے اُس کو برتیں مگر دل کو اُس سے تعلق نہ ہو میں یہی سب سے بڑا کام ہے اور یہی تعلق کفر ہے جس کی نسبت رسول مقبول نے فرمایا

”صاحب المال کافر“

ایک اور دوست کو جن کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "آپ کا عنایت نامہ درد انگیز پہنچا جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے لیکن امر لا علاج کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسان اسی میں غلطاں و بیچیاں رہے اور سب کاموں کو جن کے لیے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے۔ رضایقضا جو اہل اللہ کا مقولہ ہے نہایت عمدہ اور فلسفیانہ ہے، حتی المقدور انسان کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔..... میری دانست میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جن کا حق جمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے، آپ ان کی صلاح کو مان لیں اور شادی کر لیں۔ امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آئینہ درستی ہو جائے گی۔ ایک بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی کرنی کسی طرح اخلاق کے برخلات نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہ کبریٰ سے نہایت محبت تھی، ان کے بعد آپ نے نکاح فرمایا، کون شخص ہے جو کانشس یا اخلاق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے تئیں قرار دے سکتا ہے؟ تمام حالات و مشکلات جو آپ نے لکھی تھیں وہ سب واردات عالیہ ہیں جو کبھی قائم نہیں رہتیں، انسان کو چاہیے کہ ان واردات عالیہ کو دل سے علیحدہ کر کے سوچے کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور ان کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا تمام اخلاق اور عبادتوں اور کانشس کے جذباتوں سے افضل ہے۔ والسلام"

## بے تعصبی

سر سید کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تھیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت ہی کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت ان میں کوٹ کوٹ

کہ بھری تھی باوجود اس کے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے جس نے تعصبی سے انھوں نے فصلِ تصویبات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ یچینیٹ ایک جج ہونے کے یکساں اور بے طرف دارانہ رہا اس کو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال اُن کے بڑاؤ کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا اور یہی رنگ اُن مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سنی، شیعہ، مقلد غیر مقلد اور ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ پیش آتے تھے اور پیش آتے ہیں۔ اُن کے نہایت گاڑھے دوست جن کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقے کے لوگوں میں موجود تھے جن کے ساتھ اغیر دم تک اُن کی ایک جہتی و یک رنگی کا یکساں حال رہا۔ گانے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے اس کی نسبت وہ صاف صاف کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گانے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔ اسی طرح وہ شیعوں کی نسبت اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں ”بہت سے شیعہ ہیں جن سے ہم سے نہایت مدستی ہے، وہ اپنے گھر میں ہمارے بزرگوں پر تبرا کیا کرتے ہیں، کیا کریں، ہمارا کیا نقصان ہے۔“

ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گانے قربانی کے لیے خرید لی۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گانے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ اندر خود رفتہ ہو گئے، فوراً سوار ہونے کے لیے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوشی سے کالج تک آدمیوں کی ٹاک لگادی یہاں تک کہ وہ گانے طالب علموں سے

چھین کر اُس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آئندہ کے لیے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

سرسید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اُن سے اس باب میں اُن کے اصلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک بلیغہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخواں پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو، مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اُس دسترخواں پر بیٹھنے والوں والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اس پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے اسی کو وہ اختیار کر لگا وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کے لیے اور بُرا ہے تو اُس کے لیے۔ لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جز ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آ سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید ہمیشہ پاک جلسوں میں جہاں بندو مسلمان جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنی اسپچ میں کہا "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر پر پڑتا ہے، ایک آسب دہوا

میں دونوں شریک ہیں، ایک دیریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر طے چارہ نہیں، پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔“

پھر آگے چل کر انھوں نے کہا کہ قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، اگر ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں، اسے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلانے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہب لفظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔“

ایک اور موقع پر اسی باب میں انھوں نے مندرجہ ذیل تقریر کی ”سیرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ سے قابل نہیں ہے کہ ان کا (یعنی ہندو مسلمانوں کا) مذہب عقیدہ کیا ہے، کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ وہ ہندو۔“ یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔“

ایک اور سچ میں ان کے یہ الفاظ تھے ”اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، ہندوستان ہی کی مہلا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمناسا

پانی ہم دونوں پتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرتے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے، ہندوستان میں رہتے رہتے۔ دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اُردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔“

”اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک وطن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور سیلی دواکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری وطن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانٹری بن جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس وطن کو بھینگا جاؤ چاہو کانٹرا۔“

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے انھوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کیے ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا، سرسائی کے اخبار میں جب ۰۳۵ برس ان کے ہاتھ تلے رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو، کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے، کبھی کسی ہندو عہدہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ یہ غلط اس کے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں ہمیشہ ہندو لیڈروں اور رفاہیوں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ



اپنے اخبار میں اور پبلک ایسیوں میں کیا اور ہمیشہ ان کے سر نے پر مد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا۔ یہی حال ان کی بے تعصبی کا اسلامی فرقوں کے ساتھ تھا اور یہی حال عیسائیوں کے ساتھ۔

## اسلامی حمیت

بادجو اس کے اسلامی حمیت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ سر لوہوں اور واعظوں میں دیکھی گئی نہ صرفیوں اور درویشوں میں۔ جب کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوا اُس نے فوراً اُس کی مدافعت کی نہ اس معاملہ میں اُس کو اپنی صلح کل کی پالیسی کا پاس و لحاظ تھا اور وہ اس بات کی کچھ پروا تھی کہ فریقِ ثانی کس رتبہ اور وجہ کا آدمی ہے۔ حالانکہ وہ ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق قائم رکھنا چاہتا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ ہندو اور دروہ زبان اور فارسی خط کو صرف اس وجہ سے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی یادگار بے تو اُس نے علاوہ ان کی لغت کی اور ولایت جانے سے پہلے دو برس تک برابر ان تمام بھلاؤں اور مجلسوں اور کمیٹیوں کے برخلاف آریکل لکھتارہا جو بنیاد میں اور الہ آباد اور دیگر مقامات میں اردو کی بیخ کنی کے لیے قائم ہوئی تھیں۔ پھر جب ایسے ہی تنگدلی اور تعصب کے خیالات سے الہ آباد یونیورسٹی میں یہ تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دی جائے تو اُس نے محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں بمقام الہ آباد اس تحریک کے برخلاف ایک نہایت پر جوش اور زبردست ایسیج میں ان تمام ولات کی ترویج کی جو فارسی زبان کے خارج کرنے کی ضرورت پر پیش کی گئی تھیں۔

باوجودیکہ وہ انگریزوں کا دوست تھا اور ان میں اور مسلمانوں میں خلیوں اور  
 دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا مگر جن انگریزوں نے اسلام کے برخلاف کتابیں لکھیں ان  
 کا مقابلہ اس نے نہایت آراوی اور بیباکی کے ساتھ کیا۔ اسی نے سب سے  
 پہلے گورنمنٹ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ملکی اور فوجی افسر اپنے تابعین کو مشنریوں  
 کا وعظ سنوانے کے لیے اپنا رعب و داب کام میں لاتے ہیں جس سے لوگوں  
 کو خیال ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ضلع مراد آباد  
 میں انتظام قحط کے موقع پر ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارٹ بچوں کی بابت جو  
 کشاکش سرسید اور مشنریوں اور کلکٹر مراد آباد کے درمیان رہی وہ پہلے حصے میں  
 مفصل بیان ہو چکی ہے۔ اس نے اسچورکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف  
 کہہ دیا کہ مسلمانوں کی عام فیلنگ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہے  
 پس اگر کہیں کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول  
 توڑ دیا جائے گا تو اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ اس نے کمیشن  
 میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ”جہاں مشنری اسکول ہیں اگر وہاں کے لوگ اپنا اولاد  
 کو ان اسکولوں میں بھیجا پسند نہ کریں اور آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا  
 کالج قائم کریں تو گورنمنٹ ان کو گرنیٹ ان ایڈ عطا فرما دے اور اس بات  
 کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں  
 اور جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے اپنی حکومت اور رعب قاب کو ان کے  
 برخلاف عمل میں نہ لادیں۔“

اس سے پڑھ کر کوئی شخص اس بات کا مخالف نہ تھا کہ مسلمان اپنی اولاد  
 کو تعلیم کے لیے مشنری اسکولوں یا کالجوں میں داخل کریں، نہ اس لیے کہ اس کو  
 عیسائی مذہب سے کچھ تعصب تھا بلکہ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو

غیرت آئے اور وہ اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا خود انتظام کریں اس نے جو مکچہ ۱۸۸۳ء میں بمقام لدھیانہ دیا تھا اس میں وہاں کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہا تھا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ لدھیانہ سے شہر میں جو ایک بڑا شہر ہے اور جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں مشنری اسکول بہت سے ہیں اور مسلمانوں کو یہ میٹرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو کچھ جو شس پیدا نہیں ہوتا، ان کو کچھ غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنے لڑکوں کا خود کچھ بندوبست کریں۔ وہ کتے کی طرح اپنے لڑکوں کو خیراتی روٹی پر چلاتے ہیں اور ایسے خیراتی اسکولوں میں اپنی اولاد کو تعلیم کے واسطے بھیجتے ہیں اور خود کوئی بندوبست اپنے بچوں کی تعلیم کا نہیں کرتے۔"

اسی لدھیانہ کے جلسہ میں جب وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم نے سرسید کی تعریف میں کچھ تقریر کی تو اس کے جواب میں جو کچھ انھوں نے کہا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مشن اسکول کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی نسبت کیسے خیالات اور شبہات رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا "تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہ ہو، ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور با بند ہیں تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جنیا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے اسے عزیز پیچھے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم میٹے اس کو قائم رکھو گے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے

جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت ہوگی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اُس سے فائدہ اٹھاویں گی۔

اگرچہ اسلامی حمیت ہر مسلمان کے دل میں کم و بیش ضرور ہوتی ہے اور ہونی چاہیے مگر اس باب میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے بالکل مختلف تھے۔ جو اعتراض عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں یا جو مطامن رسول خدا صلعم کی نسبت اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں بعضے مسلمان تو اس کو کمال دین داری سمجھتے ہیں کہ اُس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ بعضے غیظ و غضب میں آکر ایسی کتابوں کو آگ میں جلا دیتے ہیں اور بعضے گورنمنٹ سے فریاد کرتے ہیں کہ فلاں کتاب میں ہمارے دین یا ہمارے نبی کی توہین کی گئی ہے۔ اُس کو گورنمنٹ تلف کرانے اور آئندہ اس کے چھاپنے کی ممانعت ہو جائے۔ مگر درحقیقت ان باتوں کو مذہبی حمیت سے کچھ علاقہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ مخالفوں کے اعتراضات کا ہمارے پاس اس کے سوا کچھ علاج نہیں کہ ان اعتراضوں سے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں یا گورنمنٹ سے فریاد کر کے ایسی کتابوں کو تلف اور ان کی اشاعت بند کر دیں۔ یہ غلات اس کے سرسید کے خیالات اس باب میں یہ تھے کہ مسلمانوں کے لیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عیسائیوں کے اعتراضوں کو لغو و پوچھ سمجھ کر ان کی طرف التفات نہ کیا جائے، یا گورنمنٹ میں استغاثہ کر کے اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ مسلمان ان کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ بلکہ اسلامی حمیت کا مقصد یہ ہے کہ ان کے اعتراضوں کو نہایت ٹھنڈے دل سے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ دیکھیں اور ان پر غور کریں، پھر جو جواب دینے کے قابل ہوں ان کا جواب دیں اور جن میں بد زبانی و سہ تہذیبی کے سوا کوئی بات التفات کے قابل نہ ہو ان

کافیصلہ پہلک کی رائے پر چھوڑ دیں نہ یہ کہ گورنمنٹ کو ان کا حج قرار میں اور مذہبی سباحثوں میں حکومت کی پناہ ڈھونڈیں تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ اسلام کی دلیلیں باوجود اس کے محکوم و منغلوب ہونے کے اب بھی ویسی ہی غالب ہیں جیسی اس وقت تھیں جب کہ اسپین کے عیسائی مسلمانوں کے نرواں کے بعد ان کو اس لیے جلاوطن کرتے تھے کہ ان کی دلیلیں کا جواب دینے سے عاجز آگئے تھے۔

الغرض اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقین و ائق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کا تعلیم دینے والا غیر مذہب والوں کے ساتھ فیا حنانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا۔ غرض کہ اس کی تسلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحق عبادت اور نبی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور ان کی ذلت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو بیع جانے اس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راست باز ہو

نہ سرسید نے خطبات احمدیہ میں ایک آزاد خیال یورورین مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگرچہ بظاہر فرزند یعنی اسپین کے مسلمان اس وجہ سے جلاوطن کیے جاتے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہ کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلیں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آگئے تھے کہ تاوان تک راہب ایسے سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دلیلیں کا جواب صرف مذہبی علالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک ان کی ناقص توتہ جواب دینے کے باب میں تھی۔ وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا۔

اور بُرائی کی عومن میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سید احمد خاں جیسا مسلمان زمانے میں مشکل سے ملے گا، لیکن اگر مسلمان سے یہ مراد نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے حقیقی مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دین اسلام کا رکن رکین سمجھتے ہیں، جو ذرا ذرا سے اختلافات پر جماعت اسلام کا پر اگندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جن کو ائمہ مجتہدین کی تقلید نے قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث کو صرف سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں، جو احکام ظاہری پر بلے بلے و عطف کہتے ہیں، آئین اور رفح یدین کی بحث میں عمر میں گزار دیتے ہیں، وضع و لباس میں غیر قوموں کے تشبیہ کو محاربہ خدا اور رسول کی حد تک پہنچا دیتے ہیں، مگر قوم کے اخلاق کی دستی کا جس کی نسبت نبی نے کہا تھا کہ ...

”بُعِثْتُ لَأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ“ کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ و نصیحت سے سو اس کے کہ مسلمانوں میں افلاس، نا اتفاق، بغض اور کینہ کو ترقی ہو، اہل قبیلہ میں ہمیشہ کھٹاپی رہے، اسلام مطہری ہو اور قوم کو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے کوئی نتیجہ پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان معنوں میں سید احمد خاں کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہو گا مگر یہ ویسی ہی مسلمانی ہو گی جس کی نسبت کہا گیا ہے۔

اگر حقیقت اسلام درجہاں امین ست  
ہزارہ غمزدہ کفرست پر مسلمانی